وَدَاعِيًا إِلَى اللهِ بِإِذْنِهِ وَسِرَاجًا مُّنِيرًا

آفتابِ نبوّت

قرآنِ حکیم کی ایک آیتِ کریمہ سے نبوتِ محمدیہ کی رفعتِ شان کا حکیمانہ استنباط
اس کتاب کا مطالعہ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کی عقیدت عظمت اور محبت کو
آپ کے دل میں مزید پیوست کردیگا

حکیم الاسلام حضرت مولانا قاری محمد طیب صاحب مہتمم دار العلوم دیوبند

ادارۂ اسلامیات
لاہور - کراچی
پاکستان

وَدَاعِیًا اِلَی اللّٰہِ بِاِذْنِہٖ وَسِرَاجًا مُّنِیْرًا

آفتابِ نبوّت

قرآنِ حکیم کی ایک آیتِ کریمہ سے نبوّتِ محمدیّہ کی رفعتِ شان کا حکیمانہ استنباط
اِس کتاب کا مطالعہ حضور علیہ الصّلوٰۃ والسّلام کی عقیدت عظمت اور محبّت کو
آپ کے دِل میں مزید پیوستہ کردیگا

حکیم الاسلام حضرت مولانا قاری محمّد طیّب صاحب مہتمم دار العُلوم دیوبند

اِدارہ اسلامیات
پبلشرز، بک سیلرز، ایکسپورٹرز
٭ ۔۔۔۔ دینا ناتھ مینشن، مال روڈ، لاہور
فون [illegible]
٭ ۔۔۔۔ ۱۹۰، انارکلی، لاہور، پاکستان
فون [illegible]
٭ ۔۔۔۔ موہن روڈ
چوک اردو بازار
[illegible]

ناشر : ادارہ اسلامیات لاہور

عکسی طباعت : بار اوّل ۱۹۸۰ء

باہتمام وانتظام : اشرف برادرز لاہور۔

مطبوعہ : وفاق پریس لاہور۔

کتابت : ندیم قادری

قیمت مجلد :

ادارہ اسلامیات

پبلشرز، بک سیلرز، ایکسپورٹرز

دینا ناتھ مینشن، مال روڈ، لاہور۔ فون ۷۳۲۴۴۱۲، ۷۳۲۳۳۴۱، فیکس ۹۲-۴۲-۷۳۲۴۴۸۵	۱۹۰، انارکلی، لاہور، پاکستان۔ فون ۷۲۴۳۹۹۱، ۷۳۵۳۲۵۵	موہن روڈ، چوک اُردو بازار، کراچی فون ۲۷۲۲۴۰۱

ملنے کے پتے

ادارہ اسلامیات ۱۹۰ - انارکلی لاہور ۲

دارالاشاعت اُردو بازار کراچی ۱

ادارۃ المعارف۔ دارالعلوم کراچی ۱۴

مکتبہ دارالعلوم۔ دارالعلوم کراچی ۱۴

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

نحمدہٗ ونصلی علیٰ رسولہ الکریم۔ اما بعد:

ہمارے لئے یہ انتہائی خوش نصیبی کی بات ہے کہ حکیم الاسلام حضرت مولانا قاری محمد طیب صاحبؒ مہتمم دارالعلوم کے علمی افادات، حکیمانہ نکات اور گرانقدر تصانیف کی اشاعت کا منجانب اللہ ہمیں شرف حاصل ہوا ہے۔ اس سے قبل حضرت موصوف دام ظلہم کی کئی تالیفات ادارہ عکسی طباعت اور خوشنما زیب و زینت کے ساتھ قارئین کے سامنے پیش کر چکا ہے۔ جس پر حضرت قاری صاحب مدظلہم نے بذریعہ خط اظہار پسندیدگی بھی فرمایا ہے۔

اَب مزید ایک قدم آفتابِ نبوت کی عکسی طباعت کے طور پر آگے بڑھایا گیا ہے۔ اس کتاب کی معنوی خصوصیات اور محاسن تو مطالعہ کے بعد ہی کھل سکتی ہیں اور پڑھنے کے بعد ہی اندازہ ہو سکے گا کہ دَورِ حاضر کے علماء میں حضرت قاری صاحب مدظلہم جیسے باریک بین حکیم و دانا، سراپا مجسمۂ علم و حکمت کا کیا مقام ہے۔

البتہ کتاب کی ظاہری خصوصیات کے بارے میں اتنا عرض ہے کہ اپنی جانب سے کتاب کی طباعت و جلدبندی وغیرہ میں کوئی دقیقہ فروگذاشت نہیں کیا گیا۔ اس سے قبل یہ کتاب ۲ دو مختصر حصوں میں لیتھو طباعت پر چھپی تھی۔ اس مرتبہ دونوں حصوں کو یکجا کرنے کے بعد نسبتاً بڑے سائز پر آفسیٹ کی کتابت و طباعت کے ساتھ یہ جواہر پارہ آپ کی خدمت میں پیش ہے۔

اُمید ہے کہ کتاب سے استفادہ حاصل کرنے والے حضرات دعاؤں میں ہمیں بھی فراموش نہ فرمائیں گے۔

والسلام

ناشرین

اشرف برادران (سلمہم الرحمٰن)

ادارہ اسلامیات

فہرست عنوانات آفتاب نبوت (مکمل)

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

کلمۂ آغاز

اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ وَکَفٰی سَلَامٌ عَلٰی عِبَادِہِ الَّذِیْنَ اصْطَفٰی

سیرۃ نبوت کے بعض بنیادی پہلوؤں کی یہ ایک طالب علمانہ یادداشت ہے جسے سیرت نگاری کا نام دینا تو مشکل ہے، البتہ شوق سیرت نگاری کے جذبات کی تسکین کا نام اس پر رکھا جا سکتا ہے۔ جسے آیت کریمہ "وَدَاعِیاً اِلَی اللّٰہِ بِاِذْنِہٖ وَسِرَاجاً مُّنِیْراً" کی روشنی میں قلم برداشتہ لکھ لیا گیا تھا۔ نہ یادداشت ہی اس درجہ کی تھی کہ اسے بطور علمی تحفہ کے اہل نظر کے سامنے پیش کیا جا سکے۔ حسن اتفاق سے ایک طالب علمانہ مجلس میں اس کے بعض اجزاء زیر قراءت آئے تو سامعین نے فرمائش کی اور اصرار کے ساتھ کی کہ اسے شائع کر دیا جائے۔ طباعت و اشاعت سے طبیعت اس لئے رکتی تھی کہ آخر کس نام سے اُسے شائع کیا جائے؟ سیرت کے جتنے علمی پہلو ہو سکتے تھے ان سب پر علماء امت قلم اٹھا چکے ہیں کہ اور حقیقت یہ ہے کہ کسی آنے والے کے لئے انہوں نے گنجائش نہیں چھوڑی کہ قلمکاری کی جائے۔ سیرت کے تاریخی، اخلاقی سیاسی، معاشرتی، دینی، تبلیغی اور تعلیمی سارے ہی گوشے محققین امت کی روشنائی سے کاغذ پر اس طرح روشن ہو چکے ہیں کہ ان پر قلم اٹھانا روشنی میں اضافے کی بجائے کاغذ پر سیاہی ڈال دینے اور روشنی میں حائل ہو جانے کے مرادف ہے۔ لیکن یہ خیال کرتے ہوئے کہ سیرت نبوی یا خلق نبوی حسب ارشاد حضرت صدیقہ رضی اللہ عنہا جب کہ

عین قرآن ہے۔ وَکَانَ خُلُقُہُ القرآن: (اور آپ کا خلق قرآن ہے) اور قرآن کی شان لاتنقضی عجائبہ اور اس کے عجائبات کبھی ختم نہ ہوں گے۔ فرمائی گئی ہے تو دوسرے لفظوں میں سیرت نبوی کے عجائبات بھی کبھی ختم ہونے والے نہیں۔ اسلئے گنجائش نکلتی ہے کہ سیرت کا نام لے کر کچھ کہا جا سکے۔ مگر اس سلسلہ میں جبکہ مؤرخانہ محدثانہ، فقیہانہ، متصوفانہ اور متکلمانہ طریق پر سب کچھ کہا جا چکا ہے تو اب ایک طالب علمانہ انداز ہی باقی رہ جاتا تھا۔ جس پر ایک ناقص الاستعداد طالب علم طبع آزمائی کر سکتا تھا، سو یہی ایک پہلو اس یادداشت کے منظر عام پر آنے کی جرأت کا ذریعہ بن گیا۔

اس تحریر میں سیرت نبوت کے اساسی مقامات کھولنے کے لئے جو آیت زیب عنوان کی گئی ہے۔ یعنی داعیاً الی اللہ باذنہ وسراجاً منیرا: اس میں یہ خیال احقر سالے ہی مقامات نبوت کھیے ہوئے ہیں، جنہیں اس آیت میں تدبر کر کے کھولا جا سکتا ہے اور وہ جس قدر بھی کھلتے جائیں گے۔ اسی آیت قرآنی کا مدلول بنتے جائیں گے۔ گویا یہ آیت کریمہ سیرت نبوی کی ساری تفصیلات کے لئے بمنزلہ تخم کے ہے۔ جس میں سیرت کا شجرۂ طیبہ سمایا ہوا ہے اور نہ صرف تفصیلات کے ساتھ بلکہ سیرت کی ان تمام امتیازی شانوں اور ممتاز فوقیت کے ساتھ جن کی وجہ سے یہ سیرت تمام سابقین کی مقدس سیرتوں سے افضل اور برتر مانی گئی ہے۔ اس لئے اس یادداشت میں محض سیرت کے پہلوؤں کا پیش کر دینا یا اُن کی تفصیلات کو کھول دینا موضوع تحریر نہیں کہ یہ پیش کش سیرت کی ہر کتاب میں بالتفصیل موجود ہے۔ بلکہ ان پہلوؤں کو قرآن حکیم سے نکلتا ہوا دکھلانا اور قرآن کی ایک ہی مختصر سی آیت کو ساری سیرت کا ماخذ نمایاں کرنا اس یادداشت کا موضوع ہے۔

ظاہر ہے کہ اس موضوع کے دائرہ میں سیرت کے سارے پہلوؤں کا پیش کیا جانا ضروری نہیں۔ بلکہ صرف چند اساسی پہلوؤں کا نمایاں کر دیا جانا بھی اثبات موضوع کے لیے کافی ہو سکتا ہے۔ کیونکہ اس صورت میں مدعا اصلی قرآن کی طرف سیرت کا انتساب سیرۃ کے پہلوؤں کو قرآن سے نکلتا ہوا دکھلانا اور قرآن کو ان کا ماخذ ثابت کرنا ہے نہ کہ سیرۃ

کی ساری تفصیلات پیش کرنا اور یہ مدعا اس نوع کی چند مثالیں پیش کر دینے سے بھی حاصل ہو سکتا ہے۔ اس لئے اس تحریر میں سیرت کے چند ہی پیش کردہ بنیادی پہلوؤں پر قناعت کر لی گئی ہے۔ جو محض مثال کی حیثیت رکھتے ہیں اور تمثیل کے لئے چند اعداد و شمار بھی کافی ہو سکتے ہیں۔ سارے پہلوؤں کا احاطہ ضروری نہیں۔ گو تعداد میں یہ چند مثالی پہلو بھی کم نہیں۔ تقریباً بہتر اصولی مثالیں پیش کی گئی ہیں۔ جو اثبات۔ مدعا بلکہ ایضاح مدعا کے لئے کافی ہیں اور ان اصولی مثالوں کے نیچے جو فروعی مثالوں کا ذخیرہ آ گیا ہے وہ اس عدد سے بھی زیادہ ہے۔ تاہم مثال چونکہ مثال ہی ہے۔ جس کی تعداد کی طرف التفات نہیں ہوتا بلکہ اس سے اثبات۔ مدعا اور وضاحت دعویٰ کی طرف توجہ ہوتی ہے اور وہی مقصود بھی ہوتی ہے۔ خواہ مثال ایک ہو یا ایک سے زائد اس لئے اس طرف توجہ دلا دینا ضروری تھا تاکہ لفظ سیرت آ جانے سے سیرت کی ساری تفصیلی تاریخ کا انتظار نہ پیدا ہو جائے۔ پس یہ تحریر ایک تمثیلی تحریر ہے۔ جس سے یہ باور کرانا مقصود ہے کہ اس باب میں پیش کردہ مثالوں کی طرح اور زائد مثالیں بھی پیش کی جا سکتی ہیں۔ پس یہ ایک راہ نمائی ہے اگر رہبری کا جذبہ رکھنے والے اس کے تحت راہ پیمائی اختیار کریں گے تو سیرت کے باقی ماندہ پہلوؤں کو بھی اسی آیت سے کھول سکتے ہیں اور وہ سب کھل کھل کر اسی آیت کے مدلول بنتے رہیں گے۔ حاصل مدعا یہ ہے کہ بیان سیرت میں قرآن اصل ہے اور یہ ساری روائتیں اور مستند حکایتیں جو سیرت کی مستند کتابوں میں پھیلی ہوئی ہیں، قرآن کے بیان اور توضیح کے طور پر وارد ہوئی ہیں۔ پس قرآن حکیم محض احکام و اصول کے بارہ میں دستور اساسی نہیں بلکہ سیرت اور تمام مقامات و اخلاقِ نبوت کے بارہ میں بھی اساس و بنیاد ہے اور جس طرح احکام کی روائتیں ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ اس کا بیان واقع ہو رہی ہیں، اسی طرح سیرت کی روائتیں بھی اس کے بیان کے طور پر وارد ہوئی ہیں اور جس طرح محققین کے قول کے مطابق صرف ایک آیت ما آتاکم الرسول فخذوہ وما نھاکم عنہ فانتھوا امر و نہی کی ساری حدیثوں کے لئے ماخذ ہے اور احکام کی ساری حدیثیں اسی آیت کا بیان واقع ہو رہی ہیں اسی طرح احقر کے فکر ناقص میں سیرت کی تمام احادیث و اخبار اور روایات و آثار اسی ایک آیت

وَداعیاً الی اللہ باذنہ وسراجاً منیراً ۔ کا بیان ہو رہی ہیں اور ان ساری اخبار و روایات کا ماخذ بھی یہی آیتِ کریمہ بنی ہوئی ہے۔

چنانچہ اس ایک ہی آیتِ کریمہ نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو عالم کے سب سے بڑے داعی الی اللہ کی حیثیت سے سامنے لاکر (جو اس آیت کے مضامین کا اصل محور اور حقیقی موضوع ہے) آپ کی ساری داعیانہ سیرت اور پیغمبرانہ فضائل و کمالات کی تاریخ پر روشنی ڈال دی ہے۔ یعنی داعی الی اللہ کا کلمہ اصل مقصود بیان ہے اور باقی کلمات شاھد۔ مُبشر۔ نذیر اس دعوت کے مبادی و آثار کے طور پر ذکر کئے گئے ہیں۔ جن میں ساری سیرت ہوتے پنہاں ہے۔ کیونکہ بنیادی طور پر دعوت کے سلسلہ میں سب سے پہلے داعی کی ذات آتی ہے کہ وہ حجت و سند ہو اور اس کا ہر قول و فعل، کردار و گفتار، عادات و اخلاق۔ رہن سہن، اٹھنا بیٹھنا۔ چلنا پھرنا۔ رلنا ملنا۔ سونا جاگنا۔ عادت و عبادت، معاملت، و معاشرت۔ حتیٰ کہ حوائج ضروریہ تک کا ایک ایک انداز حجت اور معیار کامل ہو کر اس کے بغیر اس کی دعوت حجت نہیں ہو سکتی گویا دعوت داعی کی ذاتی عظمت و کمال کے بغیر وجود پذیر نہیں ہو سکتی، سو اس ذاتی کردار و عظمت، اور اس کی حجیت کے تمام مقامات تو شاھداً کے نیچے درج ہیں۔ جن پر دعوت الی اللہ کی عمارت کھڑی ہوئی ہے۔ پھر خود دعوت کے بھی کچھ اصول و ارکان ہیں۔ جن کے بغیر دعوت مکمل اور مؤثر نہیں ہو سکتی اور وہ ترغیب و ترہیب ہے۔ جس کے بغیر دعوت کی تاثیر قوی نہیں ہو سکتی کہ مخاطبین دعوت اس دعوت کا اثر قبول کریں اور یہ سارے مؤثراتِ دعوت مبشر اور نذیر کے نیچے درج ہیں۔ جن پر دعوت کی تکمیل اور تاثیر موقوف ہے اس لیئے داعیاً الی اللہ سے پہلے شاہد اور مبشر و نذیر کے کلمات لاکر دعوت الی اللہ کے ان دو مقاموں داعی کی ذاتی عظمت و شان یعنی ان کا شاہد و حجت ہونا اور خود دعوت کے اصول و ارکان یعنی بشیری و نذیری سے ترغیب و ترہیب کی طرف راہنمائی فرمائی گئی تاکہ داعی الی اللہ کی داعیانہ زندگی کے اصول و مبادی کی مکمل تصویر سامنے آجائے۔

پھر دعوت کے ان اساسی کلمات شاہد و مبشر و نذیر کو بلا کسی قید و شرط کے علی الاطلاق لاکر اس دعوت کی عمومیت اور ہمہ گیری کی طرف اشارہ کیا گیا ہے. جو درحقیقت ختم نبوت کا موضوع ہے. اور آخر میں داعی اور دعوت کے ان ہمہ گیر پہلوؤں کو جو ان کلمات میں دریا بکوزہ کی مانند سمائے ہوئے ہیں. سراجًا منیرًا کا کلمہ لاکر ان کے کھلنے کی راہ دکھلائی گئی ہے. جس سے سیرت ختم نبوت کے ان سارے پہلوؤں کا نقشہ اک دم سامنے آجاتا ہے. پس آیت کا عمودی کلمہ جس پر اس آیت سیرت کے تمام مضامین گھوم رہے ہیں، داعیًا اِلی اللّٰہ ہے اور آیت کا تفہیمی اور تشریحی کلمہ جس سے یہ مضامین کھلتے ہیں، سراجًا منیرًا ہے. اس لئے آیت کے انہیں دو کلموں کو ہم نے اپنی تحریر کا موضوع قرار دیا ہے. جس سے ہمیں سیرتِ نبوت اور ختم نبوت کے مقامات کو اس آیت سے نکلتا ہوا دکھلانا ہے.

ظاہر ہے کہ سیرت نبوت کے لئے بطور ماخذ قرآن کا حوالہ آجانے اور بالفاظ مختصر قرآنی دلالت کے نیچے آجانے سے سیرت کے ان تمام پہلوؤں کی محض تاریخی حیثیت نہیں رہتی بلکہ ان میں قرآنی دلالت سے ایک گونہ قطعیت کی ایک شان آجاتی ہے. جس سے وہ عام تاریخ کی سطح سے بلند ہو کر استناد و حجیت کے اعلٰے مقام پر پہنچ جاتے ہیں. جو منکرین سیرت یا منکرین حدیث کے اوپر تو حجت بن جائیں گے اور عاشقانِ سیرت نبوت کے لئے انشراح کامل اور انبساط تام کا ذریعہ ثابت ہوں گے. اور ادھر قرآن حکیم کی اعجازی شان اور اس کے معجزانہ بیان کی ایک بلیغ ترین مثال بھی سامنے آجائے گی. جس سے واضح ہو گا کہ قرآن کریم ان بے شمار حقائق کے ذخیروں کو جو دفتروں میں نہیں سما سکتے اپنے چھوٹے چھوٹے کلموں اور مختصر اعجازی جملوں میں کس طرح سمیٹ کر ادا کر دیتا ہے اور وہ بھی اس شان کے ساتھ کہ یہ روائتی تفصیلات مل کر بھی مقصود کا وہ احاطہ نہیں کر سکتیں جو قرآن کا یہ اعجازی اجمال مدعا کو جامعیت کے ساتھ پیش کرنے میں اپنی اعجازی شان دکھا دیتا ہے.

لیکن اس سب کے باوجود اس تحریر سے میرا دلی منشا اور حقیقی مقصد اگر یہ ہے

پوچھئے تو صرف یہ ہے کہ اس حیلہ سے حضرت خاتم الانبیا سردار دو عالم محمد صلی اللہ علیہ وسلم کا ذکرِ مبارک اور آپ کی مقدس سیرت کا کوئی ذکرِ خیر اس نالائق کی زبانِ قلم پر بھی آجائے اور سیرت نگاروں کی فہرست کے کسی کونے میں اس نامہ سیاہ غلام نبوۃ کا بھی اس بہانہ سے نام لکھا جائے اور ساتھ ہی سیرت کے ان بنیادی مقامات کے سلسلہ سے اُن ہی کی روشنی میں کچھ شرعی حقائق بھی بیان میں آجائیں جو سیرت کے پس منظر کے طور پر ان مقامات سے متعلق ہیں۔ ورنہ میں جانتا ہوں کہ کہاں یہ سیرت نگاری اور کہاں یہ ناکارۂ علم وعمل۔ کہاں حقائق بیانی اور کہاں ایک ناقص الاستعداد کی یہ طالب علمانہ یادداشت چراغِ مردہ کجا نورِ آفتاب کجا؟ لیکن اگر یہ نام کی سیرت نگاری انگلی کاٹ کر شہیدوں میں داخل ہونا بھی نہ کہی جائے۔ صرف انگلی کو لہو لگا کر شہیدوں کی صورت بنالینا ہی سمجھ لی جائے۔ تب بھی اپنی سعادت کے لئے کافی ہے۔

کیا عجب ہے کہ وہ پروردگار جس کی عادت کریمہ اچھی صورتوں میں اچھی حقیقتیں ڈالنا ہے۔ اپنے اس ناکارہ بندے کی اختیار کی ہوئی اس اچھی صورت کو اچھی حقیقت سے بھرپور کر دے اور کیا بعید ہے کہ اس مختصر اور بے ربط سی تحریر سے سیرت نبوۃ کی علمی یا عملی برکات کا کوئی اثر راقم الحروف اور ناظرین حروف کے دلوں تک پہنچ جائے۔

وَما ذالك علی اللہ بعزیز وھو حسبی ونعم الوکیل ؛

محمد طیب غفر لہ ولوالدیہ

مدیر دار العلوم دیوبند

۱۲ ربیع الاول ۱۳۷۵ھ

آفتابِ نبوّت

قَالَ اللّٰہ جَلَّ ذِکرُہٗ وعزّ اسمہٗ واَعظمُ شانہ وجل بُرھانہٗ یا اَیُّھَا النّبیُّ اِنّا اَرسلنٰکَ شاھِداً وَّ مُبَشِّراً وَّ نَذِیراً وَّ دَاعِیاً اِلَی اللّٰہِ بِاِذنِہٖ وَسِرَاجاً مُّنِیراً ﴿﴾

لَنَا شَمسٌ وَلِلآفَاقِ شَمسٌ — وَشَمسِی خَیرٌ مِّن شَمسِ السَّمَاءِ

شَمسُ النَّاسِ تَطلُعُ بَعدَ فَجرٍ — وَشَمسِی تَطلُعُ بَعدَ العِشَاءِ

سیرت میں قرآن کی اعجاز بیانی

الحمد للّٰہ وسلام علیٰ عبادہ الذین اصطفٰی ۔ موضوع تحریر اس وقت کلمۂ پاک ” وَسِرَاجاً مُّنِیراً “ ہے ۔ جس میں حضرت خاتم الانبیاء محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت اور پیغمبرانہ سیرت کے بنیادی مقامات پر صرف دس حرفوں میں اتنی تفصیلی روشنی ڈالی گئی ہے کہ سینکڑوں مجلدات بھی اُن کی اتنی توضیح اور تفصیل نہیں کر سکتی تھیں اور پھر ایسے جامع اور بلیغ پیرایہ میں کہ نہ صرف مقامات سیرت ہی کھول دیئے گئے ہیں بلکہ تمام انبیاء و مرسلین کی سیرتوں پر آپ کی سیرت کی فضیلت و فوقیت بھی نمایاں کر دی گئی ہے ۔ یعنی سیرت کی تفصیل اور اس کی تفضیل سب اسی ایک مختصر سے کلمہ میں سمو دی گئی ہے ۔

شاید ناظرین اوراق کو حیرت ہو کہ ” سراجِ منیر “ کے کلمہ میں تفصیلات سیرت تو

بجائے خود ہیں۔ ہمیں تو کوئی اجمال بھی نظر نہیں آتا بلکہ اجمال بھی بجائے خود ہے ہمیں تو اس دس حرفی کلمہ میں سیرت کا کوئی دعویٰ تک محسوس نہیں ہوتا۔ یہ کوئی شاعرانہ تخیل تو نہیں، جو قرآن کے سر لگایا جا رہا ہے؟ میں گزارش کروں گا کہ حاشا ثم حاشا نہ قرآن حکیم ہی کو شاعری سے کوئی تعلق نہیں اور نہ ہی کسی مومن قرآن کی یہ مجال ہو سکتی ہے کہ اپنی کسی شاعری کو اس کے سر تھوپے وہ تو وماھو بقول شاعر کا سچا مصداق اور سچی پکی حقیقتوں کا سرچشمہ ہے۔ جس میں تخیل آفرینی کا تصور بھی گناہ ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ واقعتہً قرآن حکیم نے "سراج منیر" کے چھوٹے سے کلمہ میں حضورؐ کی بلند پایہ سیرت اس کی تفصیل پھر اس کی تفضیل اور پھر اس کے سارے ہی بنیادی مقامات پر واضح روشنی ڈالی ہے۔ مگر تعبیر کی راہ سے نہیں، بلکہ تمثیل کے راستے سے۔ اس نے لمبے چوڑے الفاظ میں سیرت کے ابواب کی کوئی طویل و عریض فہرست شمار نہیں کرائی۔ بلکہ تشبیہ کے راستے سے وجود شبہ کی طرف توجہ دلا کر ان مشابہتوں سے نکلتے ہوئے مقامات سیرت ایسے اعجازی رنگ سے کھول دیئے ہیں کہ تھوڑے سے فکر سے باآسانی سمجھ میں آ سکتے ہیں۔

اس اندازِ بیان کو اختیار کرنے کی وجہ بظاہر اس طرف رہنمائی کرنا ہے کہ مقامات نبوت اور اُن سے پیدا شدہ کمالاتِ ظاہر و باطن کیفیاتی امور ہیں، جنکا تعلق بیان سے نہیں مشاہدہ سے ہے اور مشاہدہ بغیر ان مقامات سے گزرے ہوئے ہو نہیں سکتا۔ اس لئے بیان کتنا ہی فصیح و بلیغ اور جامع کیوں نہ ہو۔ کیفیت و حقیقت اس کی گرفت میں نہیں آ سکتی۔ اگر ایک نابالغ بچہ کے سامنے بلوغ اور شباب کی کیفیات بیان کی جانے لگیں تو بیان کتنا ہی بلیغ اختیار کیا جائے نہ یہ کیفیت بیان سے کھل سکے گی اور نہ بچہ کسی درجے میں بھی اُسے سمجھ سکے گا۔ جب تک کہ خود جوان ہو کر بلوغ کے مقامات سے گذر نہ جائے۔ اسی طرح ایک جوان کے سامنے بڑھاپے کی کیفیات ایک بوڑھے کے آگے محتضر (جاں بلب) کی جان کنی کی کیفیات اور ایک محتضر کے سامنے عالم قبر و برزخ کی کیفیات نہ بیان کی گرفت میں آ سکتی ہیں، نہ یہ نارسیدہ

طبقات انہیں سمجھ سکتے ہیں، جب تک کہ ان کیفیاتی مقامات سے گذر نہ جائیں۔

در نیابد حال پختہ ہیچ خام

تمثیلی سیرت

پس وہ مقاماتِ نبوت جو اِن ذکر کردہ نفسانی کیفیات سے بدرجہا بالاتر بدرجہا لطیف تر اور مراتب بے شمار دقیق تر ہیں، بیان کی گرفت میں کہاں آتے تھے اور مقامِ نبوت سے ناآشنائے محض لوگوں کو محض لفظوں سے کیسے سمجھایا جا سکتا تھا۔ اس لئے انہیں عام فہموں سے کچھ قریب کرنے کے لئے تمثیل اور تشبیہ کا راستہ اختیار کیا گیا جو حقائق کے سمجھانے کا سہل ترین راستہ ہے، کیونکہ معنوی کیفیات کے مشابہ جب کوئی حسی صورت سامنے لا کر کھڑی کر دی جاتی ہے تو اس معنوی حقیقت کا سمجھنا ایک حد تک ممکن اور آسان ہو جاتا ہے۔ اس لئے کتاب و سنت میں بڑے بڑے دقیق مسائل جیسے ذات و صفات حشر و نشر، جنت و نار، میزان و صراط وغیرہ کو مثالوں ہی سے سمجھایا گیا ہے۔ حجت و برہان سے نہیں کہ یہ استدلالی راستہ خالی امور کے سمجھنے سمجھانے کا ہے ہی نہیں اور بے کیف انسان کیفیات کو محض لفظی ہیر پھیر سے سمجھ ہی نہیں سکتا۔

سیرت اور آفتاب کی تمثیل

اس لئے حضرت خاتم المرسلین علیہ افضل الصلوٰۃ والتسلیم کے کمالاتِ ظاہر و باطن اور مقاماتِ نبوت و خاتمیت کی لطیف ترین کیفیات کو جب کہ استدلال و بیان سے فہموں کے قریب کر دیا جانا ممکن نہ تھا تو اُن کی تفہیم و بیان کے لئے بھی تمثیل کا راستہ اختیار کیا گیا اور مادی محسوسات میں اس تمثیل و تشبیہ کے لئے ایک ایسی ہستی کا انتخاب کیا گیا۔ جو اپنے مادی اوصاف و کمالات کے لحاظ سے یکتائے عالم اور بے مثال تھی، جس کی نظیر سلسلۂ مادیات میں نہ علویات میں تھی، نہ سفلیات میں نہ آسمانوں میں تھی، نہ

زمینوں میں، گویا وہ کمالات کے لحاظ سے ایک گونہ یکتائی، وحدانیت اور خاتمیت لیے ہوئے تھی اور حضرت خاتم الانبیاء علیہ الصلوٰۃ والسلام بھی ساری مخلوقات میں بے نظیر اور بے مثال ہیں۔ اس لئے آپ کی یکتائے عالم ہستی کے روحانی کمالات اسی یکتائے مادیات ہستی کے کمالات کی حسی صورت میں سامنے لاکر روشناس کرائے گئے اور وہ مادیات کی یکتا اور بے نظیر ہستی آفتاب عالمتاب کی نورانی ہستی ہے۔ جو حضور کے کمالات کے لئے بطور بلیغ مثال کے چنی گئی۔

آفتاب کی خصوصیات

چنانچہ آسمان پر ستارے اور بھی ہیں اور سب ہی بر سرِ عروج وعظمت رہ کر نورانیت سے سرفراز ہیں، مگر جو جمال و کمال سورج کو ملا ہے۔ وہ اور کسی ستارے کو نہیں ملا اور جو تاثیر وتصرف اس کے حصہ میں آیا ہے۔ وہ اور کسی کو میسر نہیں ہوا۔ نیز جو غلبہ واقتدار اُسے دیا گیا ہے۔ وہ اور کسی سیارے کو نہیں دیا گیا پس آفتاب ان سارے ستاروں میں بمنزلہ بادشاہ کے ہے۔ جس کی حکومت وتاثیر سے کوئی ستارہ مستغنی نہیں حتیٰ کہ سارے ستارے اپنی نورانیت اور چمک دمک میں بھی سورج ہی کے محتاج ہیں، جن کی نورانیت آفتاب ہی کے نور سے قائم ہے اور ظاہر ہے کہ جب یہ علویات اس سے مستغنی نہیں جو سفلیات میں مؤثر ہیں تو سفلیات کا تو ذکر ہی کیا ہے کہ وہ تو عام ستاروں سے بھی مستغنی نہیں چہ جائیکہ آفتاب سے مستغنی ہوتے، چنانچہ جوّ اور فضاء، فضا میں پھیلے ہوئے متحرکات زمین اور اس کی پیداوار، فرش خاک اور اس پر بسنے والے نفوس میں سے کوئی چیز بھی [illegible] ہیں، جو اس کے فیضان کی محتاج نہ ہو۔ اس لئے سورج علویات اور سفلیات [illegible] کا مربی اور بادشاہ ہے۔

آفتاب کی عظمت و رفعت

اس کی عالمگیر رفعت وعظمت، ہمہ گیر تاثیر وتصرف اور تکوینی تربیت عام کو دیکھ

کر بہت سی اقوام کو اس کی ربوبیت اور الوہیت کا دھوکہ لگا اور وہ اس کی پرستش کا شکار ہو گئیں۔ بلقیس جیسی عظیم ملکہ نے باوجود وَأُوتِيَتْ مِن كُلِّ شَيْءٍ (اس دنیا کی ہر چیز دے دی گئی تھی) کی شان رکھنے کے اسی کی آب و تاب کے سامنے جبین نیاز جھکائی اور سر عبودیت خم کر دیا اور نہ صرف یہی بلکہ اس کی پوری قوم جو نَحْنُ أُولُو قُوَّةٍ وَأُولُو بَأْسٍ شَدِيدٍ (ہم نہایت زبردست قوت و طاقت والے ہیں) کی دعویدار تھی، اگر جھکی تو اسی دیوتا کے آگے جھکی، جس کے بارہ میں قرآن نے شہادت دی کہ

يَسْجُدُونَ لِلشَّمْسِ مِن دُونِ اللَّهِ ــــــ وہ خدا کو چھوڑ کر سورج کو پوجتے تھے۔

مجوس کی باشعور قوم نے ستارہ پرستی کے سلسلہ میں جو ہیکلیں اور عبادت گاہیں بنائیں، ان میں سب سے بڑی ہیکل اسی جہانتاب سیارہ (سورج) کی تھی، جس کی عمارت سونے کے رنگ کی بنائی گئی تھی اور اس میں منوں سونا اور سونے کا پانی کھپایا گیا تھا۔ آفتاب کی مثالی صورت کا بت خالص سونے کا بنا کر اس میں رکھا گیا تھا۔ اس ہیکل کے احاطہ میں آفتابی ہی رنگ کے برتن اور سامان استعمال کئے جاتے تھے۔ اور اس طرح مجوس میں متمدن قوم بھی اگر گری تو اسی ستارے کی بلندی کے سامنے گری اور اس کی پرستش میں گم ہو کر رہ گئی۔ نجومی جیسی فلسفی قوموں نے بھی اگر کسی جہان کی تاثیر و نصرت کا لوہا مانا تو ستاروں ہی کا مانا اور ان میں سب سے زیادہ باثر سورج کا جہان تسلیم کیا۔ جس کے آگے سر نیاز جھکا دیا۔ وہ عالم میں تاثیر ستاروں کی مانتے ہیں اور ستاروں میں سورج کی۔ گویا سورج تاثیر و نصرت کا شاہنشاہ ہے۔

حضرت ابراہیم خلیل اللہ علیہ السلام نے بھی سارے ستاروں میں اگر هٰذَا رَبِّي هٰذَا أَكْبَرُ (یہ ہے میرا رب اور یہی سب سے بڑا رب ہے) کہا تو اسی روشن اور درخشاں ستارہ کو دیکھ کر کہا تاکہ قوم متوجہ ہو جائے اور جب اُسے ان مجازی روشنیوں سے حقیقی نور اور هٰذَا أَكْبَرُ کے راستے سے اللہ اکبر کا جلوہ دکھایا جائے تو وہ إِنِّي وَجَّهْتُ کہہ کر اس رب مطلق کے سامنے سر عبودیت خم کر دے۔

بارگاہ الٰہی میں سورج کی بیچارگی

یہی وجہ ہے کہ جب اس عظیم الشان سیارہ کی چمک دمک اور تاثیر و تصرف کی ہمہ گیری اور یکتائی کے پیش نظر سادہ لوحوں کے لئے اس گمان کا موقعہ تھا کہ وہ اس کی الٰہیت اور خداوندی کے دھوکے میں پڑ جائیں تو حق تعالیٰ نے جہاں اُس کی تاثیر و تصرف اور فوائد و برکات کی فہرست قرآن حکیم میں شمار کرائی۔ وہیں کھلے لفظوں میں اولاً اس کی پرستش کو اہتمام کے ساتھ روکا اور فرمایا۔

لَا تَسْجُدُوا لِلشَّمْسِ وَلَا لِلْقَمَرِ وَاسْجُدُوا لِلّٰهِ الَّذِي خَلَقَهُنَّ إِنْ كُنْتُمْ إِيَّاهُ تَعْبُدُونَ ؁

نہ سورج کو سجدہ کرو، نہ چاند کو، ہاں سجدہ کرو اللہ کو جس نے اُن کو بنایا۔ اگر تم اس کی عبادت کرنا چاہتے ہو۔

پھر اس عظیم المرتبت سیارے کی بیچارگی و بے بسی اپنی بارگاہ رفیع کے مقابلہ میں ظاہر فرماتے ہوئے خود اس کی بندگی کی چال کو بھی آشکارا فرمایا کہ جب وہ خود ہماری بارگاہِ اقدس کے سامنے سجدے کرتا ہوا چلتا ہے تو تمہیں کیا ہو گیا ہے کہ تم خالق شمس و قمر کو چھوڑ کر اس بے بس مخلوق کی پرستش کے دلدل میں پھنس رہے ہو۔

أَلَمْ تَرَ أَنَّ اللّٰهَ يَسْجُدُ لَهُ مَنْ فِي السَّمٰوٰتِ وَمَنْ فِي الْأَرْضِ وَالشَّمْسُ وَالْقَمَرُ وَالنُّجُومُ وَالْجِبَالُ وَالشَّجَرُ وَالدَّوَابُّ وَكَثِيرٌ مِنَ النَّاسِ وَكَثِيرٌ حَقَّ عَلَيْهِ الْعَذَابُ ؁

کیا تم دیکھتے نہیں کہ اللہ ہی کو سجدہ کرتی ہے ہر وہ چیز جو آسمانوں اور جو زمینوں میں ہے اور سورج اور چاند اور ستارے اور پہاڑ اور درخت چوپائے اور بہت سے انسان اور بہت سے وہ بھی جن پر عذاب ثابت ہو چکا ہے۔

پس اس آیت میں نہ صرف سورج کی بندگی ہی ظاہر فرما دی گئی ہے۔ جس سے اس کی معبودیت کی نفی ہو جائے، بلکہ اُسے عام چھوٹی بڑی مخلوق کے ساتھ ملا ملا کر اس طرح ذکر کیا گیا ہے کہ بلحاظ مخلوقیت اس کی حیثیت عام مخلوق سے زیادہ کچھ

نہیں بلکہ مخلوق ہونے میں اک ذرۂ زمین اور یہ آفتاب فلک سب برابر ہیں، پھر اس کے آگے بڑھ کر اس کی عام نقل و حرکت میں بھی اس کی مجبوری اور بے لبسی واضح فرما دی گئی تاکہ کسی درجہ میں بھی اس کی الوہیت کا وسوسہ دماغوں میں نہ آنے پائے۔ فرمایا،

لَا الشَّمْسُ يَنْبَغِي لَهَا اَنْ تُدْرِكَ الْقَمَرَ وَلَا الَّيْلُ سَابِقُ النَّهَارِ وَكُلٌّ فِي فَلَكٍ يَّسْبَحُوْنَ ۝

سورج کی مجال میں نہیں ہے کہ چاند کو پا لے اور نہ رات دن پر مقدم ہو سکتی ہے۔ ہر ایک اپنے اپنے فلک پر تیر رہا ہے۔

بہر حال اولاً اس کی پرستش سے خصوصی ممانعت پھر اس کی مخلوقیت کی اطلاع پھر نقل و حرکت میں اس کی بے بسی اور بیچارگی کا اظہار اور پھر اس کی عبدیت واطاعت اور فرمانبرداری کا کھلا اعلان صرف اسی لئے کیا گیا ہے کہ اس کی عام تہیبت، وتاثیر اور نمایاں جاہ و جلال کو دیکھ کر کوئی اس کی پرستش کی طرف نہ جھک جائے۔

انبیاء کی عظمت کے ساتھ ساتھ اُن کی عبدیت

سورج کی ذات میں یہ مثال ہے عموماً تمام انبیاء علیہم السلام اور خصوصاً نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے پُرعظمت احوال و مقامات اور پُرعبدیت وطاعت حالات کی یعنی جیسا کہ انبیاء اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ پر اگر خوارق اور معجزات ظاہر کئے گئے اور اُن کے غیر معمولی تصرفات کے کارنامے دکھلائے گئے۔ جن سے ان کی ہستیاں مافوق العادت اور غیر معمولی عظمت و رفعت کی حامل بن کر نمایاں ہوئیں تو وہیں اس خطرہ سے کہ مخلوق ان عجائبات اور مافوق العادت امور کو دیکھ کر کہیں اُن کی خداوندی کا خیال نہ جما بیٹھے، انبیاء پر عام بشری عوارض دکھ، درد، بیماری، مصائب، مشکلات، آفات، چوٹ، زخم خوردگی، لوگوں کی بدگوئی اور ظاہری بے کسی، بے وسیلگی حتیٰ کہ قتل و مظلومیت کے حالات بھی طاری کئے گئے، بلکہ بتصریح حدیث نبوی انہیں عام مخلوق سے زیادہ مبتلائے مصائب کیا گیا تاکہ بارگاہِ خداوندی کی نسبت سے اُن کی عبدیت و بیچارگی زیادہ سے زیادہ نمایاں ہو جائے اور ان کی الوہیت اور معبودیت کے

لئے دلوں کے کسی گوشہ میں کوئی گنجائش باقی نہ رہے۔ حتیٰ کہ اس مقدس اور پاک گروہ کے فردِ اکمل (نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم) کو جن سے زیادہ اللہ کے یہاں کوئی فرد مکرم ومحترم نہیں، امر فرمایا گیا کہ تمام انبیاء کی طرح آپ بھی اپنے آپ کو دوسرے عام انسانوں میں رلا ملا کر اپنی بشریت کا اعتراف فرمائیں اور کہہ دیں کہ قُلْ اِنَّمَا اَنَا بَشَرٌ مِّثْلُكُمْ يُوحٰىٓ اِلَيَّ ؕ تاکہ کسی کو بھی آپ کی بشریت کے انکار اور فوق البشریت قسم کے معاملات کرنے کی جرأت نہ ہو۔ پھر بعض اوقات آپ کو ایسے جلالی رنگ اور حاکمانہ انداز سے خطاب کیا جاتا ہے۔ جیسے کسی عامی مخلوق کو مخاطب بنایا جا رہا ہے، محض اس لئے کہ آپ کی محکومیت اور عبدیت ہر جہت سے ثابت ہو جائے، چنانچہ حضور اکرم علیہ السلام کو ڈرانے اور زجر کے انداز سے خطاب فرماتے ہوئے کہا گیا کہ:۔

لَئِنْ اَشْرَكْتَ لَيَحْبَطَنَّ عَمَلُكَ وَلَتَكُوْنَنَّ مِنَ الْخٰسِرِيْنَ ؕ

اگر (بغرض محال) آپ بھی شرک کرنے لگیں تو آپ کے اعمال بھی ختم کر دیئے جائیں گے اور آپ خسارہ اٹھانے والوں میں سے ہو جائیں گے۔

اعلان عبدیت کا حکم

پھر آپ کو یہ بھی حکم دیا گیا کہ خود اپنی طرف سے بھی اپنی بے بسی اور بیچارگی کا اعلان کریں۔

قُلْ اِنِّيْ لَآ اَمْلِكُ لَكُمْ ضَرًّا وَّلَا رَشَدًا قُلْ اِنِّيْ لَنْ يُّجِيْرَنِيْ مِنَ اللّٰهِ اَحَدٌ وَّلَنْ اَجِدَ مِنْ دُوْنِهٖ مُلْتَحَدًا ؕ

آپ کہہ دیجئے کہ میں تمہارے نہ کسی ضرر کا اختیار رکھتا ہوں اور نہ کسی بھلائی کا۔ آپ کہہ دیجئے کہ مجھ کو خدا سے کوئی نہیں بچا سکتا اور نہ میں اس کے سوا کوئی پناہ پا سکتا ہوں۔

نہ صرف یہی اعلان کہ مجھے دوسروں پر کوئی دسترس نہیں بلکہ یہ بھی اطلاع دے

دو کہ خود میرا بھی میرے اوپر کوئی بس نہیں اور میں بذاتِ خود حاکم نہیں بلکہ ایک متبع حق محکوم ہوں، جس میں سارے تصرفات مالک حقیقی ہی کے ہیں، جو قیامت تک اور قیامت کے بعد تک ہوتے رہیں گے۔

قل ما کنت بدعاً من الرسل وما ادری ما یفعل بی ولا بکم ان اتبع الا ما یوحی الی وما انا الا نذیر مبین ؏

آپ کہہ دیجئے کہ میں کوئی انوکھا رسول تو ہوں نہیں اور میں نہیں جانتا کہ میرے ساتھ کیا کیا جائے گا اور نہ تمہارے ساتھ، میں تو صرف اسی کا اتباع کرتا ہوں جو میرے پاس وحی کے ذریعے سے آتا ہے اور میں تو صرف صاف صاف ڈرانے والا ہوں۔

حتیٰ کہ جب منکرین نے آپ کو عاجز کرنے کے لئے مخصوص معجزات کے مطالبے شروع کئے اور کہا کہ

لن نومن لک حتیٰ تفجر لنا من الارض ینبوعاً تکون لک جنۃ من نخیل وعنب فتفجر الانہار خلالہا تفجیرا او تسقط السماء کما زعمت علینا کسفا او تاتی باللہ والملائکۃ قبیلا او یکون لک بیت من زخرف او ترقی فی السماء ولن نومن لرقیک حتیٰ تنزل علینا کتاباً نقرؤہ ؏ (پ ۱۵ رکوع ۹)

ہم آپ پر ہرگز ایمان نہ لائیں گے جب تک آپ ہمارے لئے زمین سے کوئی چشمہ نہ جاری کر دیں یا آپ کے لئے کھجور انگوروں کا کوئی باغ نہ ہو پھر اس باغ کے بیچ بیچ میں جگہ جگہ بہت سی نہریں آپ جاری کر دیں، یا جیسا آپ کہا کرتے ہیں، آپ آسمان کے ٹکڑے ہم پر نہ گرا دیں، آپ کے پاس کوئی سونے کا بنا ہوا گھر نہ ہو یا آسمان پر نہ چڑھ جائیں اور ہم تو آپ کے چڑھنے کو بھی کبھی باور نہ کریں، جب تک کہ آپ ہمارے پاس ایک نوشتہ نہ

لائیں جس کو ہم پڑھ بھی لیں۔

تو آپ سے فرمایا گیا کہ صاف لفظوں میں اپنی بے بسی اور عجز بشریت کا اعلان فرما دیجئے۔ قُلْ سُبْحَانَ رَبِّیْ هَلْ كُنْتُ اِلَّا بَشَرًا رَّسُوْلًا ؎

بہر حال سارے عجز و نیاز کے کلمات اور یہ مجبوری اور بے کسی کے عنوانات محض اس لئے ان برگزیدہ ہستیوں کے لئے تجویز کئے گئے اور ان سے کہلائے گئے کہ ان بلند پایہ حالات اور ان کے معجزات اور کرامتوں کو دیکھ کر بے بصروں کو ان کی خدائی کا دھوکہ نہ لگ جائے اور جنہیں لگ گیا ہے، وہ باقی نہ رہنے پائے۔

ٹھیک اسی طرح مادیات میں سورج کی غیر معمولی عظمت و رفعت اور آسمان و زمین کی دنیا میں اس کی یہ خاص یکتائی اس کا احتمال رکھتی تھی کہ بے بصیرتوں کو اس کی خدائی کا دھوکہ لگ جائے اور وہ خالق شمس و قمر کو چھوڑ کر شمس و قمر اور خصوصاً شمس کے پیچھے ہولیں، اس لئے اس پر یہ بیچارگی اور بے بسی کی گردشیں مسلط کی گئیں کہ وہ رات دن چکر میں رہے۔

کبھی عروج اور کبھی نزول، کبھی کسوف اور کبھی خسوف، کبھی روشنی کی تیزی اور کبھی ہلکاپن، کبھی حدت، کبھی شدت اور کبھی خفت تاکہ ان تغیر پذیر احوال کو دیکھ کر اس کے بارہ میں لوگ پرستش کے وسوسوں کا شکار نہ ہوں اور جو ہو چکے ہیں، وہ اس سے نکل جائیں اور صرف مالکُ الملک ہی کی معبودیت ہی کا جھنڈا عالم میں بلند رہے۔

تاہم اس کی بیچارگی کو اس شد و مد سے سامنے لایا جانا ہی اس کی بھی دلیل ہے کہ سورج ہی جیسے عظیم المرتبت سیارہ میں معبودیت کے شبہات کا مظنہ بھی ہو سکتا تھا، جس کی پیش بندی اور روک تھام کی ضرورت پیش آئی۔

آفتاب کی جامعیت

اس سے ہمارا یہ مدعا صاف طور پر ثابت ہو گیا کہ ان نشانات رفعت و عظمت اور ساتھ ہی آثارِ قدرت و عبدیت کی یکتائی کی وجہ سے سورج ہی ایک ایسا یکتا اور جامع

شیون ستارہ تھا کہ عالم روحانیت کے جوہر یکتا اور دُرِ پاک جناب محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی مخصوص سیرتوں اور احوال و کمالات کھولنے کے لئے تمثیل کا کام دے سکے اور وہی اس قابل تھا کہ اس کے احوال و صفات کو پیش کر کے حضور کے احوال و اوصاف رفیعہ کو ان کے ذریعہ مثل محسوس کے دکھایا جائے ظاہر ہے کہ جب کسی بلند ترین حقیقت اور اعلیٰ ترین روحانی کیفیت کے مشابہ کوئی بلند ترین حسی صورت سامنے آجائے گی تو اس کے مشابہ معنوی حقیقت کا ادراک آسان ہو جائے گا۔ پس حضرت خاتم الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم کے کمالات ظاہر و باطن اور مقاماتِ نبوت وختم نبوت تک فہم کی رسائی، جب کہ کسی تعبیری بیان سے ممکن نہ تھی تو سراج منیر ہی کی بلیغ اور جامع ترین مثال ہو سکتی تھی، جس سے تشبیہ دے کر یعنی آپ کو آفتابِ نبوت دکھلا کر آپ کے تمام مقاماتِ سیرت کو اقرب الی الفہم کر دیا جائے۔ چنانچہ قرآن نے آپ کو سورج سے تشبیہ دیتے ہوئے اپنے معجزانہ لہجے میں دعویٰ کیا کہ

وَدَاعِيًا إِلَى اللّٰهِ بِإِذْنِهٖ وَسِرَاجًا مُّنِيرًا ۝

(اے پیغمبر ہم نے آپ کو بھیجا ہے) داعی الی اللہ بنا کر اپنے حکم سے اور روشن چراغ بنا کر۔

جس سے آپ کے آفتاب نبوت ہونے کا دعویٰ سامنے آجاتا ہے۔

آفتاب کا قرآنی لقب

اس موقعہ پر آپ کے ذہن میں شاید یہ کھٹک پیدا ہو کہ سراج کے معنیٰ تو لغت عرب میں چراغ کے ہیں، سورج کے نہیں، اس لئے اس آیت میں اگر آپ کو تشبیہ دی گئی ہے تو روشن چراغ سے دی گئی ہے، نہ کہ سورج سے اور محض چراغ سے حضور کو تشبیہ دیا جانا کوئی خاص اہمیت نہیں رکھتا اور نہ ہی اس تشبیہ سے آپ کے ہمہ گیر کمالات پر کوئی جامع روشنی ہی پڑ سکتی ہے تو پھر سراج سے سورج

کیسے مراد لے لیا گیا؟

جواباً عرض ہے کہ جہاں تک لغت کا تعلق ہے۔ عربی زبان میں سراج کے معنی محض چراغ ہی کے نہیں، بلکہ سورج کے بھی آتے ہیں۔ چنانچہ لسان العرب کی تیسری جلد میں والشمس سراج النہار (آفتاب دن کا چراغ ہے) کہہ کر آفتاب کو چراغ کہا گیا ہے۔ جس سے واضح ہوا کہ لغت میں شمس چراغ کو بھی کہتے ہیں، اور پھر والسراج الشمس (چراغ سورج ہے) کہہ کر چراغ کو آفتاب کہا گیا ہے۔ جس سے واضح ہوا کہ لغت میں سراج سورج کو بھی کہتے ہیں۔ آگے صاحب لسان العرب نے اس پر اس آیت کریمہ وسراجاً منیراً کو بطور دلیل کے پیش کیا ہے۔ جس کے یہ معنی ہیں کہ ان کے نزدیک بلحاظ لغت اور بلحاظ تفسیر اس آیت میں سراج کے معنی چراغ کے بھی لئے جا سکتے ہیں اور سورج کے بھی۔ چنانچہ اس کی تصریح کرتے ہوئے لکھتے ہیں:۔

انما یرید مثل السراج الذی یُستَضَاء بہ او مثل الشمس فی النور والظہور۔ (لسان العرب صفحہ ۱۲۲)	بلاشبہ اس آیت میں سراج منیر سے حق تعالیٰ نے حضورؐ کو یا چراغ کی مثل فرمایا ہے۔ جس سے روشنی حاصل کی جاتی ہے یا آفتاب کی مانند فرمایا ہے۔ نور میں اور ظہور میں۔

اس سے واضح ہے کہ سراج منیر سے حضور کو آفتاب سے تشبیہہ دیا جانا لغت کے عین مطابق ہے۔ تفاسیر کو دیکھا جائے تو ان کی رو سے بھی سراج کے معنی چراغ اور آفتاب دونوں کے لئے جا سکتے ہیں۔ صادی حاشیہ جلالین میں لکھتے ہیں۔

قولہ وسراجاً یحتمل ان المراد بالسراج الشمس وھو ظاہر ویحتمل ان المراد بہ المصباح	سراج منیر کے معنی میں دونوں احتمال ہیں ایک یہ کہ سراج سے مراد آفتاب ہو اور ظاہر یہی ہے اور دوسرے یہ کہ اس سے

مراد چراغ ہو۔

بیضاوی کے محشی نے بھی آیت میں دونوں احتمالوں کا ذکر کیا ہے۔ کہا کہ

وھوالشمس لقولہٖ تعالیٰ وجعل الشمس سراجاً اوالمصباح

(سراج منیر جس سے روشنی حاصل کی جاتی ہے۔) یا تو اس سے مراد آفتاب ہے۔ کیونکہ قرآن نے آفتاب ہی کو سراج کہا ہے اور یا چراغ مراد ہو۔

حافظ ابن کثیر محدث اپنی مشہور و مقبول تفسیر میں لکھتے ہیں۔

قولہٗ وسراجاً منیراً ای واھرک ظاھر فیما جئت بہ من الحق کالشمس فی اشراقھا واضاءتھا لا یجحدھا الا معاند۔

(تفسیر ابن کثیر مصری)
(سورۂ احزاب ص۵۰۳)

سراج منیر کے معنی یہ ہیں کہ اے پیغمبر تمہارا معاملہ تمہاری لائی ہوئی شریعت کے بارہ میں ایسا نمایاں اور واضح ہے۔ یعنی تم اپنے امر میں ایسے روشن اور کھلے ہوئے ہو، جیسے سورج اپنی چمک دمک میں نمایاں ہوتا ہے کہ معاند کے سوا کوئی اس کا انکار نہیں کر سکتا۔

بہرحال تفسیروں کا رخ اس بارہ میں واضح ہے کہ سراج سے سورج بھی مراد لیا جا سکتا ہے اور لیا گیا ہے۔ چنانچہ ابن کثیر نے احتمال کے طور پر نہیں بلکہ تعین کے ساتھ واضح کر دیا۔ یہاں سراج سے سورج ہی مراد ہے۔ اس لئے لغت اور تفسیر دونوں اس پر متفق ہیں کہ یہاں سراج سے آفتاب مراد لیا جانا لغت اور تفسیر دونوں کے لحاظ سے درست اور صحیح ہے۔

لغت اور تفسیر کے علاوہ اگر عین قرآن پر نظر کی جائے تو اس سے نمایاں طور پر واضح ہوتا ہے کہ یہاں سراج منیر کے معنی آفتاب ہی کے لئے گئے ہیں اور ذات بابرکات نبوی کو آفتاب ہی ثابت کرنا مقصود ہے۔ کیونکہ قرآن حکیم کی اصطلاح میں سراج لقب ہی آفتاب کا ہے اور اس سے سورج ہی مراد لیا جانا چاہیئے۔ جیسا

کہ قرآنی تعبیر میں چاند کا لقب نور ہے اور اس سے چاند ہی مراد ہوتا ہے۔ چنانچہ سورہ نوح میں چاند کو نور اور سورج کو سراج فرمایا گیا ہے۔ ارشاد ہے۔

وجعل القمر فیھن نوراً وجعل الشمس سراجاً ۔ اور ان میں چاند کو نور بنایا اور سورج کو چراغ بنایا۔

بلکہ قرآن کے عرف میں سورج کا یہ لقب (سراج) اس قدر معروف اور متعین ہے کہ اگر سورج کا نام لئے بغیر ہی سراج کا ذکر کر دیا جائے تو اس سے سورج کے سوا کوئی اور شے مراد ہی نہیں ہو سکتی۔ چنانچہ سورہ فرقان میں چاند کو منیر فرما کر اسکے متقابل سورج کا صرف یہ لقب (سراج) ہی ذکر کر دیا جانا کافی سمجھا گیا ہے۔ جس سے خود بخود سورج ہی ذہنوں میں آجاتا ہے۔ ارشادِ خداوندی ہے۔ وجعل فیھا سراجاً وقمراً منیرا ۔

اس آیت سے تو یہ واضح ہوا کہ قرآنی عرف میں سراج آفتاب ہی کا لقب ہے اور قرآن کی اصطلاح میں سراج آفتاب ہی کو کہتے ہیں۔ اب غور کیجئے کہ ایک طرف تو قرآن نے سورج کا مخصوص لقب سراج بتلایا ہے اور ادھر قرآن ہی نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو بھی سراج فرمایا ہے۔ جیسا کہ آیت وسراجاً منیرا سے واضح ہے، تو لقب کی اس وحدت سے کہ سورج بھی سراج ہے اور حضور بھی سراج ہیں اور سراج کے معنی قرآنی عرف میں آفتاب کے ہیں، حضور کا آفتاب ہونا آفتاب کی طرح روشن ہو جاتا ہے۔ حاصل یہ ہوا کہ اگر سورج کا مخصوص لقب سراج ہے اور وہی سراج حضور کا بھی لقب ہے تو قرآنی اصطلاح کے مطابق حضور آفتاب ثابت ہوئے۔ جو تشبیہ کا حاصل ہے اور خلاصہ یہ نکل آیا کہ اگر سورج فلکی آفتاب ہے تو حضور ملکی آفتاب ہیں، وہ افقِ آسمان سے طلوع کرتا ہے تو یہ افقِ زمین سے جس سے اس تمثیل کی نوعیت کھل کر سامنے آجاتی ہے۔ الحاصل اولاً لغت سے پھر تفسیر سے اور پھر عین قرآن سے ثابت ہوا کہ سراجاً منیراً میں سراج کے معنی آفتاب کے ہیں اور یہاں اس کا مصداق ذات بابرکات نبوی ہے تو حضور کی ذاتِ اقدس بلحاظ لغت و تفسیر و قرآن آفتاب ثابت ہوئی، اور

نمایاں ہوگیا کہ اِس آیت میں حضورؐ کو آفتاب سے تشبیہہ دینی مقصود ہے۔ جو ہمارا مدعا تھا۔

لیکن قبل اس کے کہ ہم اس تشبیہہ کی رو سے سیرت نبوی کے مقامات پر روشنی ڈالیں ایک اور شبہ کا ازالہ کر دینا ضروری سمجھتے ہیں اور وہ یہ کہ تشبیہ کے اس سلسلہ سے شاید کسی کو ذات بابرکات نبوی اور سورج میں مساوات اور برابری کا شبہ گزرے اور وہ یہ خیال کرنے لگے کہ شاید یہ مادی سورج اور وہ روحانی سورج برابر کے درجے کے ہوں گے یا بلاغت کے بعض استعمالات دیکھ کر کسی کو یہ وہم بھی پیدا ہو جائے کہ سلسلہ تشبیہ میں جس سے تشبیہ دی جاتی ہے۔

وہ اکثر اس سے افضل ہوتا ہے۔ جسے تشبیہ دی جا رہی ہو تو چاہیئے کہ سورج معاذ اللہ حضورؐ سے افضل ہو، جبکہ حضورؐ کو سورج سے تشبیہ دی جا رہی ہے ظاہر ہے کہ اس صورت میں حضورؐ کی فضیلت تو کیا ثابت ہوتی جو مقصود تھی اور الٹی سورج کی فضیلت ثابت ہو جائے گی، جو خلاف مقصد اور موضوع کے الٹ ہو جانے کے ساتھ ساتھ خلاف واقعہ بھی ہے۔ جواب یہ ہے کہ قرآن کریم نے اس تشبیہ کے ساتھ ساتھ ان دونوں آفتابوں کے مخصوص القاب ذکر فرما کر ان دونوں کی نوعیتوں کو الگ الگ نمایاں کر دیا ہے تاکہ ان میں سے ہر ایک کا درجہ اور مرتبہ مشخص اور واضح ہو جائے اور کسی کو حضورؐ کی نسبت سے سورج کی افضلیت یا مساوات کا دھوکہ نہ ہو۔ چنانچہ اس مادی سورج کی صفت تو قرآن نے وہاج ذکر فرمائی۔

وَبَنَيْنَا فَوْقَكُمْ سَبْعًا شِدَادًا ۙ وَّجَعَلْنَا سِرَاجًا وَّهَّاجًا ۙ	اور ہم ہی نے تمہارے اوپر سات مضبوط آسمان بنائے اور ہم ہی نے ایک روشن چراغ بنایا۔

وہاج کے معنی لغت عرب میں نور مع الحرارت کے ہیں۔ جو چیز روشن بھی ہو اور گرم بھی ہو، اُسے وہاج کہیں گے اور جس میں بہت زیادہ روشنی اور بہت زیادہ گرمی ہو، اسے مبالغہ کے ساتھ وہاج کہیں گے۔ پس سورج جس طرح بے حد روشن

ہے کہ اس پر نگاہ نہیں ٹھیر سکتی۔ اسی طرح بے حد گرم بھی ہے کہ اس کے نیچے زیادہ دیر تک یہ نگاہ والے بھی نہیں ٹھیر سکتے۔ جس سے واضح ہو جاتا ہے کہ یہ سورج ناریت لئے ہوئے ہے اور آگ کا سرچشمہ ہے۔ کیونکہ آگ ہی کی یہ شان ہوتی ہے کہ وہ روشن بھی ہو اور گرم بھی ہو۔ اس لئے یہ مادی آفتاب ناری سیارہ معلوم ہوتا ہے اور اسی لئے وہج کے لفظ سے اس کی توصیف کی گئی۔

لیکن آفتابِ نبوت کو حق تعالیٰ نے سراج فرما کر اس کا لقب دہاج کے بجائے منیر ذکر فرمایا جو چاند کی شان ہے۔ چنانچہ چاند کو قرآن نے منیر اور نور فرمایا ہے۔ (وَقَمَراً منیراً اور والقمر نوراً) جس میں روشنی کے ساتھ ٹھنڈک بھی ملی ہوئی ہے اس لئے منیر کے معنی ٹھنڈی روشنی والے کے ہوئے اور ثابت ہوا کہ اس آفتاب روحانی (ذاتِ نبوی) میں روشنی تو سورج کی سی ہے۔ جس میں چاند کا سا دھیما پن نہیں کہ ظلمتِ شب کافور نہ ہو سکے۔ مگر ٹھنڈک چاند کی سی ہے .... جس میں سورج کی سی سوزش اور تپش نہیں کہ اذیت دہ ثابت ہو۔ جس کا حاصل یہ نکلا کہ مادی سورج نار ہے اور روحانی سورج نور۔ اس سے دونوں آفتابوں کی روشنی اور نورانیت کی نوعیتوں کا فرق واضح ہو گیا کہ ایک ناری ہے اور ایک نوری۔

ساتھ ہی ان دونوں آفتابوں کی اصلیت کا فرق بھی اسی سے کھل جاتا ہے اور وہ یہ کہ مادی سورج چونکہ ناریت لئے ہوئے ہے اور نار کا مخزن جہنم ہے چنانچہ اس کی ہر چیز آتشین اور ایذا دہ ہے۔ اس کے پانی کو حمیم (کھولتا ہوا) کہا گیا۔ اس کے باشندوں کے جھلسے ہوئے چہروں کو کوئلہ سے تشبیہ دی گئی اور اس کی آگ کی انتہائی تیزی کی وجہ سے اس کے رنگ کو سیاہ بتلایا گیا۔ اس کی لپٹوں کی شدت وحرارت کی بنا پر خود آپس میں ان کا ایک دوسرے کو جلاتے رہنا اور ایذا دہ ہونا ظاہر کیا گیا۔ اس کے ملائکہ کو غضب مجسم ہونا ظاہر کیا گیا اور غضب جو آگ ہی کا ٹکڑا ہے۔ اس کے سانپ، بچھوؤں کے زہر کی انتہائی حرارت ظاہر کی گئی۔ جو خود آتشیں حصہ ہے۔ غرض جہنم آگ ہے تو اس کی ہر چیز آگ ہے۔ اس لئے ضروری ہے کہ

اس آگ سے سورج کو جہنم سے مناسبت ہو بلکہ حرارت و سوزش میں وہ جہنم کا نمائندہ ہو کر جہنم کی گرمی اور آگ جذب کر کے دنیا پر پھینکتا ہو جیسے آتشی شیشہ سورج کی حرارت جذب کر کے کاغذ اور کپڑے کو پھونک دیتا ہے۔ جس سے اس ناری سورج کی اصل جہنم ثابت ہوتی ہے۔ شاید اسی لئے کل شئی یرجع الیٰ اصلہٖ (ہر شے اپنی اصل ہی کی طرف لوٹتی ہے) کے اصول پر قیامت کے دن جب حساب کتاب ہو چکے گا تو چاند سورج کے یہ عظیم الشان کرّے اور بھاری بھاری گول اجسام جہنم میں ڈال دیئے جائیں گے۔ گویا وہیں پہنچا دیئے جائیں گے۔ جہاں سے ان کا نشوو نما اور وجود تھا۔

بخلاف روحانی آفتاب کے کہ وہ ناریت کے بجائے نورانیت کا پیکر ہے، جس میں روشنی کے ساتھ ٹھنڈک اور سلامتی ہے اور ظاہر ہے کہ نور و سلامتی کا مخزن جنت ہے۔ چنانچہ جنت کی ہر ہر چیز میں راحت و نورانیت ثابت ہے اس کے باشندوں کے چہروں کو چک دمک سے تشبیہ دی گئی۔ اوپر کی جنتوں کے باشندوں کو چمکدار ستاروں کی صورت میں نظر پڑنے کی خبر دی گئی۔ جب وہ نیچے والوں کو نظر پڑیں۔ وہاں کے محلات اور بیٹھنے کے ممبروں کو نور سے بنا ہوا کہا گیا۔ وہاں کی عورتوں کی پنڈلیاں شفافی اور چمک میں مثل شیشہ کے بتائی گئیں۔ جن میں آر پار کی چیزیں نظر آجائیں۔ وہاں کے دَرو دیوار مثل شیشہ کے فرمائے گئے۔ جن سے اندر باہر کی چیزیں نظر پڑیں گی۔ وہاں کے پانی کو برف سے زیادہ براق اور ٹھنڈا اور شہد سے زیادہ شیریں بتایا گیا۔ وہاں کی روشنی کو نور عرش کی روشنی کہا گیا۔ غرض جنت نور و سلامتی ہے تو اُس کی ہر ہر چیز میں نور و سلامتی ہے اس لئے ضروری ہے کہ اس نور و سلامتی کے سورج کو اس نورانی ٹھنڈک میں جس کی معنوی صورت، رحمت و رافت ہے۔ جنت ہی سے مناسبت ہو۔ بلکہ یہ آفتاب اس کا نمائندہ ہو کر وہاں سے نور و سلامتی جذب کرتا ہو اور دنیا پر پھینکتا ہو۔ چنانچہ آپ کے جسم مبارک جمال مبارک اور حقیقت پاک سب ہی میں نورانیت اور جاذبیت نظر آتی ہے۔ بات کرتے وقت بنص حدیث آپ کے دانتوں سے نور چھنتا ہوا نظر آنا۔ بینی مبارک (ناک) کا نور کی وجہ سے بلند محسوس ہونا

چہرۂ مبارک کا چمک دمک میں سورج جیسا محسوس ہونا. بنص حدیث کان الشمس تجری فی وجھہ (گویا) آفتاب آپ کے چہرے میں گھوم رہا ہے) چودھویں رات کے چاند سے چہرۂ مبارک کا مقابلہ کر کے صحابہ کا چہرے کے نور کو چاند پر فوقیت دینا اور حقیقت محمدی کو حدیث میں نور کہا جانا سب اسی کے علامات و آثار ہیں کہ یہ روحانی آفتاب ان انوار کے ہجوم کی وجہ سے اسی مخزن نور (جنت) سے مناسبت رکھتا ہے، نہ کہ جہنم سے. پس جیسے مادی سورج جہنم کے حق میں ایک بیٹری کی شان لئے ہوئے تھا. جو اس کی حرارت کو جذب کر کے دنیا پر پھینکتا تھا. ایسے ہی یہ روحانی سورج جنت وعرش کے حق میں بیٹری کی صورت ہوگا. جو ہمہ وقت اس کے نور کو جذب کر کے دنیا پر چھڑک رہا ہوگا.

شاید اس لئے کل شیٔ یرجع الیٰ اصلہ (ہر چیز اپنی اصل کی طرف لوٹتی ہے) کے اصول پر یہ آفتاب نبوت (حضرت سرور عالم صلی اللہ علیہ وسلم) ہمہ وقت جنت ہی کی باتیں کرتے ہیں. اسی کی طرف جھکتے ہیں. اسی کی ترغیب دیتے ہیں. اسی کا جغرافیہ اور تاریخ بیان فرماتے ہیں. اسی کی دعا مانگتے ہیں. اسی میں پہنچانے والے اعمال مانگتے ہیں اور کرتے ہیں.

اس بنا پر قرآن حکیم نے مادی سورج کو سراج وہاج فرمایا. جو روشنی و گرمی کا مجموعہ ہے اور روحانی سورج کو سراج منیر فرمایا. جو روشنی و ٹھنڈک کا مجموعہ ہے، وہ اگر وہاجیت سے اشیاء کو سوختت کرتا ہے تو یہ منیریت سے انہیں حد کمال کو پہنچاتا ہے. اُس کے سوز و تپش سے اگر مختلف اوقات میں اس سے بیزاری پیدا ہوتی ہے تو اِسکی نورانی ٹھنڈک سے ہمہ وقت عشق و محبت بڑھتا ہے. اُس میں اگر واقعیت کی شان ہے تو اِس میں جاذبیت کی ہے. وہاں جلاؤ ہوتا ہے. تو یہاں بجھاؤ. وہاں دل و جان جلتے ہیں تو یہاں دل و جان کو زندگی ملتی ہے. اُس کے نیچے اگر بدن سیاہ پڑتا ہے تو اِس کے زیر سایہ بدن منور ہوتا ہے. اس لئے قرآن نے اگر مادی سورج سے اپنے روحانی سورج کو مخصوص صفات میں تشبیہ دی تو ساتھ ہی وہاج اور منیر کے اوصاف ذکر

فرماکر اُن میں فرق بھی واضح کر دیا۔ آسمان کا سورج تو نار اللہ الموقدۃ سے تربیت یافتہ ہوکر ناری ہے اور یہ زمین کا سورج نور السمٰوات والارض سے تربیت یافتہ ہوکر نوری ہے۔ ایک جہنم سے وابستہ ہے اور ایک جنت وعرش سے تاکہ اس تشبیہ سے کسی کو ان دونوں آفتابوں میں یکسانی کا شبہ بھی نہ گزرے۔ چہ جائیکہ مادی سورج کی افضلیت کا اور سمجھنے والے سمجھ لیں کہ یہ فلکی سورج سورج نو ہے۔ مگر اس ملکی سورج کے مقابلہ میں چراغ مردہ کی بھی حیثیت نہیں رکھتا۔

چراغ مردہ کجا؟ نور آفتاب کجا؟

تاہم پھر بھی اگر حضرت ختمی مآب صلی اللہ علیہ وسلم کے مقام خاتمیت اور شئون نبوۃ کو کسی مثال سے کھولا جاسکتا ہے تو وہ مثال صرف سورج ہی کی تھی۔ اس لئے باوجود اس فرق کے اُسے ہی اس تمثیل کے لئے اختیار بھی کیا گیا۔

یہ تمثیل آفتاب اور چراغ سے مرکب کیوں ہے؟

تاہم یہاں یہ سوال پھر بھی باقی رہ جاتا ہے کہ اگر حضور کو سورج ہی سے تشبیہ دینی مقصود تھی تو شمس کا لفظ چھوڑ کر سراج ہی کا لفظ کیوں اختیار کیا گیا؟ بظاہر تشبیہ کی سیدھی عبارت یہ تھی کہ وشمسًا منیرًا (اور آپ چمکتے ہوئے سورج ہیں) نہ یہ کہ آپ کو سراجًا منیرًا یعنی روشن چراغ کہہ کر پھر روشن چراغ سے سورج مراد لیا جائے۔ پس اس میں کیا مصلحت ہے۔ کہ تشبیہ دینے میں عنوان تو چراغ کا اختیار کیا جائے اور مراد اس سے سورج لیا جائیگا۔ جواباً عرض ہے کہ مقصود تو حضور کو آفتاب ہی سے تشبیہ دینا ہے تاکہ تمام مقامات نبوت پر سورج کے حسی مقامات سے پوری روشنی پڑ جائے۔ لیکن عنوان چراغ کا اس لئے اختیار کیا گیا کہ چراغ میں ایک خاص وصف ہے۔ جو سورج اور چاند میں نہیں اور وہ یہ ہے کہ سورج سے دوسرا سورج نہیں بن سکتا۔ مگر ایک چراغ سے دوسرا چراغ روشن ہوسکتا ہے۔ پس سورج سے تو اس لئے تشبیہ دی کہ چمک دمک اور دوسری خصوصیات میں آپ کی یکتائی واضح ہو جائے۔ جیسے سورج کو تمام روشن اجسام میں اپنی

ذات وصفات کے لحاظ سے یکتائی اور بے نظیری حاصل ہے مگر اس سورج کو چراغ کے لفظ سے اس لئے تعبیر کیا گیا کہ آپ کے کمالات تربیت و تاثیر سے آپ کی نمونہ سازی کا کمال بھی کھل جائے کہ آپ نے اپنے رنگ اور اپنے ڈھنگ کے لاکھوں نمونے تیار کر دیئے۔ جیسے ایک چراغ سے لاکھوں چراغ روشن ہو جاتے ہیں، فرق ہے تو یہ کہ آپ کے مابعد کے تربیت یافتہ لوگ نبی تو نہیں بن سکتے کہ نبوت مکمل و مختتم ہو چکی تھی، مگر انوار نبوت کے امین اور حامل ضرور بن گئے۔ جن کو نبی تو نہیں کہا جا سکتا۔ لیکن انداز حیات درجہ بدرجہ کالنبی یعنی مانند نبی ضرور کہا جا سکتا ہے۔ چنانچہ خود حضور نبی نے ارشاد فرمایا۔

علماء امتی کانبیاء بنی اسرائیل ۔ میری امت کے علماء (ربانی) انبیاء بنی اسرائیل کی مثل ہیں۔

چنانچہ انبیاء پر اگر وحی آئی تو ان ربانیوں کو الہام ہوا۔ اگر انبیاء کو غیبی امور کا مشاہدہ ہوا تو ان مقدسین کو کشف ہوا۔ اگر انبیاء کے ہاتھ پر معجزات ظاہر ہوا تو ان بزرگوں کے ہاتھ پر کرامتوں کا ظہور ہوا۔ اگر انبیاء نے اپنے اپنے سپرد شدہ خطوں اور منطقوں کو علم و اخلاق سے رنگ دیا تو ان کاملین میں سے بھی جو جہاں بیٹھ گیا۔ اس خطہ کو اصلاح و رشد سے بھر دیا اور اتقیا کی جماعتیں کی جماعتیں تیار کر دیں اور اگر انبیاء نے غیبی خبریں دیں تو ان اولیاء نے کتنے ہی مخفی جہانوں کے پتے دیئے۔ غرض یہ اولیاء و اتقیاء اور ربانی افراد صحابہ سے لے کر تا ختم دنیا نبی تو نہیں ہوئے۔ مگر بہ تعمیل و تربیت نبوی مثل انبیاء ضرور کہلائے پس سورج روشن تو لاکھوں اشیاء کو تیار کر دیتا ہے۔ مگر اپنے جیسا نمونہ تیار نہیں کر سکتا۔ لیکن حضور جہاں آفتاب ہیں کہ ان گنت دلوں کو آپ سے روشنی ملی، وہیں چراغ بھی ہیں کہ اپنے بعد لاکھوں نمونے تیار فرما دیئے۔ جو نبوت تک اگر نہیں پہنچ سکے تو کمالات نبوت کے امین ضرور بن گئے اور نبوت کی روشنی ان کے ہر ہر قول و فعل سے چھنی اور نمایاں ہوئی۔

پس اس مرکب تشبیہ سے آپ کے تین وصف ثابت کرنے منظور تھے ایک

یہ کہ آپ اپنی ذات سے روشن تر ہیں۔ دوسرے یہ کہ آپ دوسروں کو روشن فرمارہے ہیں (یہ دو وصف تو دونوں میں مشترک سمجھے) اور تیسرے یہ کہ آپ اپنی ضیاء باری سے اپنے جیسے روشن نمونے بھی بنانے والے ہیں، یہی وہ وصف ہے۔ جو سورج میں نہیں، صرف چراغ میں پایا جاتا ہے۔ اس لئے اس وصفِ خاص کو تو چراغ کے لفظ سے واضح کیا گیا۔ جو سورج سے نہیں کھل سکتا اور بقیہ اوصافِ نبوت، کو سورج کے لفظ سے کھولا گیا۔ جو سراج کے لفظ سے نہیں کھل سکتے تھے۔ اس لئے سراج بولا گیا اور سورج مراد لیا گیا۔ یعنی لفظوں میں تو تشبیہ چراغ سے دی گئی اور معنوں میں تشبیہ سورج سے دی گئی تاکہ اس مرکب تشبیہ سے حضور کے تینوں اوصاف نبوت پر روشنی پڑ جائے۔

وجوہ شبہ اور مقامات نبوت وسیرت

آفتاب میں ہزاروں شانیں اور صفات ہیں۔ اگر ان کو ایک ایک کر کے جمع کیا جائے۔ جو ذہن میں خطور کر رہی ہیں تو یہ مضمون ایک ضخیم جلد ہو جائے اور پھیل کر قابو میں نہ رہے۔ اس لئے صرف بنیادی شباہتیں اختیار کر کے ان سے بنیادی ہی مقامات سیرت و نبوت پر روشنی ڈالی گئی ہے اور ان سینکڑوں شباہتوں میں سے صرف چند بنیادی شباہتیں بطور مثال کے اختیار کی گئی ہیں۔ مقصود ذکرِ رسول کی برکت حاصل کرنا اور مقاماتِ سیرت کو اس تمثیل کے سلسلہ سے قرآن سے نکلتا ہوا دکھلانا ہے۔ احاطۂ صفات مقصود نہیں اور نہ وہ بات اپنے بس کی ہے۔

روحانی آفتاب کی ضرورت

اس تشبیہ سے ابتدائی طور پر جو بات واضح ہوتی ہے۔ وہ یہ کہ اگر مادی کائنات کے لئے ایک جسمانی سورج کی ضرورت ہے اور بلاشبہ ہے تو معنوی اور روحانی کائنات کیلئے بھی ایک روحانی سورج ناگزیر ہے۔ جیسے حق تعالیٰ نے اس جسمانی کائنات کے

کے لئے ایک مادی آفتاب بنایا۔ جس سے زمین و زمان روشن ہیں۔ ایسے ہی اس نے ایک روحانی آفتاب ذاتِ بابرکات نبوی بھی بنایا۔ جس سے کون و مکان روشن ہیں۔ وہ اجسام کو منور کرتا ہے یہ ارواح کو۔ وہ صورتوں کو نمایاں کرتا ہے یہ حقائق کو۔ وہ طبیعتوں کو ابھارتا ہے یہ عقلوں اور فطرتوں کو۔ اس کی کارگزاری حیات میں ہے۔ اور اس کی معنویات میں جس سے حیات بھی بے بہرہ نہیں رہیں۔ غرض مادی عالم کی طرح روحانی عالم کے لئے بھی ایک آفتاب کا وجود ضروری ہے۔ کیونکہ سب جانتے ہیں کہ حیات اور جسمانیات جہاں بغیر حرارت کے زندہ نہیں رہ سکتے۔ ان کے حق میں حرارتِ عزیزی بمنزلہ روح ہے۔ اگر وہ نہ رہے تو یہ عالم ناسوت یا مادی عالم بھی نہ رہے۔ جمادات، نباتات اور جانداروں میں انسان سے لے کر ایک حقیر ترین کیڑے مکوڑے تک کی زندگی کا جزو اعظم حرارت ہے۔ مثلاً اگر بدن میں حرارت اور گرمی نہ ہو تو جسمانی اشیاء باقی نہیں رہ سکتیں۔ نہیں بلکہ اگر اس پوری دنیا اور اس کے اجزا میں سے حرارت کھینچ کر نکال لی جائے تو ساری کائنات برفانی ہو کر جم جائے، جماد محض رہ جائے اور اس میں نقل و حرکت کی سکت نہ رہے۔ جو زندگی کی ابتدائی علامت ہے۔ پس کائنات کے لئے حرارت بمنزلہ روح کے ہے اور سب جانتے ہیں کہ اس گرمی اور گرمیٔ روح کا سرچشمہ آفتاب کے سوا کوئی دوسری چیز نہیں کہ اس سے سب کو حرارت کا فیض پہنچتا ہے۔ حتیٰ کہ خود حرارت کے جس قدر وسائل دنیا میں آگ پھیلا رہے ہیں۔ وہ بھی سب کے سب آفتاب ہی سے فیض پاکر آتش بنے ہوئے ہیں۔ تاآنکہ خود آتش شعلہ بار بھی اپنی گرمی و تیزی میں اسی آتشی کرہ کی محتاج اور اس سے مستفید ہے۔ اگر سورج نہ ہو تو چقماق سے آگ برآمد نہ ہو۔ اگر آفتاب نہ ہو تو سارے پتھر اور لوہے ٹھنڈے پڑ جائیں اور ان کے ٹکراؤ سے کبھی آگ کی چنگاریاں نہ نکل سکیں۔ اگر سارے آتش گیر مادے ہمہ وقت سمندر میں بھیگے ہوئے چھوڑ دیئے جائیں جنہیں آفتاب کی گرمی نہ چھو سکے تو وہ گل گل کر جھڑ جائیں اور ان کی رگڑ سے کبھی آگ نہ ابھرے۔ خود سمندروں پر اگر سورج کی دھوپ نہ پڑے تو وہ برفانی پہاڑ بن جائیں۔ یوں کے سارے

جاندار مر جائیں، ان کے سارے سانس منقطع ہو جائیں اور عالم کو پانی کا بھی ایک قطرہ نہ مل سکے۔ اگر کھیتوں پر سورج اپنا نورانی سایہ اور آتشیں اثر نہ ڈالے تو ایک دانہ بھی نہیں پک سکتا اور دنیا دانہ دانہ سے محروم ہو کر فنا کے گھاٹ اُتر جائے۔ اگر سورج کی روشنی اور تاثیری گرمی سورج پر نہ پڑے تو اس میں بجلی باقی نہ رہے۔ جو آگ پانی کے حق میں روح بقا ہے۔ پھر خود یہ انسان جو اس کائنات کا چشم و چراغ ہے۔ اسی آفتابی حرارت ہی کی بدولت سطح زمین پر ٹکا ہوا ہے۔ اس میں سے حرارت عزیزی ختم ہو جاتی ہے، جب ہی وہ بھی ختم ہو جاتا ہے۔ حالانکہ مٹی پانی اور ہوا بھی اس میں بدستور موجود اور اس کی لاش میں بحالہٖ قائم ہیں، مگر اس کو زندہ انسان نہیں کہہ سکتے۔ پھر زندگی ہی نہیں، زندگی کے عوارض صحت، قوت، امنگ، حوصلہ، ہمت وغیرہ بھی اسی حرارت کے بل بوتے پر قائم ہیں، طلوع آفتاب کے وقت طبائع میں ابھار ہوتا ہے۔ جاں بلب مریض تک کی طبیعت میں جان محسوس ہونے لگتی ہے اور امنگ اور حیات تازہ دوڑتی ہوئی نظر آنے لگتی ہے۔ لیکن دن ڈھلے اور بالخصوص غروب آفتاب کے بعد طبیعتوں میں پستی تھکن اور ماندگی محسوس ہونے لگتی ہے کہ آفتاب سے جب پورا بعد ہو جاتا ہے اور نور آفتاب منقطع ہو جانے سے ظلمت شب دنیا پر چھا جاتی ہے، تو یہی تھکے ماندے جاندار نیند کی عارضی موت کا شکار ہو جاتے۔ پھر جوں ہی طلوع آفتاب کے آثار نمایاں ہوتے ہیں، تو نہی ان میں بعث بعد الموت کے آثار شروع ہو جاتے ہیں، یہ مردے خواب استراحت سے اُٹھنے لگتے ہیں اور دنیا کے میدانوں میں حشر و نشر کا بازار گرم ہو جاتا ہے، غرض جماد، نبات، حیوان، انسان، عناصر اور مواد کی مادی زندگی حرارت غریزی پر موقوف ہے اور حرارت کا منبع آفتاب ہے۔ اس لئے تمام مادیات کی جسمانی زندگی آفتاب کے وجود کے تابع نکلتی ہے۔ اس لئے فطرت اللہ کا تقاضا ہوا کہ اس ناسوتی عالم کو ایک آفتاب دیا جائے۔ جو اس کی مادی زندگی کا کفیل ہو۔

ٹھیک اسی طرح باشعور کائنات کی روحانی زندگی اور روح کے احوال و مقامات کی بود و نمود بھی حرارت ایمانی اور گرمی عشق خداوندی سے قائم ہے۔ جس کا نام ایمان

ہے۔ علم، اخلاق، معرفت، احوال، مقامات، قلبی واردات، ورود وصول وقبول کی گرم بازاری اسی ایمانی گرمی سے قائم ہے۔ جس حد تک ایمان اور گرمئ عشق ہے۔ اسی حد تک دینی حمیت، مذہبی غیرت، مجاہدہ وجہاد فی سبیل اللہ کا جوش وخروش ابھرتا ہے۔ اگر ایمان کی حرارت باقی نہ رہے تو یہ تمام روحانی کمالات ومقامات ختم ہو کر انسان صرف جماد و نبات یا حیوان یا محض ایک انسانی ہیکل ہو کر رہ جائے۔ جس میں جان کا سوال نہیں۔ اس حرارت ایمانی کے جوش سے معاملات دنیا میں امن وامان، سلم وسلامتی مہر ووفا، ایثار وہمدردی کے مظاہرے قائم ہیں۔ اگر یہ حرارت یہ اللہ اللہ کا جوش وخروش اور یہ اندرونی عشق ومحبت سے آتش شوق دلوں میں بھڑکی ہوئی نہ ہو تو نفس اور ہوائے نفس کی تخریبی کاروائیاں انفس اور آفاق کے سکون و اطمینان کو بھسم کر ڈالیں۔ بہر حال اسی محبت خداوندی کی آگ ہر ماسوا اللہ کو سوخت کر کے ماسویٰ سے انسانوں کو بے نیاز بناتی ہے۔ جس سے نفسانی جھگڑے اور شہوانی تنازع ختم ہوتے ہیں اور دنیا امن چین کا سانس لینے کے قابل ہوتی ہے اور سب جانتے ہیں کہ اس ایمانی حرارت اور گرمئ عشق خداوندی کے سرچشمے انبیاء علیہم السلام ہیں اور خود ان کی ایمانی گرمی کا واحد سرچشمہ ذات بابرکات نبوی ہے۔ کیونکہ آپ خاتم النبوت ہیں۔ جس کے فیض سے انبیاء و امم کو یہ روحانی حرارت عزیزی ملی ہے۔ پس اور انبیاء اگر نجوم نبوت ہیں تو آپ آفتاب نبوت ہیں۔ اس لئے اگلوں اور پچھلوں کی ایمانی اور احسانی آب وتاب اور روشنی وگرمی کا سرچشمہ آفتاب نبوت ہے۔ جس سے پورے عالم روحانیت کی گرمی اور گرم بازاری اور دوسرے لفظوں میں روحانی زندگی قائم ہے۔ اور بلکہ پورے عالم روحانیت کی گرمی اور گرم بازاری اور روحانی زندگی آفتاب نبوت ہی سے ممکن و وابستہ تھی تو فطرت اللہ کا تقاضا یہ ہوا کہ مادی کائنات کی طرح وہ روحانی کائنات کو بھی ایک آفتاب، روحانی بخشے۔ جو روحانی عالم کی زندگی کا کفیل ہو۔ پس اگر مادی کائنات کو اپنی بقا کے لئے ایک مادی آفتاب کی ضرورت تھی تو روحانی کائنات کو بھی اپنی بقا وحیات کے لئے ایک روحانی آفتاب تھی اور وہ ذات بابرکات محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہیں۔

داعیًا الی اللہ باذنہ وسِرَاجاً منیراً ۞ اور اللہ کی طرف اس کے حکم سے بلانے والے ہیں اور آپ ایک روشن چراغ ہیں۔

غرض اس تشبیہ سے اولاً ضرورت نبوت اور ضرورت ختم نبوت ثابت ہوئی جو آفتابِ نبوت ہی سے وابستہ تھی اور سراجًا منیرًا کا یہ پہلا مقام ہے۔ جس سے سیرت نبوت کا ابتدائی مقام (ضرورت سیرت نبوت) نمایاں ہوا۔ وداعیًا الی اللہ باذنہ وسراجًا منیراً ۞

فلکِ آفتاب

مگر جس طرح مادی آفتاب کے لئے ایک مدار اور ایک محور ضروری ہے۔ جس پر وہ حرکت کرے اور وہ فلک ہے۔ ایسے ہی روحانی آفتاب کے لئے بھی ایک محور (جائے گردش ناگزیر ہے۔ جس پر اس کی نقل وحرکت ہو۔ فرق ہوگا تو صرف یہ کہ مادی سورج کا فلک بھی مادی ہوگا۔ جو حسی نگاہوں کے سامنے آسکے گا اور روحانی آفتاب کا فلک روحانی ہوگا۔ جو دل کی نگاہ کے سامنے آئے گا اور سب جانتے ہیں کہ روحانیت کا سرچشمہ نبوت ہے۔ اس لئے اس روحانیت کے آفتاب کے فلک کو آسمانِ نبوت کہا جائے گا اور انبیاء علیہم السلام کو اس آسمان پر چمکنے والے ستارے جن میں جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم آفتابِ نبوت ہیں۔ اس لئے اس آفتاب روحانی کی نقل وحرکت اسی آسمانِ نبوت پر ہوگی۔ نبوت کے مقامات گویا اس آسمان کے بروج ہوں گے۔ جن میں آفتابِ نبوت کی نقل وحرکت ہوگی اور ان بروج کے خاص خاص آثار ہوں گے۔ جو کائنات پر پڑتے ہوں گے۔ بہرحال آفتاب نبوت آسمانِ نبوت پر سے اور اس کا طلوع وغروب اور عروج نزول اسی آسمان پر ہوتا ہے۔

شبِ تار اور سامان روشنی

سب جانتے ہیں کہ طلوع آفتاب سے پہلے کی حالت یہی ہوتی کہ ابتداءً شب

میں آسمان کے نیچے اندھیرا چھایا ہوا رہتا ہے۔ زمین تاریک ہوتی ہے۔ رات کا مہیب دیو اپنی بھیانک شکل کے ساتھ پوری دنیا پر مسلط ہوتا ہے۔ کام کاج تقریباً معطل پڑے رہتے ہیں اور ہر جاندار اپنے گھر اور اپنے ٹھکانے کا اسیر ہو کر رہ جاتا ہے۔ لوگ کچھ روشنیوں کا بندوبست بھی کرتے ہیں اور کسی حد تک ابتدا شب میں کام بھی چلاتے ہیں لیکن اول تو یہ محدود اور مصنوعی روشنیاں ہمہ گیر نہیں ہوتیں کہ ہر جگہ کام دیں یا ہر جگہ میسر آجائیں۔ شہروں میں اگر کچھ جگمگاہٹ ہوتی بھی ہے تو دیہات تاریک پڑے رہتے ہیں۔ اگر ان میں بھی کچھ ٹمٹماتے ہوئے دیئے جلتے نظر پڑ جاتے ہیں تو یہ ناممکن ہوتا ہوتا ہے کہ پورے جنگلات ان سے روشن ہو جائیں اور کھیت کیاری کا کام اس روشنی میں انجام پاتا رہے اور اگر محدود مقامات پر کچھ روشنی ہوتی بھی ہے تو وہ مکمل نہیں ہوتی کہ دل و دماغ کی تھکن اور ماندگی کی تاریکی کو دور کر دے اور اس میں امنگ اور حیات نو کی وہی روح دوڑا دے۔ جو دن کی روشنی سے دوڑتی ہے۔ بہر حال کوئی بھی مصنوعی روشنی نہ تو مکمل ہوتی ہے۔ نہ ہمہ گیر کہ رات کی تاریکی اور اسکے طبعی اثرات کا پورا پورا مقابلہ کر جائے۔ اس طرح یہ شب دیجور کی اندھیریاں فوج در فوج پہنچ کر کائنات کے ظاہر و باطن پر چھا جاتی ہیں اور حسی تاریکی اور غفلت و نیند کی تاریکی چھائی رہتی ہے۔ جس سے لوگ معطل ہو کر چارپائیوں پر دراز ہو جاتے ہیں اور دنیا زندوں کا قبرستان بن جاتی ہے۔

مگر جب ظلمانی پردے انتہائی غلیظ ہو جاتے ہیں اور مصنوعی روشنیاں ان کے زائل کرنے میں بے انشاہت ہوتی ہیں تو حق تعالٰے اپنی رحمت کاملہ اور قدرت بالغہ سے رات کے مناسب حال خود روشنی کا بندوبست فرماتے ہیں اور تدریجی طور پر آسمان کی فضا میں ستارے نمودار ہونے شروع ہو جاتے ہیں، ایک نکلا، پھر دوسرا، پھر تیسرا، یہاں تک پیاپے ستاروں پر ستارے ہجوم کر کر کے پورے آسمان کو گھیر لیتے ہیں۔ اور طلوع سیارات کے اس تسلسل سے پورا آسمان ستاروں سے جگمگا اٹھتا ہے۔ جس سے شب تارکی اندھیری کی وہ شدت باقی نہیں رہتی کہ ہاتھ کو ہاتھ سجھائی نہ دے، بلکہ ایک حد تک دنیا کی پوری فضا، شہروں کی ہو یا دیہات کی، جنگلوں کی ہو یا دریاؤں کی یکسانی کے ساتھ

ہلکی ہلکی روشنی میں آجاتی ہے۔

نجومِ ہدایت کا طلوع

ٹھیک اسی طرح آسمانِ نبوت کے نیچے روحانیت کی زمین اور دلوں کے گوشے جب کہ جہل وظلم کی تاریکیوں میں گھرے ہوئے تھے اور اس ظلوم وجہول انسان کو اس کی جبلت کی شہوانی تاریکیوں اور شبہات کی ظلمتوں نے گھیر رکھا تھا۔ نفس امارہ اور شیاطین کا اس کی خلقت پر پورا پورا تسلط تھا تو خود اسے بھی اپنی روشنی کی فکر تھی۔ اس نے ان ظلمتوں میں راہ طے کرنے کے لئے عقل کی قندیلوں سے کام کیا۔ فہم کی بجلی کے قمقمے اپنے انفسی جہان میں روشن کئے۔ فلسفیت کی مصنوعی لالٹینوں سے کچھ کام چلایا۔ مگر عقل و فہم اور فلسفہ کے ٹمٹماتے ہوئے چراغوں کی روشنی اول تو مکمل نہ تھی کہ دنیا کے ساتھ آخرت اور حیاتی زندگی کے ساتھ آخرت کی معنوی زندگی کی منزلیں بھی طے کرادیتی اور کسی حد تک یہ ممکن بھی ہوتا اور مخصوص نفوس سلیم اس راستے سے کچھ قطع منازل بھی کرتے تو اس روشنی میں روحوں کی حیات اور عشق الٰہی کی گرمی نہ تھی، کہ وہ دلوں میں امنگ اور روحوں میں تڑپ بھی پیدا کر دیتی، غرض عقلوں کی روشنی کا بندوبست فرمایا اور آسمان نبوت پر رنگ رنگ کے ستارے طلوع ہونے شروع ہوئے، سب سے پہلا ستارا آدم علیہ السلام کا طلوع ہوا۔ پھر شیثؑ آئے۔ پھر ادریس آئے، پھر نوح آئے، پھر ہود و صالح آئے، پھر ابراہیم و موسیٰ و عیسیٰ آئے۔ علیہم الصلوٰۃ والسلام، یہاں تک کہ آسمانی ستاروں کی طرح آسمانِ نبوت پر پے درپے نجوم نبوت کا ورود و ظہور شروع ہوا۔

ثم ارسلنا رسلنا تترىٰ (القرآن) پھر ہم نے پے درپے رسول بھیجے۔

ان نجوم نبوت کے انوار و برکات سے دلوں کی ظلمتیں چھٹنی شروع ہوئیں، اور دنیا نے انہیں دیکھ دیکھ کر اور ان کے مثالی نمونوں کو معیار بنا کر راہ حق کی منزلیں طے کرنی شروع کر دیں۔

آسمانِ نبوۃ پر نجومِ ہدایت کا اجتماع

یہ آسمان نبوت پر پیاپے طلوع ہونے والے ستارے چمکتے رہے۔ یعنی آدم و نوح ابراہیم و موسیٰ، سلیمان و داؤد علیہم السلام سب اپنے اپنے وقت پہ چمکتے اور اپنے اپنے دور میں جہان والوں کے لئے ہدایت و رہنمائی کا باعث ہوئے اور جونبی بھی رخصت ہوا وہ اپنے نورانی آثار چھوڑ کر گیا۔ جس پر آنے والے کی عمارت کھڑی ہوئی اور اس طرح بعثت نبویؐ سے پانچ برس پہلے ایک وقت آیا کہ سارے ہی یہ روحانی ستارے اپنے انوار کے پردے میں آسمان نبوت پر بیک وقت جمع ہو گئے اور ظلمات بعضہا فوق بعض کے مقابلہ میں نور علیٰ نور کا ظہور ہو گیا۔

آسمانِ نبوت پر طلوعِ آفتاب کے فطری تقاضے

اور آسمان و زمین کی صورت یہ ہوگئی کہ آخر شب میں آسمان پر لاکھوں چھوٹے اور بڑے ستارے روشن ہیں اور زمین پر کروڑں چراغ اور مصنوعی روشنیوں کے لاکھوں لیمپ اور ہنڈے اور پھر برق جہاں تاب کے ہزار ہا قمقمے جگمگائے ہوئے ہیں، لیکن پھر بھی شب تار اور اسکی تاریکی زائل نہیں ہوتی نہ رات ہی کافور ہوتی اور نہ دن ہی نکلتا ہے گویا ان ساری روشنیوں میں مل کر بھی یہ طاقت نہیں کہ رات کو دن بنا دیں اور طاقت کا بالکلیہ استیصال کر دیں، اس لئے ظلمت شب کے انتہا کو پہنچ جانے پر زمین تو زبان حال سے یہ فریاد کرتی ہے کہ نور کامل سے اُس کی مدد کی جائے، جو ان تاریکیوں کے بادلوں کو چھانٹ دے اور ستاروں کا یہ ناتمام نور زبان حال سے یہ آواز بلند کرتا ہے کہ اس کی تکمیل کر دی جائے تاکہ وہ ظلمتِ شب پر غالب آسکے اور روز روشن نمودار ہو جائے۔ جس سے تکمیل کر سکے۔

چنانچہ دنیا کی یہ پھیلی ہوئی ظلمت اور ان ستاروں کی یہ مجموعی روشنی کی خاموش فریاد بلند ہوئی کہ ہمیں ایک ایسا کامل نور عطا کیا جائے جو رات کو دن بنا دے اور ناتمام انوار

کی تکمیل کر دے۔

آثارِ طلوع

توعطائے خداوندی متوجہ ہوئی اور آدم علیہ السلام کے تقریباً سات ہزار برس کے بعد جبکہ آسمان نبوت اپنے سارے تاروں سے جگمگا رہا تھا۔

آسمانِ نبوت کی صبح صادق

آسمانِ نبوت پر روحانیت کے آفتاب جہاں تاب کی آمد آمد کے آثار نمایاں ہوئے اچانک پو پھٹی اور روحانیت کی صبح صادق نمودار ہوئی۔ جس نے بشارت دی کہ عنقریب وہ منبع نور اور سرچشمۂ ضیا یعنی آفتاب نبوت سامنے آیا چاہتا ہے۔ جس کے سب منتظر تھے، اور جس کو نور اور ظلمت ایک زبان ہو کر مانگ رہے تھے۔ وہ آرہا ہے۔ جس کے آجانے کے بعد پھر کسی نور کی ضرورت نہ پڑے گی۔ کیونکہ آفتاب کے بعد کوئی دوسرا آفتاب طلوع نہیں کرتا۔ یہ آفتاب نبوت کی خوشخبری کیا تھی۔ جس نے طلوع آفتاب کی خوشخبری دی؟

یہ حضرت مسیح علیہ السلام کی ذات بابرکات تھی۔ جنہوں نے اپنے آنے کا حقیقی مقصد ہی آفتاب نبوت کے طلوع کی بشارت بتلایا اور اعلان کیا کہ

واذ قال عیسیٰ بن مریم یٰبنی اسرائیل انی رسول الله الیکم مصدقاً لما بین یدی من التورٰۃ ومبشراً برسول یاتی من بعدی اسمه احمد	اور جب کہا عیسیٰ ابن مریم نے اے بنی اسرائیل میں اللہ کا رسول ہوں۔ تمہاری طرف تصدیق کنندہ ہوں سامنے کی تورات کا اور بشارت دہندہ ہوں، اس رسول کا جو میرے بعد آئیں گے۔ نام ان کا احمد ہے۔

پس جیسے آفتاب کے طلوع کی بشارت صبح صادق دیتی ہے، ایسے ہی مسیح علیہ السلام کا سب سے بڑا مشن حضرت خاتم النبین صلی اللہ علیہ وسلم کی دنیا میں تشریف آوری کی بشارت دینا تھا۔ اس سلئے وہ دائرہ نبوت میں صبح صادق کی مانند ہیں۔

ہاں مگر جیسا کہ بارہ گھنٹہ کے دن کے لئے ڈیڑھ گھنٹہ کی صبح صادق ہوتی ہے کہ جتنا بڑا دن ہو اتنی ہی بڑی صبح صادق ہوتی ہے۔ سو دائرہ ختم نبوت کے اس عظیم الشان دن کے سلئے جس کا طول بعثت نبوی سے قیامت کی صبح تک ہے۔ صبح صادق بھی اتنی ہی لمبی ہونی چاہیئے تھی۔ جتنا بڑا یہ دن تھا تو یہ صبح صادق حضرت مسیح علیہ السلام کی آمد ہے۔ جن کا دورِ نبوت اور بالفاظ دیگر بشارت کا زمانہ جن کے اختتام پر آفتاب نبوت طلوع ہوا۔ تقریباً پونے چھ سو برس کی مدت کا تھا۔

یہ صبح صادق بھی آفتاب ہی کا اثر تھی

یہاں سے یہ نکتہ بھی باآسانی سمجھ میں آجائے گا کہ صبح صادق کا نور کوئی مستقل نور نہیں ہوتا، بلکہ وہی آفتاب کا چاندنا ہوتا ہے۔ جو اس نور کی ایک ابتدائی جھلک ہوتی ہے جس میں آثار وہی ہوتے ہیں، جو نور آفتاب میں ہوتے ہیں، چنانچہ اس کے نمودار ہوتے ہی ستارے سب ماند پڑ جاتے ہیں اور طلوع صبح صادق کے کچھ دیر بعد کوئی ستارہ نظر نہیں آتا۔ ایسے ہی حضرت مسیح صادق علیہ السلام بھی نور محمدی ہی کی ایک جھلک تھے، اور آپ سے بہت سی صفات کمال میں کامل مشابہت رکھتے تھے۔ چنانچہ حضور کو اگر رحمت عالمین اور رحمت مُہداۃ فرمایا گیا کہ

وما ارسلناك الا رحمةً للعالمين ۞	ہم نے آپ کو تمام عالموں کے لئے صرف رحمت بنا کر بھیجا ہے۔

تو مسیح علیہ السلام کو بھی رحمت کہا گیا۔

ولنجعله اٰیة للناس ورحمة منا و کانَ امراً مقضیا ۞	اور اس طور پر اس لئے پیدا کریں گے تاکہ ہم اس فرزند کو لوگوں کے لئے ایک نشانی

بنادیں اور باعث رحمت بنایں اور یہ ایک

طے شدہ بات ہے۔

اگر حضور کو عبد کامل فرمایا گیا۔ یعنی خاص صفت سے مقید کر کے ذکر نہیں کیا گیا جیسے عبد شکور یا عبد صبور وغیرہ بلکہ عبد مطلق کہا گیا۔ جس کے معنی کمال عبدیت کے ہیں، نیز حق تعالےٰ نے خود ہی آپ کی عبدیت کا اعلان کیا جو خود ہی آپ کی کمال عبدیت کی دلیل ہے۔ چنانچہ ارشاد ہوا۔

سبحان الذی اسریٰ بعبدہٖ	وہ پاک ذات ہے۔ جو اپنے بندے کو
لیلاً من المسجد الحرام الی	شب کے وقت مسجد حرام سے مسجد
المسجد الاقصیٰ ؛	اقصیٰ تک لے گیا۔

تو حضرت مسیح علیہ السلام کو بھی اسی طرح عبد مطلق کے خطاب سے نوازا گیا۔ مگر لفظ عبد خود ان کی بھی زبان سے کہلوایا گیا کہ قوم انہیں معبود رکھنے والی تھی۔ فرمایا۔

انی عبد اللہ اٰتانی الکتاب	میں اللہ کا بندہ ہوں۔ اس نے مجھ کو کتاب
نبیاً الخ ؛	دی اور اس نے مجھ کو نبی بنایا۔

اگر حضور کو خاتمیت سے سرفراز کیا گیا کہ آپ خاتم الانبیاء والمرسلین ہیں۔ ولکن رسول اللہ وخاتم النبیین ؛۔ تو حضرت مسیح علیہ السلام کو بھی ایک نوع کی خاتمیت دی گئی کہ وہ خاتم انبیاء بنی اسرائیل ہیں۔ پس حضور خاتم مطلق ہیں اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام خاتم اسرائیلیت ہیں، قدر مشترک دونوں میں وصف خاتمیت ہے۔

اگر حضور کی امت کو بوجہ آپ کے رحمۃ للعالمین ہونے کے امت رحمت بنایا گیا اور امت مرحومہ کہا گیا کہ رحماء بینھم ؛ (آپس میں ایک دوسرے پر رحم کرنے والے اور بعض حدیث ھینون لینون (نرم مزاج والے، نرم اخلاق والے)

تو امت مسیح کو بھی یہی وصف عطا ہوا۔

وجعلنا فی قلوب الذین اتبعوہ	اور جن لوگوں نے ان کا اتباع کیا تھا۔ ہم
رأفۃ ورحمۃ	نے ان کے دلوں میں شفقت اور ترحم

پیدا کیا۔

اگر آپ کی امت کو عالمی حکومت سے نوازا گیا کہ ابتداءً بھی مسلمان پورے عالم پر چھا گئے اور مشرق سے مغرب تک ان کی سطوت و صولت کا ڈنکا بجا اور انتہاءً بھی پورے عالم پر ان کے چھا جانے کی خبریں دی گئی ہیں کہ

ھوالذی ارسل رسولہٗ	وہ اللہ ایسا ہے، جس نے اپنے رسول کو
بالھدیٰ ودین الحق لیظھرہ	ہدایت اور سچا دین دے کر بھیجا ہے
علی الدین کلہٖ	تاکہ اس کو تمام دینوں پر غالب کر دے۔

اور حدیثِ نبوی میں ہے کہ

ان اللہ زوی لی الارض	حق تعالےٰ نے میرے لئے زمین کے
مشارقھا ومغاربھا وسیبلغ	مشرق اور مغرب کو اکٹھا کر دیا ہے اور میری
ملک اُمتی ما زوی	امت کی حکومت وہیں تک پہنچے گی،
لی منھا ۔	جہاں تک زمین کو میرے اکٹھا کیا گیا ہے۔

تو حضرت مسیح کی امت کے ملک کو بھی امت مسلمہ کے دوش بدوش دوامی اور عالمی رکھا گیا اور انہیں فرمایا گیا۔

والروم ذوات القرون اذا ھلک	اور (حکومت) صدیوں رہنے والی ہے،
قرن خلفہ قرن الحرب بیننا	صدیوں پر صدیاں گزریں گی اور ہماری ان
وبینھم سجال ینالون منا	کی جنگ قائم رہے گی، کبھی وہ ہم پر غالب
وننال منہ ۔	رہیں اور کبھی ہم ان پر۔

یعنی یہ امت غلبہ و مغلوبیت کے ساتھ امت مسلمہ کے دوش بدوش چلتی رہے گی اور ۔ ۔ ۔ ۔ انتہائی عروج و اقتدار اور پورے عالم میں غلبہ کی خبر ظہور مہدی کے قریب زمانہ کے لئے دی گئی ہے۔ جیسا کہ آج یہ غلبہ مشاہدہ میں آ رہا ہے اور مسلمانوں پر ایک ہزار برس گزرنے کے بعد ہی سے نصاریٰ کے غلبہ و اقتدار کی تمہید پڑ چکی تھی جو آج پورے عروج پر ہے۔

اگر آپ کو جسد عنصری کے ساتھ معراج کرائی گئی تو حضرت مسیح علیہ السلام کو بھی جسد عنصری کے ساتھ آسمانوں پر اٹھایا گیا۔ فرق اتنا ہے کہ انہیں چرخ چہارم تک لیجایا گیا۔ جو اُن کا مقام تھا اور وہیں تھام دیا گیا اور حضورؐ کو ساتوں آسمانوں سے گزار کر سدرۃ المنتہیٰ (مقام جبرائیلؑ) اور سدرۃ سے گزار کر جنتوں تک اور جنتوں سے گزار کر مستوے (دفتر قضا و قدر) تک اور وہاں سے اٹھا کر عرش تک پہنچایا گیا اور قرب کا انتہائی درجہ عطا ہوا۔

اگر حضورؐ کو آپ کے وطن سے ہجرت کرائی گئی تاکہ آپ قوت و شوکت کے ساتھ اپنے وطن کی طرف لوٹیں اور پھر نہ صرف وطن تک محدود رہیں۔ بلکہ پورے عالم کے خزانوں کی کنجیاں آپؐ کو اور آپ کی امت کو سپرد کی جائیں اور پورے عالم میں آپ کا دین پھیل جانے کی داغ بیل پڑ جائے تو حضرت مسیح کو بھی وطن دنیا سے وطن آسمان کی طرف ہجرت کرائی گئی تاکہ دورِ آخر میں قوت و شوکت کے ساتھ اپنے ملک شام کی طرف لوٹیں اور مسجد اقصیٰ میں اُتریں۔ جو ان کا مولد اور منشاء تھا اور اب نہ صرف اس خطہ ہی تک محدود رہ جائیں، بلکہ پورے عالم میں ان کا دورِ حکمرانی قائم ہو جائے اور وہ بحیثیت مجدد اسلام، اسلام کو سارے عالم پر غالب و حکمران بنادیں۔ فرق اتنا ہے کہ مسیح علیہ السلام وہاں ہزاروں برس گزار کر وہ قوت لے کر آئیں گے اور عالم پر غلبہ پا سکیں اور حضورؐ شب معراج میں چند لمحوں ہی میں یہ ساری عروجی قوتیں لے کر واپس ہوئے اور اپنے وطن مکہ کو شوکت کے ساتھ لوٹے اور فتح مکہ سے فتوحات اور عالمگیر عروج واقتدار کے دروازے کھول دیئے گئے۔

اگر حضورؐ کے اہل وطن (اہل حجاز) کے لئے جزیہ نہیں رکھا گیا۔ (کہ وہ یہ خاص قسم کا ٹیکس ادا کر کے اپنے مذہب پر باقی رہتے ہوئے اسلام کی شوکت کے نیچے زندگی گذاریں) بلکہ ان کے حق میں یا اسلام تھا یا قتل۔ کیونکہ وہ نبی اور نبی کے دین کو پوری طرح جاننے کے باوجود نبی کو ان کے وطن سے نکالنے والے تھے اور قومی تعصب و عناد کی وجہ سے نہیں چاہتے تھے کہ نبی اپنے دین کے ساتھ اپنے وطن میں بلند

وطن سے باہر دنیا کے کسی خطہ میں بھی باقی رہ سکیں۔ اس لئے ان کی جزا اس کے سوا دوسری ہو بھی نہیں سکتی تھی کہ انہیں بھی ان کے کفر کے ساتھ کسی گوشہ میں پناہ نہ ملے اور وہ اپنے باطل مذہب کے ساتھ دنیائے اسلام میں باقی نہ رہیں۔ رہیں تو مسلم بن کے ورنہ قتل کے گھاٹ اتر جائیں، تو حضرت مسیح علیہ السلام کے دورِ آخر (بعد نزول) میں بھی قوموں اور بالخصوص یہود کے لئے جزیہ باقی نہ رہے گا، یا قبول اسلام ہو گا یا قتل کیونکہ یہود نے باوجود اہلِ خاندان (بنی اسرائیل) ہونے اور باوجود سب سے زیادہ مسیح پاک کی صداقت کے نشانات دیکھ لینے کے ازراہ تعصب وعناد ایک منٹ کے لئے گوارا نہیں کیا کہ حضرت مسیح اپنے دین کے ساتھ دنیا میں باقی رہ سکیں، انہیں پھانسی دینے کے سامان کئے گئے اور اپنی دانست میں دیدی بھی گئی گو وہ بامر الٰہی ان کے شبیہ کو لگ گئی تو حق تعالےٰ نے عزت کے ساتھ انہیں آسمانوں کی طرف ہجرت کرائی ادھر نزول مسیح کے بعد ہی جب کہ اس وقت کی دنیا دو ہی متقابل گروپوں میں منقسم ہو گی یا نزول حامیان مسیح ہوں گے۔ یعنی مسلمان اور اسلام لائے ہوئے نصاریٰ یا رفقائے دجال ہوں گے۔ جن میں اکثر و بیشتر یہودی ہوں گے تو یہ دجالی یہود اور خود دجال ایک منٹ کے لئے برداشت نہ کریں گے کہ حضرت مسیح علیہ السلام کے ساتھ دنیا کے کسی گوشہ میں بھی قائم رہ سکیں۔ اس لئے ان کی جزا یہی ہو گی اور یہی ہونی بھی چاہیئے تھی کہ انہیں بھی دنیا کے کسی گوشہ میں دجل و فساد کے ساتھ پناہ نہ دی جائے کہ وہ اس شدید کفر و عناد کی گندگی کے ساتھ دنیا کو آلودہ کریں بلکہ یا اسلام لائیں یا قتل ہو جائیں۔

بہر حال حضرت مسیح علیہ السلام کو حضرت خاتم المرسلین علیہ السلام سے کمال درجہ کی مناسبت اور مشابہت حاصل ہے جس کا منشا اولاً قرب عہد ہے کہ وہ حضورؐ سے بلحاظ زمانہ کے سارے انبیاء سے قریب تر ہیں۔ ان کے اور حضور کے درمیان کوئی اور نبی نہیں اور ظاہر ہے کہ قرب زمانی سے مناسبت اور گونہ مشابہت کا پیدا ہو جانا امر طبعی ہے۔

ثانیاً خلقی طور پر قرب صوری بھی ہے جس سے ان مذکورہ مشابہتوں کا دروازہ

کھلا کیونکہ آپ شبیہ محمدی کی اولاد ہیں۔ چنانچہ بتصریح قرآن جبرائیل علیہ السلام نے کامل الخلقۃ اور بالفاظ قرآن بشر سوی کی صورت میں نمایاں ہو کر مریم پاک کے گریبان میں پھونک ماری جس سے وہ حاملہ ہوئیں تو اس وقت حضرت جبرائیل صورت محمدی میں تھے (جیسا کہ روح المعانی میں اس کے بارے میں بعض آثار و روایات منقول ہیں) اور ہر صورت اپنے مناسب ہی حقیقت کا تقاضا کرتی ہے۔ اس لئے یہ صورت محمدی کمالات محمدی کی نوعیت کی متقاضی تھی۔ اگرچہ وہ اس وقت جبرائیل کا چولہ ہی ہوئی تھی اور انہوں نے گویا اس صورت میں حقیقت محمدی کی نوعیت کو لے کر مریم پاک کے گریبان میں پھونک ماری جس سے مسیح علیہ السلام کا ماں کے پیٹ میں وجود ہوا جس کے یہ معنی ہوئے کہ گویا مسیح علیہ السلام کی حقیقت میں بواسطہ شبیہ محمدی خود حقیقت محمدیہ کی نوعیت شامل تھی۔ اس لئے مسیح علیہ السلام کے کمالات و مقامات اور شئون و احوال میں بھی وہی نوعیت گھر کر گئی جو کمالات محمدی کی تھی جس سے ان کے کمالات، کمالات محمدی کے مشابہ ہو گئے اور وہ ظاہری مشابہتیں اور مناسبتیں نمایاں ہوئیں۔ جن کے کچھ نمونے ابھی پیش کئے گئے۔ انہی چند در چند مناسبتوں اور مشابہتوں کی وجہ سے انہیں ابتدار میں آفتاب نبوت کی خوشخبری دینے یا بالفاظ دیگر اس آفتاب کی صبح صادق بننے کے لئے چنا گیا کہ صبح صادق کی روشنی بعینہ آفتاب ہی کی روشنی ہوتی ہے۔ جو اس کے طلوع سے تھوڑا عرصہ قبل بطور مقدمۃ الجیش کے نمودار ہوتی ہے اور طلوع کی خبر دیتی ہے۔ گویا صبح صادق آفتاب کی اولاد ہوتی ہے اور اس کا وجود آفتاب ہی سے ہوتا ہے۔ گو ظہور اس سے پہلے نظر آتا ہے۔ جو روحانیات میں ممکن ہے۔ یعنی جسمانی ولادت میں، گو باپ کے بعد بیٹے کا ظہور ہوتا ہے۔ لیکن روحانیات میں یہ قبل و بعد کا جھگڑا نہیں ہے۔ چنانچہ حضرت خاتم الانبیاء کے فیض سے سارے انبیاء مستفید ہیں تو بمنزلہ روحانی فروع کے ہیں۔ درانحالیکہ یہ فروع مقدم ہیں اور اصل کا ظہور ان سب کے بعد میں ہے۔ لیکن پھر بھی ان کی فروعیت میں کوئی فرق نہیں پڑتا۔ پس مسیح علیہ السلام ہی حضور کی روحانی ذریت میں قریب ترین اور اشبہ ترین ذریت ہیں جو باپ

کی تبشیر (بشارت دینے) کے لئے باپ سے قبل نمودار ہوئے اور ان کا وجود حضورؐ کے وجود کا ثمرہ ہے اور پھر جیسے ابتدا میں حضرت مسیح علیہ السلام کو بطور صبح صادق یا مبشر کے لایا گیا جو دن کی ابتدائی ساعتیں ہیں۔ ایسے ہی آفتاب نبوت کے غروب کے بعد جو صدیوں کی لمبی رات آئی جس میں خلفاء مجددین اور مجتہدین نے ستاروں کی طرح دین کی روشنی باقی رکھی، اس کے آخر میں دین کی آخری تجدید اور اشاعت دین کی انتہائی تکمیل کے لئے بھی حضرت مسیح علیہ السلام ہی کو رکھا گیا کیونکہ مہینہ کے ختم پر آخر کی راتوں میں چاند سب سے اخیر ہی میں طلوع ہوا کرتا ہے اور یہ روشنی بھی بالواسطہ سورج ہی کی روشنی ہوتی ہے۔ غرض ابتدا اور انتہا دونوں کے لئے حضرت مسیح کو رکھا گیا اور دونوں صورتوں میں ان کی نورانیت اور نور بخشی آفتاب نبوت ہی کے آثار ثابت ہوتے ہیں۔ پس خاتم النبیین نے اپنی امت میں اگر ہزاروں نبیوں سے کام نہیں لیا تو ایک ہی ایسے نبی سے کام لے لیا جو خاتم اسرائیلیت ہونے کی وجہ سے ساری اسرائیلی قوتوں کا جامع اور اپنی روحانیت کی خصوصیات میں سب سے بالاتر ہونے کی وجہ سے اُن کا لقب ہی روح اللہ اور کلمۃ اللہ تھا۔ گویا دین محمدی کی تجدید دائرہ ولایت اور دائرہ نبوت دونوں سے کرائی گئی تاکہ واضح ہو جائے کہ ولایت ہو یا نبوت سب میں نورانیت صرف آفتاب ہی سے آئی ہوئی ہے۔ اس لئے وہ اپنی خدمت دونوں دائروں سے لینے کا حقدار ہے۔

بہرحال مسیح علیہ السلام اپنے اول و آخر کے لحاظ سے جب کہ آفتاب نبوت کے آثار سے متاثر اور آپ کی صورت و سیرت سے قریب تر اور اشبہ تر تھے گویا نور مسیحی درحقیقت نور محمدی ہی تھا۔ تو ان کامل مناسبتوں کے سبب انہی کو آفتاب نبوت کے حق میں صبح صادق مبشر اور منیر بنایا جا سکتا تھا کہ صبح صادق درحقیقت آفتاب ہی کے نور کی ایک جھلکی ہوئی ہے۔ آفتاب سے الگ کہیں اس کی روشنی نہیں آئی اور انہی کو اسلام کے دورِ آخر میں اس کے تحفظ کے لئے بھی چنا گیا۔ جس طرح انہی کو اس یوم نبوت کی صبح صادق بنایا گیا تھا کہ آفتاب کے حق میں وہی سب سے بڑی بشارت دہندہ ہوتی

ہے اور انہی کو اس آفتاب کے حق میں شفق بنایا گیا کہ غروب آفتاب کے بعد وہی آفتاب کا کام کر جانے کی سب سے بڑی دلیل ہوتی ہے۔ اس لئے جہاں حضرت مسیح کے بارے میں بشارت دہندۂ نبوی ہونے کی شہادت دی گئی جو صبح صادق کا کام ہے اور فرمایا گیا۔

ومبشراً برسول یاتی من بعدی اسمہ احمد۔	اور میرے بعد جو ایک رسول آنے والے ہیں جن کا نام احمد ہوگا۔ میں ان کی بشارت دینے والا ہوں۔

تو انہیں سے آخری تجدید کا کام لیا گیا کہ غروب کے بعد شفق ہی نور آفتاب کے آثار باقیہ میں سے ہوتی ہے۔ جو اس کی روشنی پر دلیل ہوتی ہے۔ چنانچہ حدیث نبوی میں انہی کو اسلام کی تجدید کی آخری روشنی کہا گیا۔ ارشاد نبوی ہے۔

کیف تھلک امۃ انا اولھا والمھدی وسطھا والمسیح اٰخرھا۔ (مشکوٰۃ المصابیح)	وہ امت کیسے ہلاک ہو سکتی ہے جس کے اول میں میں ہوں بیچ میں حضرت مہدی اور آخر میں حضرت عیسیٰ ہیں۔

صبح صادق کے وقت کا عالمگیر اندھیرا

بہر حال پو پھٹی اور صبح صادق نمودار ہوئی، حضرت مسیح نے صبح صادق بن کر آفتاب نبوت کے طلوع کی خبر دی اور طلوع آفتاب سے قبل دھیمی دھیمی روشنی نمایاں ہوگئی جو در حقیقت آفتاب ہی کی روشنی تھی، اسی لئے شب تار ختم ہوگئی، لیکن سب جانتے ہیں کہ طلوع صبح صادق کے وقت جہاں چاند کے چمکتے رہنے کا سماں سامنے آتا ہے وہیں یہ منظر بھی نگاہوں کے سامنے ہوتا ہے کہ عامۃ دنیا کے انسان اس وقت نیند میں مست ہوتے ہیں، نیند کے نچوڑ کا انتہائی وقت ہوتا ہے اور ہر کس و ناکس نوم میں غرق اور گہری نیند کا متوالا بنا رہتا ہے گویا اس وقت خصوصیت سے نیند کا دماغوں پر پورا غلبہ و تسلط ہوتا ہے، حتیٰ کہ بہت سے طلوع آفتاب کے بعد بھی نہیں جاگتے بلکہ سورج

جب کافی بلند ہو جاتا ہے اور اس کی دھوپ کی تیزی ان پر پڑھنے لگتی ہے۔ تب اُن کی آنکھ کھلتی ہے۔ پس اِدھر تو صبح صادق ہوتے ہی ستارے جھلملانے لگتے اور اُن کی روشنیاں غائب سی محسوس ہونے لگتی ہیں۔ کیونکہ صبح کا چاندنا تیز ہونا شروع ہو جاتا ہے اور ادھر سونے والے عموماً اپنی نیند میں مست اور محو ہوتے ہیں۔ اس لئے باہر تو چاندنا ہوتا رہتا ہے اور اندر اندھیرا غلیظ ہوتا رہتا ہے۔ جب تک کہ آفتاب طلوع نہ ہو جائے یعنی اس صبح سے فائدہ وہی حاصل کرتا رہتا ہے۔ جو بیدار ہوتا ہے اور وہ سوائے مخصوص افراد کے جو صبح صادق کے وقت فوراً ہی جاگ اٹھنے کا جذبہ لے کر سوئے ہوں، عام انسان نہیں ہوتے۔ اس لئے یہ درمیانی حصہ جو نہ رات ہے نہ دن جس نورانیت کی طرف بڑھتا رہتا ہے اور عام انسانوں کے اندرونی احوال کی .... ظلمت و تاریکی کی طرف چلتا رہتا ہے۔ پس اس زمانہ صبح صادق میں جسے زمانہ فترت کہنا چاہیئے ادھر تو صبح صادق کے آثار نمایاں ہوئے اور روشنی بڑھنی شروع ہوئی چنانچہ مخصوص لوگوں کے دلوں کا رخ توحید اور انوارِ دیانت کی طرف ہو چلا۔ لیکن عامہ خلائق کا یہی زمانہ زیادہ غفلت اور مستی خواب کا ثابت ہوا اور اس وقت کی دنیا پر ضلالت و گمراہی کے جو بادل ہر طرف چھائے ہوئے تھے۔ وہ اور غلیظ ہو گئے۔ چنانچہ مکہ جو ناف عالم تھا۔ اس کے اندر اور باہر چہار طرف پوری دنیا کے دلوں پر انواع و اقسام کی تاریکیوں کی نیند مسلط تھی اور سب خوابِ قساوت و غفلت میں مست تھے۔

جزیرۂ عرب کے ایک سمت خلیج فارس تھا جس کے کنارے ایران و فارس کی مملکتیں تھیں۔ جہاں ایرانیوں کی جہانبانی قائم تھی۔ اکاسرہ فارس سر یرآرا تھے۔ وہاں شرک و کفر کی تاویل و توجیہ سے نہیں، بلکہ کھلے بندوں دو خداؤں کی خدائی کا ڈنکا بجایا جا رہا تھا۔ ان کے نزدیک جہانوں کے نظام کے لئے ایک خدا کافی نہ تھا۔ بلکہ برابر کے دو خدا اہرمن اور یزداں خدائی کر رہے تھے۔

عرب کی دوسری سمت بحرۂ روم تھا۔ جس کے کنارے مغربی دولتوں کے پرچم لہرا رہے تھے۔ قیصر کی بادشاہی کا سکہ رواں تھا۔ یہاں عیسائیت نے مذہب کے

نام سے تین خداؤں کی پوجا کا اعلان کیا ہوا تھا۔ یہ فارس کی نسبت بندگی کے معاملہ میں ترقی یافتہ تھے، جنہوں نے دو خداؤں پر قناعت کافی نہ سمجھتے ہوئے ان میں ایک کا اضافہ اور ضروری سمجھا۔ ایک خدا ایک اکلوتا بیٹا اور ایک اس کی بیوی یا بعض کے نزدیک روح القدس، یہاں خدائی کے تصرفات ان تین کے سپرد تھے۔

تیسری سمت بحرِ ہند تھا۔ جس کے کنارے ہندوستان کا برِعظیم اور دوسرے مشرقی ممالک واقع ہیں، یہ سرزمین پوجا کے سلسلہ میں ان دونوں سمتوں سے بھی زیادہ ترقی یافتہ تھی، جسے تین خداؤں پر بھی قناعت نہ تھی، بلکہ ان کی تعداد کروڑوں تک پہنچادی گئی تھی یہ ملک بت پرستی کا مخزن بنا ہوا تھا اور بت کے مفہوم میں صرف مورتی ہی شامل نہ تھی بلکہ پہاڑوں کے پتھر، دریاؤں کا پانی، درختوں کی شاخیں، جانوروں کے سر، انسانی اعضاء اور صنعت وحرفت کے آلات حتیٰ کہ کھانے پینے کی چیزیں سب کے سب معبود اور لائق پرستش تھے اور معبودوں کی تعداد عابدوں سے بدرجہا زائد تھی اور اس دور کی اس عام گمراہی کو خود ہندو زعما بھی تسلیم کرتے ہیں، چنانچہ پنڈت دیانند سرسوتی نے تحریر فرمایا ہے کہ ویدوں کا علم پانچ ہزار برس سے گم ہو چکا تھا جسے انہوں نے زندہ کیا اور ظاہر ہے کہ حضور کی بعثت سے قبل چند صدی کا دور جو زمانہ جاہلیت کہلاتا ہے۔ اس پانچ ہزار سال کے اندر ہی اندر ہے۔ اس لئے آپ کی بعثت سے قبل خود ہندوستانی زعما کے خیال میں بھی ہندوستان کی یہ عام گمراہی کا دور تھا۔

عرب کی چوتھی جانب سمندر کی موجوں سے ہٹی ہوئی اور خشکی سے ملی ہوئی تھی جس میں مصر وسوڈان اور افریقہ کی آبادیاں تھیں، انہوں نے اس بارہ میں پچھلی تین سمتوں سے بھی زیادہ پیش قدمی کی تھی۔ وہاں نہ ثنویۃ تھی نہ وثنیت، نہ تثلیث تھی نہ تکثیر، وہاں نہ چند خداؤں کا جھگڑا تھا نہ نفس خدائی کا۔ بلکہ سرے سے ہی اس راہ سے الگ ہو کر ان کے یہاں فسق وفجور، بدعملی وسیہ کاری اور شہواتِ نفس کی مسموم آندھیاں چل رہی تھیں۔ گویا ہر شخص خدا بنا ہوا تھا۔ ہر شخص اپنی شہوات وخواہشات میں آزاد تھا۔ جس کو قرآن حکیم نے فرمایا۔ سأريكم دار الفاسقين ۝

بہر حال عرب کے چہار طرف بحر و بر میں ظلمتوں کی یہ بہتات شب تاریک بیم موج اور دریائے ناپید اکنار کا منظر پیش کر رہی تھی، یہ تو ذات خداوندی کی حد تک تھا، رہیں صفاتِ خداوندی سو یہی کیفیت اس وقت کی دنیا نے ان کے ساتھ بھی کر رکھی تھی، بعض نے خالق کی صفات خاصہ مخلوق میں مان کر مخلوق کو خالق کے درجہ میں پہنچا دیا تھا، جیسے نصاریٰ نے حضرت مسیح کو خدا اور خدا کا بیٹا پکار کر کہا تھا اور انہیں الٰہ متجسد کہہ رکھا تھا اور بعض نے مخلوق کی صفات نقص و عیب خالق میں مان رکھی تھیں، جیسے اس کا بیمار ہونا، اس کشتی میں حضرت یعقوب کے ہاتھوں پچھڑ جانا وغیرہ یہ یہود تھے، بعض نے خالق کو صفات سے بالکل ہی معطل قرار دے رکھا تھا، جیسے فلاسفہ اور بعض نے خالق و مخلوق کی صفات سے بالکل ایک دوسرے کے مشابہ بنا رکھی تھیں، جیسے مجسمہ اور مشبہ بعض نے اوتار کا عقیدہ مان کر خدا کو مخلوق میں حلول شدہ مان رکھا تھا، گویا مخلوق ایک ظرف تھی، جس میں معاذ اللہ خالق اترا ہوا تھا، اور بعض نے اس کے برعکس خالق کو ظرف قرار دے کر مخلوق کو اس میں اس طرح سمایا ہوا مان رکھا تھا، جیسے گولر کے پیٹ میں بھنگے سمائے ہوتے ہیں، یہی معاملہ نبوت کے ساتھ کیا جا رہا تھا، کسی نے نبوت کو اس حد تک مافوق البشریت سمجھ رکھا تھا کہ بشر کا رسول ہونا ہی ممکن نہ تھا، جو کھاتا پیتا ہو۔ مالِ ھذا الرسول یاکل الطعام ویمشی فی الاسواق ؛ اس رسول کو کیا ہوا کہ وہ کھانا کھاتا ہے اور بازاروں میں چلتا پھرتا ہے، اور کسی طبقہ نے نبوت کو اس قدر ملکی اور عامیانہ چیز جان رکھا تھا کہ وہ ہر فرد بشر کو مل سکتی ہے۔ بل یرید کل امرٍ منھم ان یوتیٰ صحفا منشرۃ ؛ کسی نے انبیاء کو مجسم خدا کہہ کر ان کی تنزیہہ میں مبالغہ آرائی کر رکھی تھی کہ کسی نے انبیاء کی طرف ایسے ایسے کینہ عیوب منسوب کر رکھے تھے کہ ان کا ایک صحیح انسان سمجھا جانا بھی مشکل بنا دیا تھا۔

غرض الوہیت کی لائن تشبیہ، تجسم، تعطیل، تجلیس وغیرہ کوئی نقص و عیب ایسا نہ تھا جس سے خدا کی تنزیہہ کو مخلوق نے برباد نہ کر رکھا ہو اور نبوت کی لائن پر کوئی افراط و تفریط باقی نہ چھوڑی تھی جو انبیاء میں نہ مان رکھی ہو، یہی تمام وہ معنوی ظلمات اور تاریکیاں تھیں جو بعضہا

فوق بعض ہوکر پوری دنیا کو تاریک بنائے ہوئے تھیں، جس سے اس وقت کی ساری دنیا خدا کی نگاہ میں ۔۔۔۔۔۔۔۔۔ مبغوض بن چکی تھی۔

ان اللہ نظر الی قلوب بنی آدم فمقت عربھم وعجمھم الخ:

اللہ نے بنی آدم کے قلوب کی طرف نظر کی تو عرب اور عجم سب کو غصہ سے دیکھا۔

مگر بہر حال یہ جس قدر ممالک بھی تھے، وہ کسی ایک نوع کی گمراہی پر قائم نہ تھے، اگر ہندوستان میں شرک تھا تو وہاں تثلیت نہ تھی، روم میں تثلیت تھی تو وہاں تکثیر نہ تھی کہ کروڑوں معبود ہوں۔ اگر ایران میں ثنویت کا زور تھا تو وہاں اوتاریت نہ تھی اور اگر ہند میں وثنیت تھی تو وہاں دوسری نوع کی کوئی اور گمراہی نہ تھی، اگر مصر میں دہریت اور عیش پرستی تھی تو بس وہی تھی۔ وہاں مذہبی رنگ کی رسوم نہ تھیں۔ لیکن خدا کی یہ مقدس سرزمین مکہ مکرمہ اس وقت ہمہ نوع گمراہیوں کا مرکز بنا ہوا تھا۔ وہاں دہریت شرک فسق و فجور انکارِ نبوت اور انکار صفاتِ نبوت وغیرہ ساری ہی انواع کی گمراہیاں جگہ بنائے ہوئے تھیں، اس لیے جہاں صبح صادق نور برسا رہی تھی۔ وہیں دلوں کی دنیا میں اندھیرا ہی اندھیرا چھایا ہوا تھا اور ضلالت کی تاریک رات کا جو عمل دنیا میں جاری تھا۔ وہ بھی انتہا کو پہنچ چکا تھا اس لئے طلوع آفتاب کا وقت آگیا اور اس آفتابِ نبوت کی صبح صادق بصورت مسیح علیہ السلام نمایاں ہوگئی۔

طلوعِ شفق

لیکن جب صبح صادق نے اپنی زمانی مسافت پوری کرلی اور یہ ہزاروں برس کے لمبے دن کی لمبی صبح صادق زائد از پانچ سو سال کے عرصہ میں پوری ہوگئی تو صبح صادق کے آخر میں طلوع آفتاب سے قبل شفق نمودار ہوتی ہے اور آسمان اک دم سرخی مائل نور سے اس قدر سرخ ہو جاتا ہے کہ گویا اس کے کنارے آگ سے دہک رہے ہیں، یہ طلوع شفق طلوع آفتاب کی بالکل قریبی علامتیں ہوتی ہیں، جس سے وہ اندھیرا بھی ختم ہو جاتا ہے۔ جو صبح صادق کے وقت زمین پر چھایا رہتا ہے یہ روشنی بھی آفتاب

ہی کی ہوتی ہے۔ کہیں باہر سے نہیں لائی جاتی۔ جیسا کہ صبح صادق بھی اسی کی روشنی تھی۔ فرق صرف قرب و بعد کا ہوتا ہے کہ شفق کا نور بلا واسطہ خود آفتاب ہی کے ساتھ چلتا ہے۔

ٹھیک اسی طرح آفتاب نبوت کی صبح صادق کے بعد بعثت سے قبل اس آفتاب کی شفق نمودار ہوئی یعنی آفتاب نبوت کے قریبی آثار نمایاں ہونے شروع ہوئے یہی وہ ارہاصات تھے جو ولادت باسعادت سے قبل دنیا کے سامنے آئے۔ بحیرہ ساوہ خشک ہوگیا۔ کسریٰ کے محل کے چودہ کنگرے گر پڑے۔ آتش کدہ ایران جو صدیوں سے مسلسل روشن چلا آرہا تھا۔ اک دم ٹھنڈا پڑ گیا۔ وغیرہ۔ یہ گویا آفتاب نبوت کی شفق کا ظہور تھا۔ جس سے آفاق روشن ہوگئے اور دنیا کو اندازہ ہوگیا کہ طلوع ہونے والا ستارہ کوئی چھوٹا موٹا یا معمولی ستارہ نہیں۔ بلکہ کوئی عظیم ترین سیارہ مطلع کو زینت بخشنے والا ہے۔ جو اب تک نمودار نہیں ہوا تھا۔ پس طلوع صبح صادق سے تورات ختم ہوئی تھی اور شفق کے طلوع سے وہ مخلوط تاریکی ختم ہوکر دن کی خالص روشنی کا آغاز ہوگیا۔ جس سے آسمان کے کنارے و زمین کے سارے اطراف سورج کی ابتدائی چمک و دمک سے چمک اُٹھے۔ دلوں میں توحید اور دیانت کی استعداد ابھرنی شروع ہوئی اور اطراف و اکناف میں ایسے لوگ ابھرنے لگے جو بت پرستی سے نفور ہوکر توحید کے نام لیوا ہوگئے اور اب وقت آگیا کہ آفتاب نبوت طلوع ہوکر ان سب چکیلی استعدادوں کو اُبھار کر قلوب کی زمینوں کو بقعۂ نور بنائے۔ گویا یہ نورانیتیں طلوع کے آخری آثار اور طلوع کے طلب گار ہوتے ہیں۔

خلاصہ یہ کہ ظلمتوں کی انتہا اور نور کی ابتدا اور ناتمامی کی ان پکاروں پر بخشش خداوندی جوش میں آئی اور ان پیاسے طلبوں کے انتہا کو پہنچ جانے پر تکمیل نور کے حل کا سامان عطا فرمایا۔ اولاً پو پھٹی صبح صادق کے آثار نمایاں ہوئے۔ جو طلوع آفتاب کی بشارت تھے صبح صادق سے لے یعنی حضرت مسیح نے اعلان کیا کہ جس نور کو زمین کی تاریکی اور ستاروں کی روشنی مانگ رہی تھی وہ شہنشاہ نور عنقریب آنے والا ہے۔ اس کے بعد طلوع شفق ہوا اور ارہاصات نمایاں ہوئے اور طلوع قریب ہوگیا۔ ابھی یہ سرچشمۂ نور (آفتاب) سامنے

بھی نہیں آیا تھا، صرف پو ہی پھٹی تھی، شفق ہی ابھری تھی کہ ظلمتِ شب نے فرار ہونا شروع کر دیا۔ سارے اک دم ماند ہو کر منہ چھپانے لگے۔ گو وہ محسوس نہیں ہوئے، مگر ان کی چھوٹی چھوٹی نورانی ہستیاں نورِ عظیم کے دریا میں غرق ہو کر منظرِ عام پر نہیں رہیں، یہاں تک کہ ان بشارتوں کے کچھ ہی عرصہ کے بعد آسمان کے چہرہ پر دہکتا ہوا، ایک ایسا نور کامل نمودار ہوا کہ اس کے بعد شب ربانی کے لئے کسی نور کی حاجت باقی نہیں، اس لئے سارے انوار اپنا منہ ڈھانپ گئے اور سامنے سے ہٹ گئے۔ یعنی آفتاب عالمتاب طلوع ہوا اور اپنی لمبی لمبی شعاعوں اور کرنوں سے دنیا کے کھلے اور چھپے ہوئے حصوں تک اس نے منور کر دیا۔

ہر طرف اسی سرچشمۂ نور آفتاب کی نورانی چادریں آفاق پر اس طرح چھا گئیں کہ ظلمت کا کہیں ڈھونڈنے سے بھی اثر باقی نہیں رہا۔ پس جو کام کروڑوں اور اربوں کھربوں ستارے مل کر بھی نہ کر سکتے تھے، وہ تنہا آفتاب اور نہ آفتاب کی ذات بلکہ اس سے پھیلنے والی روشنی نے کر دیا اور تدریجی رفتار سے دنیا کی روشنی آفتاب نکلتے ہی مکمل ہو گئی جس کا سامان رفتہ رفتہ ابتدا رشب سے ہی کیا جا رہا تھا۔

روشن مطلع اور روشنی کے درجات

لیکن جس طرح طلوع ہوتے ہی سورج سب سے پہلے اپنی کرنیں نقطۂ طلوع پر ڈالتا ہے۔ پھر عین مقام طلوع کو روشن کرتا ہے۔ پھر ذرا اور بلند ہو کر پورے مطلع کو روشن کر دیتا ہے اور پھر جوں جوں اونچا ہوتا ہے۔ دوں دوں روشنی کی تیزی مطلع کے چہار جانب آفاقِ عالم میں پھیلتی دکھائی دینے لگتی ہے، جو مطلع کسی مرکزی حصے میں ہو۔ جس سے روشنی چہار جانب پھیل سکے اور آخر کار پورے عالم کے کونے کونے میں روشنی پہنچ جاتی ہے۔ اندھیرے گھر سے بھی روشن ہو جاتے ہیں۔

نقطۂ طلوع

ایسے ہی آفتاب نبوت نے طلوع ہوتے ہی سب سے پہلے اپنے نقطۂ طلوع کو روشن کیا جو آپ کا گھرانہ تھا اور گھرانہ حرم خانہ بنتا ہے تو اولاً محرم نبوی ام المومنین حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا نور ایمان سے منور ہوئیں، جس کے معنی پورے گھر کے روشن ہو جانے کے ہیں اور قوا انفسکم واھلیکم نارا (بچاؤ اپنے نفس اور اپنے اہل وعیال کو دوزخ کی آنچ سے) کا ظہور ہوا۔

مقام طلوع

پھر نبوت کا آفتاب اور اونچا ہوا تو مقام طلوع پر کرنیں پڑیں اور وہ روشن ہو گیا۔ یہ آپ کا قبیلہ تھا جس میں آپ کا ظہور ہوا اور یہ وانذر عشیرتك الاقربین (اور ڈراؤ اپنے قریبی رشتہ داروں کو) کا ظہور تھا اور پھر آفتاب نبوت اور اونچا ہوا، یہاں تک کہ پورا طلوع ہو گیا تو مطلع کے ماحول پر روشنی پڑی اور یہ مکہ کا مقدس شہر اور اس کا ماحول تھا۔ جس سے لتنذر ام القری ومن حولھا (تاکہ تم ڈراؤ مکہ اور اس کے اردگرد کو) کا ظہور ہوا اور جب کہ اس آفتاب جہانتاب کی روشنی گھر اور شہر و قبیلہ تک محدود رکھنی نہ تھی، بلکہ جہانوں کے کونے کونے میں پھیلانی تھی۔

مرکز دائرۂ طلوع

تو جس طرح مادی سورج کا مطلع مشرقی افق کا بلند ترین حصہ رکھا گیا ہے۔ تاکہ وہاں سے اس کی روشنی پورے عالم میں پھیل سکے، اسی طرح آفتاب نبوت کے لئے مرکز طلوع کعبۂ مقدسہ کو تجویز کیا گیا جو ناف عالم اور وسط زمین تھا اور اسے دنیا کی اور ہر چہار سمت سے نسبت مساوی تھی۔ جیسا کہ مرکز کو اپنے دائرہ سے ہوتی ہے۔ تاکہ اس کی کرنیں اگر ایک طرف بحرۂ روم کے کناروں سے ٹکرائیں، جس سے اس کی روشنی مغرب

کی وادیوں میں پھیلے تو دوسری طرف بحرِ ہند کی لہروں سے جالڑیں، جس سے مشرقی ممالک ہند و سندھ، ایران و خراسان اور چین و جاپان روشن ہو جائیں اور اگر ایک سمت خلیج فارس کے ساحلوں پر اپنا نورانی سایہ ڈالیں، جس سے شمال کے علاقے منور ہوں تو دوسری طرف خشکی میں براعظم مصر و سوڈان کے علاقے چمک اٹھیں۔ اسلئے اس آفتاب کو افقِ مکہ سے بلند کیا گیا اور آپ نے اس ناف عالم سے آواز دی تو آپ کی صدائے ایمان جگہ جگہ پھیل، سلاطین عالم اور اقوام و ملل کو آوازۂ حق سے روشناس کیا۔ اور اس طرح لیکون للعالمین نذیرا ؕ (تاکہ وہ (ہمارا پیغمبر) جہانوں کے لیئے ڈرانے والا ہو) کا ظہور ہوا۔ پس جیسے مادی آفتاب کے عروج اور چڑھاؤ میں روشنی کے درجات متفاوت ہوتے ہیں۔ جو آفتاب کے تدریجی طلوع و عروج سے نمایاں ہوتے ہیں ایسے ہی آفتاب نبوت میں بھی علمی نور پھیلانے کے درجات متفاوت ہوئے۔ جو اس رُوحانی آفتاب کے تدریجی ظہور کی صورتوں سے منظرِ عام پر آگئے اور آفتاب کا طلوع بالکل نزدیک آگیا۔

آفتابِ نبوت اور نجوم ہدایت کے نور میں جزوی اور کلی کا فرق

پھر جس طرح ستاروں کی روشنی جزوی ہونے کی وجہ سے ایسی عمومی اور کلی رنگ کی نہیں ہوتی جو پھیلتی ہوئی چلے اور نہ ایسی تیز ہی ہوتی ہے کہ اس کا نورانی سایہ دھوپ اور چاندنی کی طرح پھیل کر تمام اوجھل اور مخفی گوشوں کو بھی نمایاں کر دے، اسی طرح سابقہ نبوتوں یعنی شرائع سابقہ کی روشنی جزئیاتی اور مقامی رنگ کی تھی۔ جس سے ان میں کوئی ایسا پھیلاؤ نہیں تھا کہ دنیا کی تمام قوموں کو ان کی متفرق نفسیات کے ساتھ ایک پلیٹ فارم پر جمع کر سکتیں یا زندگی کے تمام مخفی سے مخفی گوشے پر وہ چھا جاتے اور نہ ہی ان کے احکام ایسی جامع علتوں اور اصول پر مشتمل نظر آتے ہیں، جس سے احکام میں انشعاب اور شاخ در شاخ ہونے کی صورتیں نمایاں ہوں۔ کیونکہ پھیلاؤ اور احاطہ کی شان اصول و علل ہی میں ہو سکتی ہے۔ جزئیات محضہ میں نہیں ہو سکتی۔ اگر ایک اصول کلی سامنے ہے تو

اس سے ہزار ہا جزئیات نکل کر پھیل سکتی ہیں، اگر ایک قاعدہ کلیہ معلوم ہے تو ہزار ہا احکام کا اس سے فیصلہ ہو سکتا ہے اور دین شاخ در شاخ ہو کر ایک ہمہ گیر قانون کی شکل میں آجاتا ہے۔ اگر مسئلہ جزوی بھی ہو، مگر کسی علت پر مشتمل ہو جو اس حکم جزئی کا منشا ہے تو اس جزئی کی یہ اصولی علت بھی اس سے ہزار ہا جزئیات کے نکل آنے کا ذریعہ بن جاتی ہے۔ یا جزئی حکم میں علت کلی تو نظر نہ آئے، مگر خود حکم چند جامع اور مشترک قسم کے اوصاف پر مشتمل ہو تو اوصاف کی یہ عمومیت ہی بمنزلہ علت کلی کے بن کر جہاں جہاں بھی پائی جائے گی، وہیں وہیں اس حکم کو بھی منتقل کرتی رہے گی اور اس طرح دین کے کتنے ہی مجمل اور مخفی حصے نمایاں ہو کر دین کو مفصل اور ہمہ گیر بنا دیں گے، بہر حال ادیان میں ہمہ گیری بغیر اصولیت کلیت اور جامعیت کے ممکن نہیں، محض جزئیت اور وہ بھی رسومی نشان کی جزئیت سے دین میں وسعت پیدا ہونے کی بجائے اس میں محدودیت تنگی اور رجعت پسندی کی شان پیدا کر دیتی ہے۔

ظاہر ہے کہ شرائع سابقہ میں (جس ہیئت سے آج وہ ہمارے سامنے ہیں۔) جبکہ جزئیت کا غلبہ ہے اور احکام اصولی ہونے کے بجائے شخصیاتی رسوم کے رنگ کے ہیں، جن کی پیروی محض شخصیتوں کی نسبت سے کی جاتی ہے۔ نہ کہ کسی اصولی حجت سے تو وہاں کسی انشعاب یا شاخ در شاخ ہو کر دین کے پھیلنے اور ہمہ گیر بن جانے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا، کیونکہ محض جزئی سے جزئی پیدا نہیں ہوتی، جب تک کہ جزئی کسی علتِ کلی یا وصف عمومی پر مبنی نہ ہو۔ اسکا واضح نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ اس قسم کی جزئیاتی شرائع میں وقت کے تقاضوں کو پورا کرنے والے نئے نئے احکام نکالنے کی کوئی راہ ہی نہیں کہ دین بڑھے اور شاخ در شاخ ہو کر قوم بہ قوم چلے جبکہ ان کے احکام و مسائل میں علل کلیہ اور بنیادی حقائق کا وجود ہی نہیں، جو ان میں پھیلاؤ پیدا کرے۔ اسی لئے یہ شریعتیں نہ ہر دور میں چل سکتی ہیں نہ ہر دور کے وقتی تقاضوں کو پورا کر سکتی ہیں اور اسی لئے ایسی شریعتیں ہر اگلی شریعت کے سامنے فسخ و ترمیم کے مقام پر رہتی آئی ہیں اور منسوخ ہوتی رہی ہیں۔

ہاں اس تنسیخ و ترمیم سے محفوظ اگر ہو سکتی ہے تو صرف وہی شریعت جو خالص اصولِ

کلیہ اور جامع دستور زندگی کی بنیادوں پر قائم ہو اس میں بعض وقت یا کسی موجودہ قوم ہی کے مزاج کی رعایت نہ ہو، بلکہ انسانی فطرت اصل سمجھی گئی ہو، جو سارے انسانوں اور سارے اقوام میں قدر مشترک ہے تاکہ اس کے مشترک اور عمومی اصول سے دنیا کی ہر قوم اور ہر قوم کا ہر قرن اور ہر دور فائدہ اُٹھا سکے اور تمام نئے نئے حوادثات کے نئے نئے احکام کی بنیادیں اس میں پہلے ہی سے رکھی ہوئی ہیں۔ بالفاظ دیگر اس کا نور سورج کے نور کی طرح عام ہو، ستارں کے نور کی طرح خاص اور محدود معین نہ ہو۔

سو اسلام کی آخری شریعت میں اصول و کلیت کے غلبہ کی وجہ سے یہی شان پائی جاتی ہے کہ وہ ترقی پذیر اور اصلی احکام کے ساتھ فرعی احکام کی ساری بنیادیں اپنے اندر لئے ہوئے ہے۔ کیونکہ فرعی احکام اصولی علتوں اور جامع حقائق سے پیدا ہوتے ہیں، سو اس کے ہر ہر جزئی حکم میں بھی کلی علتیں مخفی ہیں۔ ہر حکم کا ایک مناط ایک کلی بنیاد ہے جس پر وہ حکم دائر ہے۔ پھر کلیات اور اصول بھی کئی رنگ کے ہیں، جن میں اساسی اصول الگ ہیں اور تفریعی اصول الگ۔ پھر اس کی تعبیرات اور اسلوبِ بیان الگ جامع اور فطرت کلیہ کا رنگ لئے ہوئے ہے کہ خود اس سے بھی احکام پیدا ہوتے ہیں۔ معانی الگ جامع اور عمومیت کے رنگ سے بھرے ہوئے ہیں اور ایک ایک حکم اپنی نوع کے تمام احوال اور تمام جانبوں اور پہلوؤں پر مشتمل ہے اور جو نسا پہلو وقت کے تقاضے سے قابل ترجیح ہو، اس کے سامنے کر دینے کی عبارتِ حکم میں صلاحیت رکھی ہوتی ہے۔ اسلئے ایک آیت اور ایک روایت اس درجہ اپنے حکم کے نشیب و فراز، اونچ نیچ اور گرد و پیش کے طلبی احوال کی لچک لئے ہوئے ہے کہ وہ ہر دور میں زندگی کے ہر ہر موڑ اور وقت کے ہر تقاضے پر حاوی اور اس کے لئے رہنمائی کی قوت رکھتی ہے۔ یہ اصول شخصیتوں کو بنائے رہتے ہیں اور اُن سے مختلف رنگ کے عملی اُسوے نمودار ہوتے رہتے ہیں، جو اصول کی روشنی سے باہر نہیں ہوتے۔ پس اور جگہ وہ اُسوے ہیں، جن کی بنیاد اشخاص ہیں اور یہاں وہ اسوے ہیں، جن کی بنیاد اصول ہیں اور شخصیتوں سے ان کی تائید و تقویت ہوتی ہے۔ اس لئے اس دین کی حجتیں چار قرار دی گئیں، جن میں سے دو تشریعی ہیں، جن

شریعت بنی ہے اور وہ کتاب اللہ اور سنت رسول اللہ ہیں اور دو تفریعی ہیں، جن سے شریعت کھلتی ہے اور اس میں بسط وانبساط کا اضافہ ہوتا ہے اور وہ اجماع و قیاس ہیں، ظاہر ہے کہ قیاس وانبساط اپنا کام نہیں کر سکتا۔ جب تک کہ خود دین کے احکام و مسائل میں کلیاتی علتیں رکھی ہوئی نہ ہوں، جن کی اصولیت سے فروع پیدا کی جائیں اور دین بسط کے ساتھ پھیل نہیں سکتا۔ جب تک کہ خود اس میں پھیل پڑنے کی صلاحیتیں نہ ہوں، لیکن جب کہ آفتاب نبوت کے دھوپ کی طرح پھیلتے ہوئے دین میں پھیلنے کی استعدادیں تھیں، اور جزئیات کے ساتھ اس میں اصول کلیہ بھی ہر باب کے الگ الگ موجود تھے تو اجتہادی قوتوں نے دین کے اصول کلیہ میں سے جزئیات کو کھینچ نکالا اور جزئیات کو جزئیات پر کسی علت جامعہ کے اشتراک سے قیاس کر کے ایک جزئی کا حکم دوسری جزئی میں منتقل کیا اور پھر ایک باب کی بہت سی جزئیات کا تتبع کر کے کلیات اصول پیدا کئے۔ جن سے پھر ہزاروں نئی نئی جزئیات کا فیصلہ ہوا۔ جس سے اس دین میں تفاصیل کا باب کھلا اور یہ دین دنیا کی ہر قوم کے مزاج کے مناسب حال احکام اور انداز تربیت کا جامع ثابت ہوا۔

اگر دین میں اصولیت وہمہ گیری اور اس کے اصول میں فروع کی تفریع کی یہ صلاحیت نہ ہوتی یعنی یہ دین بھی اور ادیان کی طرح جزوی رنگ کا ہوتا جس میں رسوم محض ہوتیں، حقائق عامہ نہ ہوتیں تو اجتہاد و استنباط کی قوتوں کی بھی ضرورت نہ پڑتی، جیسا کہ ادیان سابقہ میں نہیں ہوئی اور وہ محدود ہو کر رہ گئے۔ یہاں تک کہ ختم ہو گئے۔ پھر نہ ہی اس دین میں دین کے اصول کلیہ میں سے نکلی ہوئی ان تفصیلات کا کوئی تصور ہوتا جن سے دین شاخ در شاخ ہو کر دنیا کی ہر قوم کے درد کا درماں بن سکتا اور اس میں تا قیام قیامت بقار و ابدیت کی شان پیدا ہوتی لیکن جبکہ دین کی جامعیت اور ہمہ گیری کا نقشہ وہ ہے، جو ابھی عرض کیا گیا تو اسی کا طبعی تقاضا یہ ہونا چاہیئے تھا اور ہوا کہ اس امت کے قلب و دماغ میں اس جامع دین کی تربیت سے اجتہادی قوتیں اور استنباطی طاقتیں نمودار ہوئیں اور انہوں نے ان اصول اور کلیاتی علتوں سے بتقاضا وقت فروع نکالیں اور نکالنے کے اصول بھی اسی جامع شئون سے وضع کئے جس سے مختلف رنگ کے فقہ پیدا ہو کر مذاہب اجتہاد نمایاں ہوئے اور بالفاظ دیگر شرائع

اصلیہ میں سے شرائع وضعیہ نکلیں، جن سے دنیا کے مختلف الالوان طبقات کو اپنے اپنے ذوق کے مطابق دین پر عمل کرنے کی راہیں نظر آگئیں اور اس طرح یہ دین اپنی مختلف شانوں کے ساتھ قوم بہ قوم ملک بہ ملک اور زمانہ بزمانہ پھیل کر عالمگیری کے ساتھ چلا اور بڑھا

گویا جس طرح دنیا کی اقوام کے مزاج مختلف جذبات الگ اور رجحان و میلانات جدا جدا تھے۔ کوئی قوم نرم خو ہے اور کوئی تند خو۔ کوئی وسعت پسند ہے اور کوئی ضیق پسند کوئی ترقی پسند ہے۔ کوئی رجعت پسند، کوئی انفرادیت دوست ہے اور کوئی اجتماعیت پسند، کوئی دیانت مزاج ہے اور کوئی سیاست کیش اور پھر جیسے حق تعالیٰ نے اقوام عالم کے ان مختلف طبعی اور فطری جذبات کی تسکین کے لئے خود دین کے احکام واصول میں نرمی وگرمی۔ انفرادیت واجتماعیت۔ خلوت وجلوت۔ وسعت و محدودیت۔ دیانت وسیاست۔ درویشی وشاہی عقل ونقل، حکم وحکمت اور زہد وتورع وغیرہ کے سارے ہی مختلف رنگ کوٹ کوٹ کر بھر دیئے تاکہ دنیا کی کسی قوم کے کسی بھی ذوق کا کوئی تقاضا ایسا نہ رہے جسے یہ عالمگیر دین پورا نہ کر سکے تو ایسے ہی اس کی فیاض قدرت نے امت میں مجتہدین بھی ایسے مختلف المزاج۔ مختلف المذاق اور مختلف الالوان پیدا فرمائے، جن کے مذاق الگ الگ مزاجوں کا رنگ جدا جدا اور دیانت وحق پرستی کی قدر مشترک کے ساتھ ذوق الگ الگ ہوئے بعض کے مزاج میں احتیاط کا غلبہ ہے، جو دین کی عبارت وتعبیر سے ایک انچ ادھر ادھر ہونا نہیں چاہتے اور بعض میں تورع اور ہمہ گیری کا غلبہ ہے جو دین کی روایت سے اس کی درایت میں گھس کر اس سے عالمگیر رنگ کو نمایاں کرنا چاہتے ہیں۔ بعض میں فرد کی اصلاح کو اصل رکھنے کا جوش ہے اور بعض میں جماعتی نظام کو بھی برپا رکھنے کا جذبہ ہے۔ بعض پر نفس دین کی تنقیح اور اس کی استواری کا جوش غالب ہے اور بعض میں اس کیساتھ نظم دین اور نظام ملت کی استواری کی اہمیت بھی جاگزیں ہے۔ بعض میں دینی معیار سے طبقاتی نظام کی برقراری کے دواعی غالب ہیں اور بعض میں نظام ملکی اور ہمہ گیر تنظیم کے جذبات کارفرما ہیں، بعض مسائل تک محدود رہنا چاہتے ہیں اور بعض مصالح مرسلہ کو بھی نظر انداز کرنا نہیں چاہتے۔ بعض قرب واقترابات کے رنگ سے چلتے ہیں اور بعض

رفیق دار اتفاقات کو بھی ساتھ ساتھ رکھنا چاہتے ہیں۔

غرض رب العرش نے جتنے رنگ، دین میں جمع کئے۔ اتنے ہی ذوق دانایانِ دین میں بھی پیدا کر دیئے تاکہ ہر ایک ذوق کا حکیم اور مجتہد اپنے اپنے مکتبِ فکر کے مطابق دین کے مطمح نظر کو سمجھا اور جب امت میں سے اس ذوق کے خاص طبقات اس توافقِ رنگ کی وجہ سے اس کی طرف جھکیں تو وہ اسی رنگ میں اپنے ماننے والوں کو تربیت دے تاکہ ہر طبقہ کے فطری جذبات کی تعلیم و تربیت اور اصلاح و ترقی کا سامان اہل دین کی وساطت سے دین ہی میں سے مہیا ہوتا رہے۔ غرض اقوام عالم میں سے جس قوم پر جس قوم کے طبعی یا عقلی یا ذوقی رجحانات کا غلبہ ہو، وہ اسی ذوق کے مجتہد و امام کا دامن سنبھال کر اپنے لئے دینوی و اُخروی نجات کا سامان بہم پہنچاتا رہے اور دنیا کے کسی طبقہ کو بھی یہ کہنے کا موقع نہ ملے کہ مثلاً وہ فطرتاً فلاں پہلو کو معقول سمجھتا ہے۔ مگر وہ دین کے اصول و فروع میں موجود ہی نہیں۔ یا ہے تو مخفی اور لپٹا ہوا ہے۔ جسے کوئی مفکر کھول نہیں سکا۔ اس لئے وہ اس دین کو ناتمام سمجھ کر اس کو قبول کرنے کے لئے تیار نہیں ہے۔ بلکہ ہر ایک فرد اور طبقہ کو اس کی روحانی دوا اور غذا اس جامع دین میں بآسانی میسر آسکتی ہے۔ ظاہر ہے کہ جامعیت کا یہ رنگ آفتابِ نبوت ہی کی شریعت میں ہو سکتا تھا۔ نہ کہ عام نجوم ہدایت کی محدود شرائع میں۔ وجہ آفتاب ہی کی مثال سے واضح ہے کہ آفتاب بلاشبہ ایک ہے اور اس سے چھوٹنے والی دھوپ بھی ایک ہی ہے۔ جسکا رنگ بھی ایک ہی ہے۔ جو ہر دَر و دیوار پر پڑتا ہے۔ لیکن جب کہ وہ پھیلنے والی ہے اور پھیل کر ہر دَر و دیوار اور روزن و سوراخ میں پہنچ جانے والی دھوپ ہے تو اُسے جس رنگ کے آئینہ سے نمایاں کیا جائے گا۔ وہ اسی رنگ میں نمایاں نظر آئے گی۔ جو درحقیقت آئینہ کے ظرف کا رنگ ہوگا۔ دھوپ کا نہیں۔ مگر پھر بھی وہ دھوپ سورج ہی کی کہلائے گی۔ خواہ اس کا رنگ کچھ بھی ہو اور آفتاب ہی کی روشنی شمار ہوگی۔ خواہ وہ کسی بھی رنگ میں نمایاں ہو۔ تاہم اُسے مختلف رنگ کے آئینوں سے اس لئے نمایاں کیا جاتا ہے کہ دھوپ لینے والے طبقہ کی آنکھوں کو اسی رنگ کی ضرورت ہوتی ہے۔

ایک طبقہ کی بینائی کمزور ہے جسے سورج کی بلاواسطہ روشنی خیرہ بنا دیتی ہے تو اُسے لا محالہ سبز رنگ کے آئینہ سے دھوپ دیکھنے کی ضرورت پڑیگی۔ جس سے اس روشنی کا تحمل کر سکے۔ ایسے ہی اور رنگوں کو بھی قیاس کر لیا جائے۔ اندریں صورت اُسے خیرگی کا عذر کر کے دھوپ سے بھاگنے کی ضرورت نہیں بلکہ سبز رنگ کا آئینہ تلاش کر کے اس کے پردے میں سے دھوپ لینے کی ضرورت ہے۔ پس دھوپ، تو ایک ہی ہے مگر آئینوں کے رنگوں کی وجہ سے اس میں شدت و خفت۔ اور تحمل یا برداشت اور عدم برداشت کا فرق پڑ جاتا ہے۔

لیکن اسی کے ساتھ اس سے بھی انکار نہیں کیا جا سکتا کہ دھوپ پھینکنے اور آئینوں کے پردوں سے اُسے رنگ برنگ انداز میں پھیلانے کی صلاحیت آفتاب ہی میں ہے ستاروں میں نہیں، کیونکہ ستاروں میں پھیلتی ہوئی روشنی ہی نہیں جو آئینوں کے راستے سے مختلف رنگوں میں نمایاں ہو۔ آپ رات کے وقت ستاروں کو کتنے ہی آئینے دکھلائیں یا تو اُن کی روشنی آئینہ میں نمایاں ہی نہ ہوگی اور کچھ ہوگی تو پھیلتی ہوئی نہ ہوگی، جو آئینوں کے واسطہ سے کوٹھوں اور کمروں میں پہنچائی جا سکے۔ جس کا مطلب یہ ہے کہ ستارے خود تو آئینہ میں نمایاں ہو جائیں گے۔ لیکن ان کی کوئی پھیلتی ہوئی شعاع جیسے آئینوں سے واسطہ بغیر بھی نہیں پھیلتی تھی، ایسے ہی بواسطہ آئینہ بھی نہیں پھیل سکے گی کہ وہاں پھیلتی ہوئی شعاع یا چاندنی ہے ہی نہیں، جسے بلاواسطہ یا بالواسطہ پھیلایا جا سکے۔

اس تمثیل سے واضح ہے کہ آفتابِ نبوت سے قبل کی راتوں میں جب کہ نجوم ہدایت اپنی اپنی جگہ نمایاں تھے تو ان کی روشنی یعنی شرعی ہدایتیں جزئیاتی تھیں، جو ان کی شخصیاتی خصوصیات سے وابستہ تھیں، ہمہ گیر اصول اور جامع علل و کلیات پر مبنی نہ تھیں، جنہیں پھیلنے والی روشنی سے تعبیر کیا جا سکے اور وہ عالم کے ایک ایک کونے میں پہنچے اور بعد تک پہنچتی رہے، اس لئے ان امتوں میں تفقہ و اجتہاد کی شان بھی نہ تھی اور مجتہدین کا وجود بھی نہ تھا کہ وہ شریعت ان کی روشنی میں شاخ در شاخ ہو کر آگے چلتی اور عمر دوام حاصل کرتی۔ بالفاظ دیگر امم سابقہ میں شرائع اصلیہ تو تھیں مگر شرائع وضعیہ نہ تھیں۔ ان میں احکام ضرور تھے۔ مگر ہمہ گیر عقل و

اسرار کا وجود نہ تھا۔ پس ان میں ذوق واحد تھا۔ دنیا کی مختلف قوموں کے مزاج اور امثل کے رنگ برنگ ذوقوں کا اجتماع نہ تھا۔ اس لئے ایک ہی طبقہ اپنے مناسب مزاج اس شریعت کو قبول کرتا تھا اور اس کے ذریعہ نجات حاصل کرلیتا تھا اور وہ درحقیقت اسی کیلئے مخصوص طور پر آسمان سے اتری بھی تھی۔ دوسرے طبقات کے لئے دوسری شریعت اور دوسری پیغمبری درکار ہوتی تھی، پس دین قومی اور وطنی ہوتا تھا۔ عالمگیر اور ابدی نہ ہوتا تھا کیونکہ وہ نجوم ہدایت کا دین تھا۔ جو مخصوص اور محدود روشنی لے کر آئے تھے۔ آفتاب ہدایت کا دین نہ تھا۔ جس کی روشنی عالمگیر ہوتی ہے۔

كان النبي يبعث الى قومه خاصة وبُعِثْتُ إلى الناسِ كافة ،	پہلے نبی اپنی اپنی قوموں کی طرف خاص کر کے بھیجے جاتے تھے (کہ وہ ہدایت کے ستارے تھے) اور میں ساری دنیا کے انسانوں کے لئے (بلاتفریق قوم و وطن) بھیجا گیا ہوں (کہ آفتاب نبوت ہوں)

اس لئے اگر کسی پہلے نبی کی شریعت غیر قوموں کے لئے ناقابل تحمل ہوئی تھی تو وہ ان کے لئے بھیجی بھی نہ جاتی تھی اور نہ ہی دوسری قومیں اس کی مکلف ہوتی تھیں۔ اندریں صورت ان شریعتوں کو مختلف المزاج قوموں اور طبقات کے لئے مختلف الالوان بنانے کی ضرورت نہ تھی کہ انہیں مختلف الذوق مجتہدوں کے رنگ برنگ آئینے لاکر ان کی روشنیوں کو ہلکا یا تیز کر کے نمایاں کیا جائے اور خواہ مخواہ ہر امت کے لئے قابلِ قبول بنایا جائے۔ مگر آفتابِ نبوت کی روشنی یعنی اسلامی شریعت دھوپ کی طرح ہمہ گیر اور عمومی واصولی ہونے کی وجہ سے دنیا کے ہر طبقہ اور ہر قوم کے لئے پیغام تھی اور طبقات کی قوتِ برداشت اور مزاج الگ الگ تھے۔ اس لئے اس کی پھیلتی ہوئی ہمہ گیر روشنی کو مختلف مزاجوں کے موافق بنانے کے لئے مختلف رنگوں کے آئینوں یعنی رنگ برنگ آئمہ مجتہدین مجددین اور علمائے مفکرین کی ذات تھی۔ جو اپنے مختلف الذوق دلوں میں اس شریعت کے اصولی علم کو جذب کر کے اپنی اپنی مخصوص قوتِ اجتہاد اور اپنے خاص مکتبِ فکر سے اسے نمایاں کریں تاکہ دنیا کا ہر

طبقہ اپنی ذہنیت اور اپنے مذاق و مزاج کے مناسب حال امام کا انتخاب کر کے اس کے ...... مکتبِ فکر کے دائرہ میں دین کو سمجھے اور وسیلۂ نجات بنائے اور کسی کو یہ کہنے کا موقع نہ ملے کہ دین میں میرے فلاں فطری مذاق کا کوئی سامان موجود نہیں تو میں اس دین کا مکلف نہیں ہوں۔

آفتاب اور ستاروں کے نور میں جزوی اور کلی کا فرق ہے

لیکن آسمانِ نبوت کے ان ستاروں کی روشنیاں خود ان کی ذوات یا ذوات سے سرزد ہونے والی ذاتی علامتوں تک ہی محدود تھیں۔ یعنی وہ خود بذاتہٖ ہدایت کے روشن منارے تھے، جنہیں دیکھ کر دین کا راستہ ملتا تھا۔ ان کی شریعت صرف ان کا عملی اسوہ ہوتا تھا۔ جسے دیکھ دیکھ کر اس کی پیروی کی جاتی تھی۔ لیکن ان سے پھیلنے والی روشنی دھوپ یا چاندنی کی طرح نہ تھی کہ ان سے غائب رہنے والے دنیا کے سب لوگ بھی جو اُن کی شریعت کے مخاطب نہ تھے۔ ان کی ذوات سے وہی فائدہ اُٹھا سکتے۔ جو سامنے رہنے والے اٹھاتے تھے کیونکہ پھیلاؤ کی یہ صورت کہ حاضر و غائب یکساں ہدایت بخش ہو۔ اصول و قوانین کے علم کی ہوتی ہے۔ نہ کہ محض نمونۂ عمل کی۔ عمل عامل کی ذات کے ساتھ قائم رہتا ہے۔ اس لئے جو ذات کو دیکھ رہا ہے۔ وہ عمل کو بھی دیکھ رہا ہے ذات نگاہ سے اوجھل ہوئی تو اُسکا عمل بھی سامنے سے غائب ہو گیا۔ لیکن علم و اصول ہی وہ چاندنی ہے جو ذات سے نکل کر ذات کے بعد تک چلتی رہتی ہے کیونکہ علم عالم کے اٹھ جانے سے نہیں اٹھتا، بلکہ بدستور اس کی روشنی قائم رہتی ہے اور علم میں بھی جبکہ امور کلیہ قواعد عامہ اور اصولِ کلی کی روشنی بھی سمائی ہوئی ہو تو وہ علم قرون و دہور اور زمانوں کی قید سے آزاد ہوتا اور ابد تک روشنی پہنچاتا رہتا ہے۔

پس انبیائے سابقین کی شریعتوں میں غلبۂ عملی رسوم اور نمونوں کا ہوتا تھا۔ علم کا نہیں، وہی نمونے اُن کی آسمانی کتابوں میں منضبط کر کے اوتار دیئے جاتے تھے اور ان نمونوں سے متعلق جتنے علم کی ضرورت ہوتی تھی وہ نوشتوں اور یادداشتوں کے ذریعہ

دیا جاتا تھا۔ گویا عمل سے علم ہوتا تھا۔ علم سے عمل نہ تھا۔ شریعتیں علم کی گہرائیوں اور احکام کی جامع علتوں پر مشتمل نہ ہوتی تھیں کہ احکام علمی علتوں پر مبنی ہو اور اعمال کو نشو و نما دینوالے ان کے مخفی علل و اسرار اور حقائق و معارف ہوں۔ جن کے عموم سے دین عام وسیع الاحکام اور پائیدار ہو کر ہر دَور کے تقاضوں کو ان اصول کلیہ کی وسعتوں کی روشنی میں پورا کرتا چلا جائے تاآنکہ بعد والوں کے لئے بھی وہ ان اصولی علوم و کلیات کے ذریعہ اسی طرح ہدایت بخش ثابت ہو، جس طرح حاضر الوقت افراد و اقوام کے لئے تھا۔ اس لئے دین کی صورت یہ ہوتی تھی کہ انبیاء اور ان کے خلفاء کی موجودگی میں جب تک یہ عملی نمونے بحالہٖ قائم رہتے تھے، دین باقی رہتا تھا اور جونہی شخصیتیں اُٹھ جائیں۔ وہ بے روح ہو کر ختم ہو جاتا تھا کیونکہ وار و مدار دین کی شخصیتوں اور اُن کے محسوس نمونہ ہائے عمل پر تھا۔ پس عمل کی روح شخصیتوں کا وجود تھا جو پائیدار نہیں ہوتیں نہ کہ علمی اصول حقائق عامہ اور قواعد کلیہ پر جو دوامی ہوتے ہیں۔ اس لئے دین کا نقشہ بالآخر بگڑ کر دوسرے دین کے لئے جگہ خالی کر دیتا تھا اور اس سے بنی ہوئی قوم ختم ہو جاتی تھی۔ حدیث ذیل سے اس حقیقت پر روشنی پڑتی ہے۔

عن ابن مسعود قال قال رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم ما من نبی بعثہ اللّٰہ فی امتہٖ قبلی الا کان لہٗ فی امتہٖ حواریون واصحاب یاخذون بسنتہٖ ویقتدون بامرہٖ ثم انہا تخلف من بعدھم خلف یقولون مالا یفعلون ویفعلون مالا یؤمرون الی آخر الحدیث (مشکوٰۃ باب الاعتصام بالسنۃ)

ابن مسعود رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ کوئی بھی نبی جسے اللہ نے اس کی امت کی اصلاح کے لئے بھیجا ہو، ایسا ضرور ہوا ہے کہ اس کی امت میں اس کے حواری اور دوست ہوتے تھے جو اس کی سنت کو اختیار کرتے تھے اور اس کی بات کی پیروی کرتے تھے مگر آخر کار ان کے بعد ایسے خلف پیدا ہو جاتے تھے، جو دعوے وہ کرتے تھے جو عمل میں نہیں لاتے تھے اور عمل وہ کرتے

تھے۔ جس کا انہیں امر نہیں کیا گیا تھا۔

اس سے واضح ہے کہ امم سابقہ میں سنت انبیاء اور اسوہ ہائے پیغمبری شریعت ہوتے تھے۔ جس کی اقتدا کی جاتی تھی۔ لیکن ان انبیاء علیہم السلام اور ان کے ابتدائی خلفاء کے گزر جانے کے بعد جبکہ اس اسوئے کے عملی نمونے اور اس کے پابند لوگ باقی نہ رہتے تھے تو شریعت کا نقشہ بدل جاتا تھا۔ کیونکہ دلائل وحقائق کی علمی قوتیں ان نمونوں کی پشت پر نہ ہوتی تھیں کہ وہ اس بگاڑ کو سنبھال کر سنوار سے بدل دیں اور کچھ ہوتی بھی تھیں تو صرف انہیں گرم عمل کے بتانے کیلئے ہوتی تھیں۔ ان کو بنانے کیلئے نہیں۔

چنانچہ اقوام سابقہ کی باقیات آج جن رسوم پر قائم ہیں۔ اگر وہ ان کے دعووں کے مطابق وہی قدیم رسوم ہیں جو ان کے انبیاء نے انہیں وراثت میں دی ہیں تو اس سے یہ مذکورہ دعویٰ واضح ہو جاتا ہے کہ شرائع سابقہ کی بنیاد علوم و حقائق یا دلائل وشواہد کے بجائے زیادہ تر شخصی یا قبائلی رسوم اور مخصوص عملی ہستیوں پر تھی۔ چنانچہ آج بھی اگر ان سے ان رسوم کی دلیل پوچھی جائے تو وہ بجز اس کے اور کچھ نہیں کہہ سکتے کہ:۔

اِنا وجدنا اٰباءنا علیٰ امۃٍ واِنا	ہم نے باپ دادوں کو ایک طریقہ پر پایا ہے
علیٰ اٰثارھم مقتدون ؕ	اور ہم بھی ان کے پیچھے پیچھے چلے جا رہے ہیں:۔

کیونکہ ان کے پاس آثار کے سوا وجوہ ودلائل ہی نہیں اور آثار وہی ماضی کے رسوم ونقوش ہوتے ہیں، جنہیں پچھلوں کا نقش قدم کہہ کر بلا دلیل اختیار کر لیا جاتا ہے۔ اسی کو عرفی محاورہ پر رسم ورواج کہا جاتا ہے۔ جن میں وجوہ ودلائل کی روح نہیں ہوتی۔ ڈھانچہ ہی ڈھانچہ ہوتا ہے۔

پس آیت اور حدیث بالا اس کی کھلی شہادت دے رہی ہیں کہ امم سابقہ منہاجوں اور شریعتوں میں زیادہ زور نمونہ ہائے عمل ہی پر رہتا تھا علمی احوال اور حقائق کلیہ پر نہیں جس سے دین میں جان اور قوت تھا کی اسے تفصیل کی اس عداد پیدا ہو جاتی جو اس دین کو ہمہ گیر بناتی ہے۔

عبادات مذہب

چنانچہ ان کی عبادتوں کو دیکھو تو وہ بھی مجموعہ رسوم نظر آئیں گی۔ جیسے کسی قوم میں عبادت کے وقت گھی جلانا، گھنٹیاں بجانا، سنکھ پھونکنا وغیرہ۔ اگر معبودوں کے ساتھ طریق محبت و خدمت کو دیکھو تو بتوں کے سامنے کھانے رکھنا، پانی پیش کرنا اور پھر اُسے خود بخود ان کا پس خوردہ قرار دے کر تبرک سمجھ لینا رسم بے حقیقت نہیں تو اور کیا ہے۔ جس کے نیچے کوئی بھی عقلی یا نقلی حجت اور اصل کلی نہیں، بجز اس کے کہ باپ دادا کی رسم کہہ لی جائے۔ ۔ عیسائیوں کے یہاں بوقت عبادت صلیب کی رسیوں میں گرہیں باندھنا اور کھولنا کسی کو بپتسمہ دیتے وقت یعنی عیسائیت میں داخل کرتے وقت زرد رنگ کا پانی اس پر چھڑکنا خاکساری کے اخلاق کا مظاہرہ کرنے کے لئے پورے بدن کو خاک آلود کر لینا اور بھبوت ملنا، ترک دنیا (رہبانیت) کرتے وقت مخصوص گیروا لباس اختیار کرنا اور سر منڈانے کی رسم ادا کرنا۔ تواضع اور عبدیت کی صورت بنانے کے لئے گھر گھر اور دکان دکان بھیک مانگنا نکاح کے سلسلہ میں زوجین کو باہم باندھنے کے لئے ایک دوسرے کے دامن کو کپڑے کی گرہ سے باندھ دینا وغیرہ سب وہی حسی اور مظاہرہ آمیز رسوم ہیں جن کے اندر علمی روح اور اصولی طاقت بطور حجت کے سمائی ہوئی نہیں، صرف اگلوں کے عمل کی رسوم ہیں، جنہیں محض اگلوں کی تقلید سمجھ کر برتا جا رہا ہے۔ جس سے واضح ہوتا ہے کہ ان اقوام میں احکام کا مدار علل کلیہ اور حقائق علمیہ پر نہیں بلکہ تقلید آبائی اور رسوم پرستی ہے گویا مذہب کی پہچان ہی علمی دلائل نہیں، عملی رسوم ہیں، خواہ بے دلیل ہوں یا خلاف دلیل۔

شعائر مذہب

پھر مذہب ہی نہیں ان مذاہب میں مذہبی انسانی کی علامتیں بھی رسوم و نقوش ہی کی صورت میں دکھائی دیتی ہیں، جو افراد مذہب سے لگی رہتی ہیں اور ان ہی سے وہ اس کے افراد سمجھے جاتے ہیں۔ جیسے عیسائیت کے لئے صلیب کا نشان گلے میں ہونا

شعار دین اور عیسائیت کی امتیازی علامت ہے۔ ہندو کے لیے زنار گلے میں اور قشقہ پیشانی پر اس کے دھرمی ہونے کی علامت ہے یا سکھ کے لیے کڑا ہاتھ میں کرپان گلے میں، کنگھا سر میں اور بال پورے بدن پر اس کے مذہبی ہونے کا نشان کہا جاتا ہے۔ جس سے واضح ہوتا ہے کہ یہ علمی امتیں نہیں کہ علم و استدلال سے انہیں یا ان کے مذہب کو پہچانا جائے بلکہ رسمی قومیں ہیں، جن کا تعارف مخصوص حسّی رسم و رواج اور محسوس قسم کے جسمانی نشانات سے ہوتا ہے۔

تصوّرِ معبود

محسوس پرستی اور رسم پرستی کی حد ہے کہ یہ اقوام معبود کو بھی بلا کسی رسمی صورت کے نہیں پہچان سکتیں اور ان کی عبادت کا بھی اس وقت تک تحقق نہیں ہوتا، جب تک کہ معبود کسی مخصوص صورت میں ان کی آنکھوں کے سامنے نہ ہو۔ کسی قوم نے تو معبود کا پیکر، پتھر اور سونے چاندی وغیرہ کی مورتیوں کو قرار دیا، کسی نے گائے، بھینس، بیل وغیرہ کی صورتوں کو، کسی نے روشنی اور آگ کو کسی نے پانی اور دریا کو، کسی نے درخت اور پھول پتوں کو کسی نے سورج اور چاند ستاروں کو کسی نے اعضاء انسانی کو، کسی نے ذرائع آمدنی اور وسائل زر کو اور کسی نے آلاتِ صنعت و حرفت کو سمجھا جن کی پرستش مذہب کہلائی۔ غرض کوئی نہ کوئی حسی صورت جب تک ان کی نگاہ کے سامنے نہ آجائے۔ وہ معبود حقیقی کو جان بھی نہیں سکتے تھے۔

یہود کی اس حس پرستی کا جذبہ جب انتہا کو پہنچ گیا تو اس کی تسکین اسوقت تک نہ ہوئی۔ جب تک کہ خدا کو بھی آنکھوں سے دیکھنے کی فرمائش نہ کر لی۔ چنانچہ فرعون سے نجات پاکر بنی اسرائیل کا جب صنعاریین سے گزر ہوا اور وہاں پیتل کی مورتیاں بجتی دیکھیں تو چلا اُٹھے۔

یاموسیٰ اجعل لنا اِلٰها کما لهم الٰهة	اے موسیٰ ہمیں بھی ایسا ہی (مصور) خدا دیجئے، جیسا ان کے پاس ہے۔

اور آخر کار اپنی اس محسوس پسندی کے جذبہ سے مغلوب ہو کر صاف ہی پکار اُٹھے۔

لَن نُؤمِنَ لَكَ حَتّٰى نَرَى اللّٰهَ جَهۡرَةً — ہم تم پر (اے موسیٰ) ہرگز ایمان نہ لائیں گے جب تک خدا کو کھلی آنکھوں سے نہ دیکھ لیں۔

نصاریٰ نے اس حس پسندی اور رسم پسندی سے مغلوب ہو کر ایک (جسم والا خدا) مانا جو ان کے یہاں حضرت مسیح علیہ السلام ہیں، کیونکہ محسوسات کے خوگر انسانوں کو کوئی چیز بھی آنکھوں سے نظر نہیں آسکتی۔

شرائع مذہب

غرض مجموعی طور پر پرانے منہاج اور سابقہ شریعتیں اپنے تمام اجزا رسمیت زیادہ تر حسیاتی اور رسومی انداز کی ہوتی تھیں، جس میں عقیدۂ عمل کی چند بندھی بڑی رسمیں سامنے ہوتیں تھیں، جنہیں عوام بہ سہولت اختیار کر کے اپنے کو پیر و مذہب باور کرتے تھے اگر ان رسوم کو ترک کر دیا جائے تو ان اقوام کی مذہبی عرفیت مضمحل اور ان کی پہچان بے نشان ہو کر رہ جائے کیونکہ مدار مذہب فقہ و بصیرت، حجت و برہان، استدلال و بیان اور احکام کی علمی اور اصولی علتوں کی تحقیق و تنقیح پر نہیں، بلکہ صرف ان رسوم اور ظاہری علامات کے پابند ہو جانے پر ہے، جن کو بطور علامت اپنا لینے ہی سے آدمی دھرمی ہو جاتا ہے اور اُسے کسی فقہ نفس یا دلیل یا ذوق و وجدان کی ضرورت نہیں پڑتی کہ ان رسوم کی صحت و سقم کو سمجھے یا سمجھا سکے اور واقعہ بھی یہی ہے کہ حسی جزئیات میں صرف بصر کی ضرورت پڑتی ہے، بصیرت کی نہیں، اس لئے جب تک یہ رسوم انبیاء یا اُن کے خلفاً کی موجودگی میں اپنی معنویت کے ساتھ باقی رہتی تھیں، ہدایت کا ذریعہ بنی رہتی تھیں، لیکن انبیاء کی عدم موجودگی یا اُن کے اولین جانشینوں کے اُٹھ جانے کے بعد یہ رسمیں رسوم بے حقیقت بن کر رواج محض رہ جاتی تھیں جن میں نہ روح ہوتی تھی، نہ حقیقت اور نتیجہ یہ نکلتا تھا کہ یہ بے روح دین ختم ہو جاتا تھا اور نئے دین کی داغ بیل پڑ جاتی تھی۔

خوارق مذہب

پھر اسی طرح ان اقوام کی حس پسند ذہنیت کے مناسب دین کی اعجازی حجت اور نبوت کی دلیل یعنی خوارق و معجزات بھی صرف عملی اور حسی ہی دیئے جاتے تھے۔ جن کو آنکھوں سے دیکھ کر ہی یہ اقوام تسلی پاتی تھیں اور متبع پیغمبرین کر دین کی راہ لگی رہتی تھیں۔ جیسے عصار موسیٰ، ید بیضا، احیار عیسیٰ، نار خلیل، ناقۂ صالح، قمیص یوسف، ظلہ شعیب، جرّ العرش سلیمان وغیرہ سب آنکھوں ہی سے دیکھنے کے معجزات ہیں، جو عملی تھے، علمی نہیں اور عملی باتیں عامل کی ذات اور شخصیت تک ہی قائم رہتی ہیں، جب عامل رخصت ہوتا ہے تو وہ بھی رخصت ہو جاتی ہیں۔ اس لئے یہ عملی معجزے دکھانے والی مقدس ہستیاں جب اُٹھ گئیں تو ان کے یہ عملی معجزات بھی ختم ہو گئے اور دلیل نبوت گم ہو گئی جس کے سہارے یہ نبوت قوم بہ قوم اور ملک بہ ملک آگے نہ چلی اور اس کا قدرتی نتیجہ یہی ہوا اور ہونا تھا کہ یہ گمشدہ دلیل کی نبوت آنے والی نسلوں کے لئے براہِ راست حجت اور واجب الاتباع باقی نہیں رہتی تھی۔

حاصل یہ نکلا کہ اگلے مذاہب کے سلسلہ میں احکام اور حجتوں کو لو تو وہ حجتیں سب شخصیاتی اور رسمی قسم کی ہوتی تھیں۔ جن کا دارو مدار شخصیتوں پر ہوتا تھا، اصول کلیہ پر نہیں اس لئے شخصیتوں کے اُٹھ جانے سے جب ان کا عملی نمونہ سامنے نہ رہتا تھا تو شریعت کی صورت بھی بحالہ قائم نہ رہتی تھی، محض رسوم و رواج اور ان کی بھی نقل در نقل رہ جاتی تھی، جس میں روح مذہب تو بجائے خود ہے، صورت عملی بھی صحیح باقی نہ رہتی تھی، اس لئے یہ بے روح اور متغیّر شریعت آخر کار گم ہو کر نئی شریعت کے لئے جگہ خالی کر دیتی تھی، ادھر معجزات کو لو جو دلیل نبوت اور دلیل شریعت ہے تو وہ بھی عملی ہوتا تھا۔ اس لیے یہ عملی کرامت بھی جوں ہی صاحب عمل کی ذات کے ساتھ اٹھ جاتی تھی تو دلیل نبوت باقی نہ رہتی تھی جسے پیش کر کے وہ نبوت اور اس کی شریعت منوائی جا سکے۔ اس لئے دونوں صورتوں میں نتیجہ یہی نکلتا تھا کہ مذہب و شریعت آگے نہ بڑھ سکے اور ختم ہو کر دوسرے

کسی زندہ مذہب کیلئے جگہ خالی کر دے۔ جس کا خلاصہ دوسرے لفظوں میں وہی نکل آیا کہ ستاروں کی طرح انبیاء سابقین کی روشنیاں خود ان کی ذوات تھیں، خواہ بلحاظ احکام و عمل دیکھا جائے یا بلحاظ معجزہ کرامت یعنی دین کی صورت اور اس کی حجت سب شخصیاتی اور رسومی انداز کی تھی، اس لئے ان حضرات سے صرف ان کا قریبی ماحول تو روشن ہو جاتا تھا اور ان کے وہ مخصوص وابستگان ملک و قوم جو شخصیت سے قریب ہوتے تھے ان میں نور ایمان اور گرمی اخلاق حاصل کر لیتے تھے، لیکن دوسری اقوام کو ان سے کوئی سروکار نہ ہوتا تھا۔ اس لئے نہ ان کا پیغام ہمہ گیر ہوتا تھا نہ ان کی توجہ و تصرف اور تربیت عام ہوتی تھی اور نہ شریعت ہی عالم گیر اور بین الاقوامی ہوتی تھی، جو عالم کو اپنی لپیٹ میں لے۔ اسی حقیقت کو لسانِ نبوت پر فرمایا گیا۔

کان النبیُّ یبعث اِلیٰ قومہٖ خاصّۃً وبعثت اِلیٰ الناس کافّۃً	ہر نبی اپنی قوم کی طرف بھیجا جاتا تھا (گویا اس کی دعوت قومی اور مقامی ہوتی تھی) اور میں سارے انسانوں کی طرف (بین الاقوامی دعوت دیکر) بھیجا گیا ہوں۔

پس ان نجوم ہدایت (انبیاء علیہم السلام) کی مثال وبالنجم ھم یھتدون ؕ کی سی تھی کہ ستاروں کی طرح خود علاماتِ ہدایت تھے، لیکن ان سے پھیلنے والی کوئی عمومی اور کلی روشنی نہ تھی، جو وقت کی پوری دنیا کو اپنے ہمہ گیر دائرہ میں لے سکتی، چہ جائیکہ وہ قیامت تک آنے والوں کے لئے حجت ہوتی، اس لئے ہدائت کا تعلق صرف ان کے ذاتی اسوے سے ہوتا تھا نہ کہ اصولی اور کلی روشنی سے اور یہی اسوے یا مخصوص رسوم عمل بذیل کتاب منضبط کر کے انہیں دے دی جاتی تھیں، جو بمنزلہ ایک یادداشت کے ہوتی تھیں۔ نہ بمنزلہ ایک قانون کلی یا دوامی دستور العمل کے۔ اس طرح اصلاح باطن کے سلسلہ میں نفس امارہ اور شیطانی وساوس کا مقابلہ ان کے تصرفات اور کرامات سے ہوتا تھا، جو ذوات کے ساتھ وابستہ ہوتی تھیں، گویا ستاروں اور شہاب ثاقب کی طرح ان کی ذوات ہی خود شیاطین پر پھینک ماری جاتی تھیں، جس سے شیطانی وسواس کا تار پود

بکھر جاتا تھا۔ گو علمی یا استدلالی قوت دفع وساوس اور رفع مکائد کی نہیں ہوتی تھی جو اصولی طور پر ہمیشہ دنیا کے لئے اس باب میں کار آمد ثابت ہوتی۔ اس لئے ان نجوم ہدایت کے یہ مذاہب جزئیاتی اور محدود ہوتے تھے۔ جیسے ستاروں کی روشنی جزوی اور محدود ہے۔

لیکن آفتاب نبوت یعنی حضرت خاتم المرسلین علیہ افضل الصلوٰۃ والتسلیم کو جو نور دیا گیا ہے۔ وہ رسمی یا علاماتی انداز کا نہیں، جو عملی رسوم تک محدود ہو بلکہ علمی اور برہانی اور بیانی اور تبیانی ہے۔ جس میں ہر عمل ایک خاص علم اور اصولی حجت کے تابع ہے ہر حکم میں حکمت اور امر میں کوئی نہ کوئی اصولی علت ہے۔ احکام دین رسمی اور رواجی صورتوں کے نہیں، جو شکل محض اور ہیئت خالص ہوں، جنکا مقصد نفس کو محض کسی ڈگر پر لگائے رکھنا یا زیادہ سے زیادہ نفس کشی اور ترک لذات کے ساتھ کوئی اندرونی دھیان وگیان اور استغراق ہو۔ جس کا نظام اجتماعی سے کوئی تعلق نہیں، چنانچہ اس دنیا میں مسلم چند رسوم یا مخصوص قسم کی چند ظاہر علامتوں سے مسلم نہیں کہلاتا بلکہ تحقیق واستدلال اور عقیدۂ ومعرفت سے پیدا شدہ ہیئت وعمل سے مسلم کہلاتا ہے۔ جس کے لئے وہ حجت و دلیل اور بصیرت لئے ہوئے ہوتا ہے۔ وعلیٰ بصیرۃ انا ومن اتبعنی ۔ میں اور میرے پیروکار بصیرت پر ہیں۔ (کہ حقیقت کو سمجھ کر نمونۂ عمل کو قبول کرتے ہیں۔ جن کے یہاں اصل حجت ہے۔ رسم نہیں) اور اس لئے اس کے اسلام کو پہچاننے کے لئے کچھ خاص بندھی جڑی رسمیں نہیں رکھی گئیں، جنہیں اس سے لگا ہوا دیکھ کر اس کے اسلام کو باور کر لیا جائے اور جب وہ اس کے ہاتھ پیر پیشانی یا گلے میں نہ رہیں تو وہ مسلم نہ سمجھا جائے، بلکہ اسکا عقیدہ وعمل اور اس کی بصیرت ومعرفت اس کی پیشانی کا نور اور اسکا طریق عمل طرز سلام وکلام انداز عمل طرز اخلاق وغیرہ اس کے دین پر گواہ ہوتے ہیں، جس سے اسکا مسلم ہونا معلوم ہوتا ہے اور نہ صرف مجموعۂ دین بلکہ دین کی جزئی جزئی حجت و دلیل اور علمی قوت اس کی پشت پر ہوتی ہے۔ جس سے اسکا دین قائم اور متعارف رہتا ہے، نہ کہ رسم ورواج اور نمائشی علامات۔

جس کی وجہ وہی ہے کہ اس کے مقتدائے اعظم نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا دین و مذہب حقیقت اور عقل و بصیرت کے پیرایہ میں دیا گیا ہے، حتیٰ کہ آپ کا سب سے بڑا اور خصوصی معجزہ ہی علمی تھا جو قرآنِ حکیم کی صورت میں آج بھی اسی معجزانہ شان کے ساتھ موجود ہے۔ لیکن یہ معجزہ کوئی لاٹھی یا چمکتا ہوا ہاتھ نہیں ہے جسے دشمن پر پھینک مارا جائے یا وہ کوئی آگ برسانے والا سائبان نہیں کہ منکروں کو اس کے نیچے پہنچا کر بھسم کر دیا جائے یا وہ کوئی تیز و تند آندھی نہیں کہ اس سے معاند قوموں کو اڑا کر پچھاڑ دیا جائے یا وہ کوئی صیحہ چنگھاڑ نہیں۔ ——— جس سے دشمنانِ حق کے کلیجے شق کر دیئے جائیں کہ اس سے نہ تو اس کے مسائل کی معقولیت ہی ثابت ہو سکتی تھی اور نہ وہ معقول پسند اقوام کے لئے پیغام ہی بن سکتا تھا۔ بلکہ اس کی اعجازی شان دلائل قاہرہ تسکین دہ اسلوب بیان فطرت کے شواہد و نظائر اور فطرتوں کو اپیل کرنے والی اعجازی حجتیں ہیں۔ جن سے معاندوں کے بدن نہیں، دل و دماغ پچھڑ جاتے ہیں ان کی زبانیں اگر عناد کے سبب نہ بھی مانیں تو ان کے ضمیر ماننے کو تیار ہو جاتے ہیں۔ جس سے انسانی ذہنیتوں میں انقلاب بپا ہو جاتا ہے گویا اس علمی معجزے کے ذریعہ اقوام فنا نہیں کی جاتیں۔ بلکہ رام کی جاتی ہیں۔ ماری نہیں جاتیں۔ بلکہ زندہ کی جاتی ہیں۔ یعنی اسکا اعجاز موت کی صورت میں ظاہر نہیں ہوتا بلکہ حیات کی صورت میں نمایاں ہوتا ہے۔ وہ آیاتِ تخویف میں سے نہیں ہے بلکہ آیاتِ تبشیر میں سے ہے۔

ان ھٰذا القرآن یھدی للتی	تحقیق یہ قرآن اس راستہ کی ہدایت کرتا
ھی اقوم ویُبشر المؤمنین الذین	ہے جو سیدھا ہے اور ان مسلمانوں کو
یعملون الصٰلحٰت اَنّ لھم	بہت بڑے اجر کی بشارت دیتا ہے
اجراً کبیراً ؕ	جو عمل صالح کرتے ہیں۔

آج بھی یہ علمی معجزات بلاکم و کاست اسی اعجازی شان کے ساتھ بدستور قائم ہے۔ اگرچہ معجزہ کہلانے والی مقدس ذات نگاہوں سے اوجھل ہے کیونکہ علم عالم کے اوجھل ہو جانے سے مٹ نہیں سکتا۔ جیسا کہ عمل عامل کے اُٹھ جانے سے ختم ہو

جاتا تھا۔ اگر قرآن کوئی عملی معجزہ ہوتا تو حضور کے بعد آج سامنے نہیں آسکتا تھا اور جب یہ دوامی معجزہ بدستور قائم ہے تو دین کی حجت بھی بدستور قائم ہے۔ جس سے قرآنی نبوت پر آج بھی دلیل لائی جاسکتی ہے اور قیامت تک لائی جاسکے گی۔ اس لئے نہ حجت مٹ سکتی ہے نہ دین جو اس کا دعویٰ ہے۔ پس اس دین کی بنیاد رسم و رسوم اور رواجی انداز کی باتوں یا ظاہر داری کی علامتوں پر نہیں، بلکہ قدرتی حقیقتوں اور فطری بصیرت پر ہے۔

علیٰ بصیرۃٍ انا ومن اتبعنی ؕ — میں اور میرے پیروکار بصیرت پر ہیں، پاک
سبحان اللہ وما انا من المشرکین ؕ — ہے اللہ اور میں مشرکین میں سے نہیں ہوں۔

بلکہ یہاں پیغمبر کی ذات اور پیغمبرانہ خصوصیات اقتدار سے بالاتر ہیں۔ وہ اپنی جگہ ایک عظیم ترین منارہ روشنی ہے۔ لیکن خود اس پر نگاہیں نہیں ٹھہر سکتیں کہ ان خصوصیات کو دیکھ دیکھ کر ان کی اقتدار کی جائے، بلکہ یہاں اس آفتابِ نبوت سے چھنتی ہوئی روشنی ہی دنیا کی رہنمائی کے لئے رکھی گئی ہے۔ جس کا نام شریعت اور قانون ہے۔ پس جیسے عین آفتاب کو دیکھ دیکھ کر راستہ معلوم نہیں کیا جاتا، بلکہ اس کی روشنی میں رہروی کی جاتی ہے۔ بشرطیکہ آفتاب کو نگاہ بھر کر دیکھنے کی جرأت نہ کی جائے، ایسے ہی یہاں آفتابِ نبوت کی خصوصی زندگی اتنی ارفع و اعلیٰ اور عزیمتوں کا اتنا تیز نور لئے ہوئے ہے کہ اس کی طرف نگاہ اُٹھا کر دیکھنا بھی نگاہوں سے ہاتھ اُٹھا لینا بلکہ رہروی سے ہاتھ دھو لینا ہے۔ چنانچہ خصوصیات نبوی اقتدار کے لئے نہیں رکھی گئیں اور نہ ہی اقتدار کسی کے بس کی بات ہے کہ انہیں دستور زندگی بنایا جاسکے۔ اکمل اولیاء اور خواص صحابہ بھی اس کا حوصلہ نہیں کرسکتے۔ تا بصلحاچہ رسد؟ ہاں صرف آفتابِ نبوت سے چھننے والی روشنی یعنی عام شریعت اور اسکا توسعات لئے ہوئے عمومی دستور ہی دنیا کے لئے پیغام اور راہ نما ہے۔ جس سے انسانیت کبریٰ کی تکمیل وابستہ ہے۔

غرض ستارہ ہائے نبوت اور آفتابِ نبوت میں یہی فرق ہے کہ نجوم نبوت (انبیائے سابقینؑ) کی شخصیتیں اور ان کے شخصی افعال دین کی علامات تھے۔ جو ہدایت

بخش تھے۔ اسلئے جب تک وہ سامنے رہتے تھے ہدایت ملتی تھی جب او جھل ہو جاتے تھے تو ہدایت ختم ہو جاتی تھی جو ستاروں کی شان ہے کہ سامنے رہو تو رہنمائی ممکن، سامنے سے ہٹ جاؤ تو رہنمائی ناممکن، سابقہ شریعتوں میں گویا ہدایت پانے کا تعلق معنویات سے زیادہ حسیات سے تھا کیونکہ ذات اور خصائص ذات دیکھنے ہی کی چیزیں ہیں لیکن آفتاب نبوت کی روشنی سے منور ہونے کیلئے آفتاب کا سامنے رہنا ضروری نہیں، بلکہ اگر ہے تو اس کی ذات اور ذاتیات کو سامنے نہ رکھنا ضروری ہے کہ یہاں خصوصیات نبوی اقتدار سے بالاتر ہیں، اس سے پھیلنے والی روشنی جو علمی رنگ میں پھیلی ہادی بنادی گئی ہے جو ہر کس و ناکس کے لئے پیغام ہے۔ آنکھوں سے دیکھنے کی چیز نہیں سمجھنے کی چیز ہے۔ اسلئے یہاں ہدایت پانے کا راستہ حسیات سے زیادہ معنویات ہیں، صورتوں اور اسموں کے بجائے حقائق و معارف ہیں، جن کے لئے بصارت سے زیادہ نور بصیرت کی ضرورت ہے۔ یہ الگ بات ہے کہ امت کی کامل رہنمائی کے لئے ان تمام شرعی لطائف کو عملی خود ہی کر کے دکھلایا جسکا نام اسوہ حسنہ ہے تاکہ عمل کی صورتیں ہر ایک کی خودساختہ نہ ہو جائیں، جس سے امت میں تشتت ہو اور پراگندگی پھیلے۔ لیکن یہ اسوے اور عملی نمونے بھی رسوم محض نہیں۔ جنہیں حقیقت نے وجود نہ بخشا ہو، بلکہ ان کے نیچے معقول اصول و کلیات اور علوم و اسرار چھپے ہوئے ہیں، جن سے عمل کی ان مخصوص شکلوں کا وجود قائم ہے۔ وہ خود بھی عقل و بصیرت اور قوت واستنباط کے لئے ایک مستقل دعوت ہیں، چنانچہ جس طرح قولی حدیثوں سے مجتہدین اور علمائے راسخین فی العلم نے مسائل کا استنباط کیا ہے۔ ایسے ہی فعلی حدیثوں سے بھی اسی قدر علوم و مسائل کا استخراج کیا ہے، اس لئے یہ مخصوص شکلیں اور عمل کے یہ خاص ڈھانچے اگر کسی وقت بگڑنے لگتے ہیں تو وہی اندرونی روح اور اصول کی رہنمائی سامنے کر کے انہیں درست کر دیا جاتا ہے یہ نہیں کہ شخصیتوں کے اُٹھ جانے کی وجہ سے یہ نمونہ ہائے عمل بھی کلی طور پر فنا ہو جائیں، بلکہ شخصیتوں کا بدل بعد کی شخصیتوں کے ساتھ اصول و قوانین، حجج و براہین اور اصولی طرق واستقامت ہیں، جن کے ذریعہ عملی نمونوں

میں پیدا شدہ بگاڑ دور کیا جا سکتا ہے اور کیا جا رہا ہے۔

بہر حال اور شریعتیں اپنی عبادات، علامات اور معجزات کے لحاظ سے علاماتی تھیں جن میں حسی نشانوں کا آنکھوں کے سامنے رکھا جانا ضروری تھا۔ ورنہ نہ ماننے والوں کے نفوس کو تسلی و اطمینان نہیں ہو سکتا تھا اور آفتابِ نبوت کی یہ آخری اور کامل شریعت حقیقی اور تحقیقی ہے۔ جس میں حسیات کی کوئی اہمیت نہیں کیونکہ وہ چند گنی چنی رسموں کا مجموعہ نہیں، بلکہ حقائق و بصائر اور حجت و برہان کا مجموعہ ہے۔ جس میں نگاہ کی بجائے عقل و فہم اور ذوق و بصیرت کی ضرورت ہے۔ پس وہاں حس و بصر اصل تھا اور یہاں فکر و نظر اصل ہے اس لئے دوسری قومیں جب بھی اپنے مقتدیانِ اول کی ذوات اور ان کی عملی رسوم یا رواجی شکلوں کو گم کر دیتی ہیں۔ (درانحالیکہ مقتدا اوّل کے اٹھ جانے سے ان کا گم ہو جانا قدرتی تھا کہ عمل عامل کے اٹھ جانے سے اٹھ جاتا ہے) جب ہی دین ودھرم گم ہو جاتا تھا اور مستقبل کے لئے وہ صرف کہانیوں کہاوتوں اور رواجوں کی صورت میں بے حجت اور غیر مستند طریقہ سے نام نہاد باقی رہ جاتا تھا۔ جس میں حقیقت نہ ہوتی تھی اور یہاں امتِ مسلمہ اگر آفتابِ نبوت سے اوٹ میں آگئی تو آفتابِ نبوت کے علوم و آثار سے کسی وقت بھی اوٹ میں نہیں آسکتی کہ دین کے ختم ہونیکی نوبت آجائے۔ کیونکہ علوم و اصول عالم کے اٹھ جانے سے نہیں اٹھ سکتے۔ وہ آج بھی اپنی کلی اور اصولی شکلوں کیساتھ محفوظ ہیں۔ اگر اس کی جزوی صورت میں کوئی بدفہم تجدد پسند فرق بھی کر دے تو اس کی باطنی حقیقت اور اصولی علت جس نے یہ صورت بخشی تھی، پھر اس صورت کو درست کر لیتی ہے۔ جیسا کہ جڑ اپنی خراب شدہ شاخ کو یا روح اپنے زخم خوردہ حصہ بدن کو خود درست کر لیتی ہے اور اس طرح یہ آخری دین اپنی پوری حقیقت و صورت کے ساتھ بدستور قائم اور محفوظ ہے۔

اس سے صاف واضح ہے کہ نورپاشی کا کام محض آفتاب کی ذات ہی نہیں کرتی بلکہ اس کے آثار بھی کرتے ہیں جس کا نام چمک اور روشنی ہے۔ اس لئے قرآن کریم نے ستاروں کی نوذوات کو ہادی کہا ہے۔ وبالنجم ھم یھتدون۔ چاند ان سے ذرا زیادہ روشن

تھا کہ اس کی نورانی چاندنی بھی پھیلتی تھی گو رات کو دن نہ بنا سکتی تھی تو اسے نور کہا والقمر نورا
مگر سورج کی چمک اور دمک جبکہ خود سورج کی طرح فعال اور ضیا بخش تھی تو سورج کیساتھ
اس کی روشنی کو بھی اس کی ذات کے ہم پلہ دکھلاتے ہوئے مساوات کے ساتھ ذکر فرمایا
تاکہ واضح ہو جائے کہ سورج خود ہی شب زدائی کا کام نہیں کرتا بلکہ اس کے آثار بھی وہی کام
کرتے ہیں، چنانچہ سورج کے ساتھ اس کی چمک کی بھی قسم کھاتے ہوئے مساوی انداز
میں ذکر فرمایا۔ ارشاد ہوا کہ

وَالشَّمْسِ وَضُحٰهَا (اور فرمایا گیا) قسم ہے سورج کی اور اس کی روشنی کی (اور
هُوَ الَّذِي جَعَلَ الشَّمْسَ ضِيَاءً فرمایا) اللہ وہ ذات ہے جس نے سورج
بنایا اور اس کی چمک بنائی۔

ظاہر ہے کہ ستاروں میں یہ ضحیٰ یا پھیلنے والی چمک نہیں ہوتی بلکہ صرف ان کے روشن
اجسام ہی بہ قدر طاقت اجالا کرتے ہیں اور اسی لئے سورج کا لقب سراج (چراغ) رکھا گیا
کہ اس کی ایک لو ہی کام نہیں کرتی بلکہ لو سے پھیلنے والی روشنی اور روشنی سے نکلنے والی چمک
بھی کام کرتی ہے، یعنی چراغ اپنی جگہ قائم رہتا ہے، مگر اس سے پھوٹنے والی روشنی اور چمک
پورے مکان پر قبضہ کئے رہتی ہے۔ جس سے وہ بھی فائدہ اٹھاتے ہیں، جو عین چراغ
کے سامنے نہیں ہوتے۔ پس ستاروں کی محض ذوات ہادی ہوئیں۔ چاند کا نور ہادی ہوا مگر
ضعف کے ساتھ اور سورج کے ساتھ اس کی ضحیٰ (روشنی) بھی ہادی ہوئی اور ضیاء (چمک)
بھی ہادی ہوئی اور سراجیت ——— ہونیوالی روشنی بھی ہادی ہوئی جس سے
تمام ستاروں میں اس کی ممتاز شان نور بخشی کھل جاتی ہے اور واضح ہو جاتا ہے کہ انبیائے
سابقین نجوم ہدایت تھے جن کی ذوات سے دنیا روشن ہوئی تھی لیکن ذوات کے سامنے
نہ رہنے سے روشنی ختم ہو جاتی تھی کہ ذوات کے ساتھ پھیلنے والے روشن آثار نہ تھے۔
جو ذات کے اوجھل ہو جانے پر بھی ضیا پاشی کرتے ہیں، لیکن آفتاب نبوت کے آثار بھی
روشنی بخش ہیں۔ جیسے خود ذات روشنی بخش ہے اور ذات کے سامنے نہ رہنے پر
بھی اس کی نورانی آثار ذات ہی کا سا کام کرتے ہیں، چنانچہ اس کی صبح صادق کے طلوع

ہوتے ہی رات غائب ہو جاتی ہے، حالانکہ سورج سامنے نہیں آتا مگر اس کی روشنی کے کمالات جو اس سے منفصل ہو کر عالم میں پھیلتے ہیں، روشنی اور رہنمائی کا کام ذات ہی طرح کرتے ہیں، بخلاف ستاروں کے کہ ان کی کوئی صبح صادق ہوتی ہے، نہ شفق ابھرتی ہے۔ وہ خود ہی طلوع ہو جاتے ہیں۔

خلاصہ یہ ہے کہ سراج منیر کی بلیغ تشبیہ ہم نے اولاً دلوں کی زمین میں پھیلی ہوئی تاریکی کو سمجھا، پھر آفتاب کے آثار طلوع یعنی اس کی چمکتی ہوئی صبح صادق سے تعارف حاصل کیا، پھر شفق احمر اور اس کی آب و تاب کو سمجھا، پھر مطلع آفتاب نبوت کو پہچانا، پھر آفتاب کے تدریجی ظہور و عروج کو سمجھا اور پھر اس کی ضیا پاشی کی رفتار اور تدریجی آثار کو دیکھا اور پھر تمام ستارگان ہدایت کے مقابلہ میں اس کی امتیازی روشنی کو دیکھا، پھر ان انوار کا ناحال موجود رہ کر نور آفتاب میں مدغم ہو جانے کو سمجھا، پھر ان کی روشنی کے جزوی اور آفتاب نبوت کے کلی اور جامع ہونے کو سمجھا اور اس طرح ہم اس تشبیہ قرآنی کی دلالت کی روشنی میں سیرت نبوت کے ابتدائی مگر جامع مقامات سے روشناس ہو گئے یعنی مادی آفتاب کے نقشہ سے روحانی آفتاب کے طلوع، آثار طلوع، اسباب طلوع، نوعیت طلوع اور خود آفتاب کی نوعیت کا مکمل نقشہ ہمارے سامنے آگیا۔ اب وقت آگیا کہ ہم اس بلیغ تشبیہ کی روشنی میں ان ممتاز مقاصد طلوع کو بھی سمجھیں اور آفتاب نبوت سے صادر شدہ ان مخصوص اوصاف و کمالات کے دقیق گوشوں تک پہنچیں، جو عام نجوم ہدایت میں نظر نہیں آتے، بلکہ صرف آفتاب نبوت ہی کی خصوصیات سمجھے گئے ہیں، بلکہ انہی کے پرتو سے تمام نجوم ہدایت میں روشنی پہنچی ہے۔ شرعی اصطلاح میں نبوت کے ان ہی امتیازی انتہائی اور مصدریت کے کمالات کے مجموعہ کا نام ختم نبوت ہے۔

ختم نبوت

سو اس سے یوں سمجھئے کہ جس طرح آفتاب کی سب سے بڑی امتیازی شان اور سب سے اونچی خصوصیت فقط یہی نہیں کہ وہ بڑی روشنی والا ہے، جو اور ستاروں سے نہیں بالی

جاتی، بلکہ یہ ہے کہ وہ روشنیوں کا منتہا اور دوسرے ستاروں کے حق میں روشنی بخش ہے، جس سے اور ستاروں میں روشنی آتی اور اسی کے دم سے قائم رہتی ہے۔ یعنی آفتاب کا کمال محض روشن ہونا یا سب ستاروں سے زیادہ نورانی ہونا نہیں بلکہ ان سب نور کی اصل ہونا ہے۔ کہ اور سب اپنے نور میں آفتاب کے محتاج ہیں اور خود آفتاب اپنے نور میں کسی کا محتاج نہیں کہ اس کا نور خود اپنا ہے اور باقی ستاروں کا نور خود ان کا اپنا نہیں، بلکہ آفتاب سے ماخوذ ہے۔ چنانچہ ماہرین ہیئت اور فلاسفہ کے نزدیک آفتاب کے سوا تمام ستاروں کا بڑا کمال صرف جسم کی صفائی اور شفافی ہے کہ نور قبول کر سکیں، خود اپنی ذات سے نورانی ہونا نہیں، پس اصل میں نورانی آفتاب ہے۔ اس کے فیض سے یہ سارے ستارے بھی اس کی محاذات میں آ کر نورانی ہو جاتے ہیں، خواہ حجم وضخامت میں کوئی ستارہ آفتاب سے بڑا بھی ہو، جیسا کہ موجودہ سائنسدانوں کا دعویٰ بھی ہے کہ بے شمار ستارے ہیں جو حجم وضخامت میں آفتاب سے کہیں بڑے ہیں، مگر نور میں بڑا کوئی نہیں، جبکہ کسی ستارہ کا نور ہی خود اپنا نہیں، بلکہ آفتاب سے لیا ہوا ہے۔ پس آفتاب تمام ستاروں کے حق میں مربی اور مصدر فیض نکلتا ہے، اس لئے آفتاب کا امتیاز محض نورانی ہونا نہیں بلکہ نورانیت کی اصل ہونا نکلتا ہے۔

بنابریں یہ سمجھنا غیر معقول نہ ہوگا کہ سب انوار کی انتہا آفتاب پر ہو جاتی ہے۔ وہیں سے نور سب ستاروں کے لئے چلتا ہے، جبکہ وہ اس کے سامنے ہوں، خواہ اوپر ہوں یا نیچے اور حجم وضخامت میں بڑے ہوں یا چھوٹے اور سب میں ہوتا ہوا اسی طرف لوٹ آتا ہے۔

یہی شان کسی وصف کے خاتم کی ہوتی ہے کہ وہ وصف اسی سے چلے اور اسی پر لوٹ آئے۔ وہی فاتح ہو اور وہی خاتم ہو، وہی اس وصف کا مبدا ہو اور وہی منتہاء ہو، وہی اول ہو اور وہی آخر ہو۔ اس لئے اب ہم سورج کو محض نورانی نہیں کہیں گے، بلکہ نور بخش اور نور آفریں کہیں گے اور محض صاحب انوار نہیں کہیں گے، بلکہ خاتم الانوار کہیں گے، جبکہ سب ستاروں کو نور اس سے ملتا ہے اور اس نوری حرکت میں پھر اسی کی طرف عود کر آتا ہے پس سورج کی یہ خاتمیت انوار ہی درحقیقت اس کے سارے کمالات کا ممتاز عنوان ہوگا

جو اس کی امتیازی شان کو نمایاں کر سکے گا۔ نہ کہ مطلقاً نورانی ہونا کہ وہ قدر مشترک کے طور پر سب ستاروں میں درجہ بدرجہ پایا جاتا ہے۔ نیز محض نسبتاً دوسرے ستاروں سے نور میں زیادہ ہونا بھی اس کی کوئی آخری امتیازی شان نہ ہوگی کہ یہ نسبتی کمی بیشی بھی ستاروں میں موجود ہے جبکہ ہر ستارہ روشنی میں کسی ستارے سے بڑا اور کسی ستارے سے چھوٹا ہے۔ بلکہ اصل امتیازی خصوصیت وہی نور بخشی اور سب ستاروں کے نور کی اصل ہونا ہے۔

ٹھیک اسی طرح آفتاب نبوت (جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم) کی شان صرف نبی ہونا نہیں کہ یہ شان قدر مشترک کے طور پر ہر نبی میں موجود ہے۔ نیز ان تمام نجوم ہدایت (انبیاء علیہم السلام) سے کمالات نبوت میں محض اضافی طور پر کچھ زائد یا فائق ہونا بھی نہیں کہ یہ تفاضل اور فرق مراتب اور انبیاء میں بھی قائم ہے۔

تلك الرسل فضلنا بعضهم   یہ رسول ہیں، جن کو ہم نے بعض کو بعض پر
علٰی بعض ؕ   فضیلت دی ہے۔

بلکہ آپ کا اصل امتیازی وصف یہ ہے کہ آپ نور نبوت میں سب انبیاء کے مربی ان کے حق میں مصدر فیض اور ان کے انوار کمال کی اصل ہیں۔ اس لئے اصل میں نبی آپ ہیں۔ اور دوسرے انبیاء علیہم السلام اصل میں نہیں، بلکہ آپ کے فیض سے نبی ہوئے ہیں۔ ان مقدسین سابقین کا کمال درحقیقت ان کے جوہروں کی صفائی اور شفافی اور استعداد اور ان کی باطنی استعدادوں کا فطری کمال ہے کہ جوں ہی ان کے قلوب صافی اور ارواح طاہر کے سامنے آفتاب نبوت کا نورانی چہرہ آیا، انہوں نے اس کی ساری شعاعیں قبول کر لیں اور خود منور ہو کر دوسروں کو وہ روشنی پہنچانی شروع کر دی۔ پس آپ ان سب حضرات انبیاء کے حق میں مربی اور اصل نور ثابت ہوتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ آپ نے اپنے کو نبی الامت ہی نہیں بلکہ نبی الانبیاء بھی فرمایا ہے، جیسا کہ روایات حدیث میں مصرح ہے۔ پس جیسے آپ امت کے حق میں نبی امت ہونے کی وجہ سے مربی ہیں۔ ویسے ہی نبیوں کے حق میں بوجہ نبی انبیاء ہونے کے مربی ہیں۔ اب اگر جسم یا قد و قامت اور بدن کے ڈھانچہ میں کوئی نجم ہدایت آفتاب میں بڑا ہو یا چھوٹا تو اس سے آپ کے مربی عام ہونے میں کوئی فرق

نہیں پڑے گا، آخر عالم بشریت کے ابتدائی دور میں تمام انسان جن میں انبیاء کرام بھی شامل ہیں، حجم وضخامت اور قد و قامت میں مابعد کے زمانوں کے لحاظ سے یقیناً بڑے اور طویل و عریض ہوتے تھے۔ آدم علیہ السلام کا قد و قامت اپنے ہاتھ کی پیمائش سے سے ساٹھ ہاتھ لمبا اور سات ہاتھ چوڑا تھا۔ یہی حال نوح علیہ السلام اور حضرت ہود و صالح علیہما السلام کے قد و قامت کا تھا۔ سیر کی روایتوں میں ہے کہ اس دور کے بعض انبیاء کا جسم مبارک قبر کھلنے سے کھل گیا تو ان کی ناک کی پیمائش ایک گز نکلی۔ جیسے حسب تصریح اہل نجوم بہت سے ستارے حجم وضخامت میں آفتاب سے بڑے ہیں مگر فیض نور میں سب اس کے محتاج ہیں، ایسے ہی اگر بہت سے انبیاء علیہم السلام قد و قامت میں یا اپنی کسی جزوی خصوصیت میں حضور سے زیادہ ہوں تو اس سے نورِ نبوت میں حضور سے اسکا استغناء یا اُن کی بڑائی حضور پر ثابت نہیں ہوسکتی اور جب یہ صورت ہے تو حضور کی شان محض نبوت ہی نہیں نکلتی، بلکہ نبوت بخشی بھی نکلتی ہے کہ جو بھی نبوت کی استعداد پایا ہوا فرد آپ کے سامنے آگیا نبی ہوگیا اور اس طرح نورِ نبوت آپ ہی سے چلا اور آپ ہی پر لوٹ کر ختم ہوگیا اور یہی شان خاتم کی ہوتی ہے کہ اسی سے اس کے وصف خاص کی ابتداء بھی ہوتی ہے اور اسی پر انتہا بھی ہو جاتی ہے، اس لئے ہم آپ کو وصف نبوت کے لحاظ سے صرف نبی ہی نہیں کہیں گے بلکہ خاتم النبیین کہیں گے کہ آپ ہی پر تمام انوارِ نبوت کی انتہا ہے جس سے آپ منتہائے نبوت ہیں، آپ ہی سے نبوت چلتی ہے اور آخر کار آپ ہی پر عود کر آتی ہے۔ پس آفتاب کی تمثیل سے آفتاب نبوت، نبوت کا مبداء بھی ثابت ہوتا ہے اور منتہا بھی، نبوت میں اول بھی نکلتا ہے اور آخر بھی، فاتح بھی ثابت ہوتا ہے اور خاتم بھی، چنانچہ آپ نے اپنی نبوت کی اولیت کا ان الفاظ میں اعلان فرمایا کہ:-

کُنتُ نَبِیًّا وَّ اٰدمُ بینَ الرُّوحِ وَالجَسَدِ۔	میں نبی بن چکا تھا جب کہ آدم ابھی رُوح وجسم کے درمیان ہی میں تھے۔ (یعنی ان کا خمیر ہی کیا جارہا تھا اور ان کی تخلیق مکمل

بھی نہیں ہوئی تھی۔)

اور ادھر اپنی نبوت کی آخریت اور خاتمیت کا اس عنوان سے اعلان فرمایا کہ نبوت کو ایک قصر دکھلا کر اس کی آخری اینٹ اپنے کو ظاہر فرمایا۔ ارشاد ہے۔

فَانَا اللَّبِنَةُ وَاَنَا خَاتَمُ النَّبِیِّیْنَ — پس میں ہی وہ (آخری) اینٹ ہوں اور میں ہی خاتم النبیین ہوں۔

اور پھر نبوت کی اس اولیت و آخریت و خاتمیت کے ان دو متضاد پہلوؤں کو ایک ذات میں جمع کرنے کی صورت یہ فرمائی:۔

اَنَا اَوَّلُهُمْ خَلْقاً وَاٰخِرُهُمْ بَعْثاً ۔۔ — میں خلقت کے لحاظ سے سب سے پہلا ہوں اور بعثت کے لحاظ سے سب سے پچھلا۔

قرآن حکیم نے اس حقیقت کی تصدیق کرتے ہوئے آپ کو خاتم النبیین فرمایا۔ جس سے آپ کا منتہائے کمالات نبوت ہونا واضح ہے جو آپ کے مصدر نبوت ہونے کی کھلی دلیل ہے۔ ارشادِ ربانی ہے:۔

مَا کَانَ مُحَمَّدٌ اَبَا اَحَدٍ مِّنْ رِّجَالِکُمْ وَلٰکِنْ رَّسُوْلَ اللّٰهِ وَ خَاتَمَ النَّبِیّٖنَؕ — محمد صلی اللہ علیہ وسلم تم مردوں میں سے کسی کے باپ نہیں تھے۔ لیکن وہ اللہ کے رسول اور خاتم النبیین تھے۔

جس سے واضح ہے کہ آپ انبیاء کے حق میں بمنزلہ اصل کے ہیں اور انبیاء آپ کی نسبت سے بمنزلہ فرع کے ہیں کہ ان کا علم اور خلق آپ کے فیض سے ظہور پذیر ہوا۔ آپ کی یہ فیض رسانی اور سرچشمۂ کمالات نبوت ہونے کی امتیازی شان آغاز بشریت سے شروع ہوئی تو انتہائے کائنات تک جا پہنچی۔

چنانچہ عہد الست میں جب کہ ساری نوع بشری سے یہ سوال کیا گیا کہ اَلَسْتُ بِرَبِّکُمْ کیا میں تمہارا رب نہیں ہوں؟ تو سب ایک دوسرے کا منہ تکنے لگے۔ سب سے پہلے جس نے ہاں کہہ کر اقرار ربوبیت کیا وہ آنحضرت خاتم الانبیاء ہی کی ذات بابرکات تھی جن

کی صدائے حق سن کر سب نے بلیٰ کی آوازیں لگائیں کہ کیوں نہیں بیشک آپ ہمارے رب ہیں، جس سے واضح ہے کہ آغاز بشریت کے وقت حضور ہی عالم بشریت کے معلم اوّل اور اس کی معرفت ربوبیت کے مربی تھے۔ بالفاظ دیگر آپ ہی کی علمی رہنمائی سے سارے اولین و آخرین کی ایمانی استعدادیں کھل سکیں اور بروئے کار آگئیں۔ جن میں انبیاء علیہم السلام بھی شامل ہیں، پس یہ آپ کی پہلی تربیت اور بہ عنوانِ مختصر آپ کی پہلی شانِ قیادت وسیادت ہے۔ جو تعلیم وتربیت کے دائرہ میں کھلی اور آپ کی شان خاتمیت کا پہلا ظہور ہوا۔ ورنہ اگر یہ محض نبوت کا اثر ہوتا تو سارے انبیاء اک دم بلیٰ کے کلمہ سے بول اٹھتے اور آپ کے کلمہ کا انتظار نہ کرتے، لیکن سب کا سکوت اور آپ کا نطق آپ کے معلم اوّل اور مربی اوّل ہونے کی کھلی دلیل ہے جو محض نبوت کا اثر نہیں، بلکہ ختم نبوت کا اثر ہے۔

یہ اثر پھر عہد الست تک ہی محدود نہیں، بلکہ عالم دنیا پھر عالم برزخ پھر عالم حشر و نشر اور پھر عالم جنت تک خاتمیت کی یہ شان مختلف پیرایوں میں نمایاں کی جاتی رہی تاکہ تمام انبیاء کرام علیہم السلام پر آپ کی فضیلت وسیادت کھل کھل کر انبیاء و امم کے سامنے آتی رہے۔

چنانچہ شب معراج میں جو خود بھی آپ کی امتیازی شان کا ایک عظیم الشان ظہور ہے۔ آپ کو سارے انبیاء سے آگے بڑھا کر اور امام صلوٰۃ بنا کر تمام جماعتِ انبیاء کو مقتدی بنایا گیا، تاکہ آپ کا افضل الانبیاء اور منتہائے کمالات نبوت ہونا انبیاء اور ان کی امتوں پر کھل جائے۔ کیونکہ بنصِ قرآن عالم کی تخلیق کی غرض و غایت عبادت ہے اور نماز افضل العبادات بلکہ جس سے عبد و معبود کے درمیان علاقہ قائم ہوتا ہے اور انسان کو حقیقی عبودیت نصیب ہوتی ہے۔ اس لئے جو ذات اقدس نماز میں سب کی امام اور سب پر ممتاز ہوگی، وہی مقصد تخلیق کو سب سے زیادہ پورا کرنے والی بھی ثابت ہوگی۔ جس کے یہ معنی ہوئے کہ کمالاتِ بشریت میں وہی سب سے فائق ہوگی جو نماز میں سب پر فائق اور سب سے زیادہ ممتاز ہوگی۔ اس لئے شب معراج میں نماز میں آپ کی فوقیت دکھلانے کیلئے آپ کو امام بنایا گیا جو آپ کے منتہائے کمالات

نبوت ہونے کی دلیل ہے اور ختم نبوت کا حاصل ہے۔ نیز اسی لئے معراج میں آپ کو ساتوں آسمانوں سے گزار کر اور مستوی تک پہنچا کر نمایاں کیا گیا کہ آپ سارے انبیا کرام اور ملائکہ مقربین کے مقامات سے گزر کر اس مقام تک جا پہنچے، جہاں تک نہ کوئی نبی مرسل پہنچا، نہ فرشتہ مقرب پہنچ سکا۔ پس حسی طور پر تو یہ آسمانوں سے گزارنا تھا اور معنوی طور پر مقاماتِ انبیاء سے گزار کر اس انتہائی قرب کے مقام پر پہنچانا تھا۔ جہاں تک کسی کی رسائی نہ تھی، کیونکہ انبیاء علیہم السلام جب ان آسمانوں میں اپنے اپنے مقامات پر ملتے گئے اور آپ اس سے آگے گزرتے گئے تو اس سے مقاماتِ نبوت میں آپ کا تقدم اور فضل و امتیاز ثابت ہو جاتا ہے۔

پھر اسی یوم قیامت میں آپ کو مقامِ محمود پر پہنچایا جائیگا۔ جہاں تک کوئی نہ پہنچ سکے گا اور اسی لئے آپ کو شفاعت کبریٰ کے مقام پر لایا جائے گا۔ جہاں تک آنے سے سب انبیاء علیہم السلام رک جائیں گے اور اپنی کوئی ذلت و لغزش ظاہر کر کے اس مقام کی طرف بڑھنے سے عذر کریں گے۔ جو آپ کے ان سب مقدسین پر فائق اور محتاج الیہ ہونے کی دلیل ہے اور پھر اسی لئے آپ کو وجہ تخلیق کائنات بتایا گیا اور یہ ظاہر کر کے کہ آپ کی خاطر ساری کائنات کا یہ خیمہ کھڑا کیا گیا ہے، یہ بتلانا تھا کہ آپ ہی اس عالم خلق کا پھل اور مقصود اصلی ہیں۔ جن کے لئے یہ کائنات عالم کا عظیم الشان شجر بویا گیا تھا اور ظاہر ہے کہ درخت میں پھل ہی مقصود اور اصل ہوتا ہے۔ جس کے لئے درخت لگایا جاتا ہے۔ باقی ساری شاخیں اور پھول پتیاں اس کی تمہید ہوتی ہیں، جس سے آپ کا ساری کائنات کی نسبت مقصود اصلی ہونا ظاہر ہوتا ہے اور جب کہ پھل ہی میں وہ ساری قوتیں جمع ہوتی ہیں، جو درخت کے بلبے چوڑے پھیلاؤ میں پھیلی ہوئی ہوتی ہیں، یعنی ثمر جامع قوائے شجر ہوتا ہے تو اسی سے آپ کا جامع کمالاتِ بشر اور جامع کمالاتِ جمیع انبیاء ہونا بھی نمایاں ہو جاتا ہے۔ جو اس کائناتی درخت کے شگوفے اور گل سر سبز ہیں۔

چنانچہ آپ نے خود بھی کمالاتِ انبیاء کا اپنے کو جامع فرمایا۔ کیونکہ انبیاء کے

کمالاتِ نبوت کی بنیاد دو ہی چیزوں پر ہے۔ ایک کمال علمی ایک کمالِ اخلاقی، سو آپ نے اپنی نسبت تمام انبیاء و اولیاء کے سارے علمی کمالات کا جامع ہونا ان الفاظ میں ارشاد فرمایا۔

اُوتِیتُ عِلمَ الاَوَّلِینَ وَ الاٰخِرِینَ ؛ مجھے اگلوں اور پچھلوں کے تمام علوم دیئے گئے (جن کا مظہر اتم قرآن حکیم ہے)

اور آپ کی کمالات اخلاق کی جامعیت اس سے واضح ہے کہ صدیقہ عائشہ رضی اللہ عنہا سے جب آپ کے اخلاق کے بارے میں پوچھا گیا تو فرمایا۔

وکان خلقه القرآن ؛ اور آپ کا خلق یہ قرآن ہی تو ہے۔

(روح المعانی)

(کہ جو کچھ قرآن میں علم کی شکل میں ہے، وہی آپ کی ذات میں اخلاق و ملکات کی شکل میں ہے، اور جو قلبی مقامات اس میں رسوم و دال کی شکل میں ہیں، وہی آپ میں خلق و عمل کے درجہ میں ہیں۔)

اور ظاہر ہے کہ جب قرآن جامع کتب سابقین ہے جو آپ کے اخلاق کا مجموعہ ہے تو آپ کے اخلاق بھی جامع اخلاق سابقین ثابت ہو گئے۔ جو آپ کے خاتم کمالات اخلاق اور منتہائے کمالِ خلق ہونے کی واضح دلیل ہے۔ اس سے خود بخود واضح ہو جاتا ہے کہ جو ذاتِ بابرکات نبوت کی بنیادوں میں سب کی جامع اور سب پر فائق ہے وہی ان بنیادوں میں سب کی اصل بھی ہو سکتی ہے۔

چنانچہ اسی اصل ہونے کی بنا پر تمام انبیاء کرام سے آپ پر ایمان لانے اور آپ کی پیروی و نصرت کرنے کا عہد و میثاق لیا گیا۔ جیسا کہ آیت قرآنی وَاذ اخذ الله میثاق النبیین ؛ سے واضح ہے اور پھر حضورؐ نے اسی آیت کی روشنی میں انبیاء سابقین کے تابع خاتم ہونے کی مثال یہ ارشاد فرمائی کہ :۔

لوکان موسیٰ حیاً لما اگر آج موسیٰ بھی زندہ ہوں تو انہیں بھی

وسعۂ الا اتباعی : میری اطاعت کے سوا چارہ کار نہیں ہے۔

اس کا حاصل اس کے سوا اور کیا ہے کہ موسیٰ علیہ السلام جیسے اولوالعزم اور صاحب شریعت پیغمبر بھی بصورت عدم موجودگی خاتم الانبیاء تو واجب الاطاعت ہیں مگر بہ صورت موجودگی خاتم مطاع ہونے کے بجائے مطیع کی حیثیت میں آجاتے ہیں اور یہ اسی وقت ممکن ہے کہ ان کا عہدہ خاتم ماتحت ہو، کیونکہ ماتحت کے سارے اختیارات واقتدارات درحقیقت مافوق اور افسر اعلیٰ ہی کے ہوتے ہیں، جو اس کے دیئے سے ماتحت میں آتے ہیں، اس لئے ------- اصل کے موجود ہوتے ہوئے فرع کا حکم نہیں چلتا۔ یہ ایسا ہی ہے، جیسا کہ وزیر اعظم تمام وزراء سے یوں کہے کہ میرے سامنے آپ لوگوں کا حکم نہیں چلے گا۔ صرف میری عدم موجودگی میں آپ لوگوں کی آمریت بحال رہ سکتی ہے۔ جس سے صاف نمایاں ہے کہ ماتحت کے اختیارات مافوق کے سامنے کالعدم ہو جاتے ہیں، خواہ عہدہ بدستور باقی بھی رہے۔ یہ ایک اصول ہے جو انہی کے ساتھ مخصوص نہیں، بلکہ ہر دائرہ کے اصل و ظل کا یہی حال ہے کہ اصل کے ہوتے ہوئے فرع کا اختیار نہیں چلتا۔ باپ سامنے آجائے تو صاحب اولاد بیٹا اپنے کو باپ کہتے ہوئے بھی شرمائے گا چہ جائیکہ اپنی ابوت کے حق کو جتائے اور استعمال کرے۔ کیونکہ اس کی ابوت اپنے باپ کی ابوت کی فرع اور ظل ہے اور اصل کے سامنے فرع کی حیثیت مضمحل ہو جاتی ہے، یا مثلاً سمندر سامنے ہو تو نہروں کو دریا کہتے ہوئے شرم آئے گی، کیونکہ پانی کہیں بھی ہو، واسطہ بلاواسطہ سمندر ہی کا فیض ہے۔ اسی لئے یہ سارے بڑے بڑے دریا سمندر کے سامنے پہنچ کر سمندر ہی کے بہاؤ کے ساتھ ہو لیتے ہیں، خود ان کی اپنی رفتار باقی نہیں رہتی، سورج سامنے ہو تو ستارے اپنے کو نورانی کہتے ہوئے بھی شرمائیں گے کہ ان کی اصل سامنے ہے اور اصل کے ہوتے ہوئے فرع اپنے وجود سے بھی شرمانے لگتی ہے۔ چہ جائیکہ وجود کی مدعی بنے۔ ٹھیک اسی طرح تمام حضرات (انبیاء علیہم السلام) کا آفتاب نبوت کے آجانے پر اپنی اپنی نبوتوں کا حکم چلانے یا چلانے

کا حکم دینے کی بجائے خاتم نبوت ہی کے دہارے ہولینا ایک قدرتی اور طبعی بات ہے نہ کہ اپنا حکم جاری کرنا یہی حقیقت ہے، جسے حدیث مذکورہ میں نمایاں کیا گیا ہے کہ اگر بالفرض کوئی سابقہ نبی خاتم النبیین کا دور پا جائے تو اس پر اور اس کی امت پر ختم نبوت کا حکم چلے گا نہ کہ خود اس کا اور وہ بھی خاتم پر جو درحقیقت خاتم کے اصل کمال ہونے اور تمام غیر خاتم انبیاء کے فروع کمال ہونے کی واضح دلیل ہے۔ پھر حدیث مذکورہ میں تو علی سبیل الفرض ہی کو واقعہ کر کے دکھلایا گیا ہے کہ دورۂ محمدی میں جب کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام آسمان سے اُتار کر زمین پر لائے جائیں گے تو وہ النبی الخاتم ہی کے دین کی پیروی کریں گے، بلکہ شاید اسی حقیقت کو دکھلانے کے لئے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو آسمان پر زندہ اُٹھا کر دنیا کے آخری دورہ میں آسمان سے زمین پر اتارا جائے گا تاکہ وہ اپنی نبوت کی ساری قوتوں کے ساتھ اس فتنہ زادور میں شریعت محمدی کی تجدید بھی کریں گے اور اس کی اطاعت بھی کریں گے اور اس طرح دورۂ محمدی میں سابق نبی کی اطاعت محمدی محض عقیدہ ہی نہ رہے، بلکہ عملی صورت بھی سامنے آجائے، بلکہ اس ایک واقعاتی مثال ہی سے عقیدے کے طور پر یہ بھی ثابت ہو جاتا ہے کہ یہ ایک ہی اسرائیلی پیغمبر کا واقعہ نہیں، بلکہ سارے اسرائیلی انبیاء کی تابعیت کا عملی ثبوت ہے کیونکہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام خاتم الانبیاء بنی اسرائیل اور اس اسرائیلی نبوت کی آخری کڑی ہیں، ظاہر ہے کہ کسی مسلسل زنجیر کی آخری کڑی کو اگر کسی جانب کھینچا جائے گا تو قدرتاً پوری زنجیر اِدھر ہی کی جانب کھنچ جائے گی اور جو آخر کا حکم ہوگا، وہی پورے سلسلہ کا حکم شمار ہوگا، اس لئے کوئی وجہ نہیں کہ حضرت مسیح علیہ السلام کا جو اسرائیلی نبوتوں کی آخری کڑی ہیں، بعد از نزول تابع فرمانِ محمدی ہو کر آنا اس سارے سلسلہ کے تابع فرمان ہو جانے کی دلیل نہ سمجھا جائے۔ بالخصوص جبکہ تورات کی تصریح کے مطابق (جس کو احادیث میں ذکر کیا گیا ہے) موسیٰ علیہ السلام کی یہ دعا بھی تھی کہ اگر امتِ محمدیہ جیسی امت مرحوم مجھے بطور امت نہیں دی جا سکتی کہ وہ امتِ احمد ہے، تو پھر مجھی کو اس امت میں شامل کرایا جائے تو ان کے سلسلہ کے خاتم (حضرت مسیح) علیہ السلام کو اس امت

ہیں بطور مجددِ اسلام اور بحیثیت ایک تابع ترجمت محمدی لاکر موسیٰ علیہ السلام کی مقدس خواہش حضرت مسیح کو داخلِ امت کر کے پوری کردی گئی، چونکہ جب وہ نبی ہوتے ہوئے امتِ محمدیہ کے فرد بن گئے جو اسرائیلیت کا نچوڑ ہیں تو پوری اسرائیلیت از موسیٰ تا عیسیٰ علیہم السلام بحیثیت ایک تابع اور پیرو کار کے شاملِ امت ہوگئی، گویا اولین اسرائیلی پیغمبر (موسیٰ علیہ السلام) اور آخرین اسرائیلی نبی (حضرت مسیح علیہ السلام) سے کے اتباعِ محمدی کو اپنی اپنی نوعیت سے ظاہر فرما کر سارے ہی اسرائیلی پیغمبروں کو (جو اپنے دور میں دنیا کی سب سے افضل ترین نبوت تھی)، ان کے اول و آخر کے واسطہ سے آفتابِ نبوت کا پیرو کار ثابت کر دیا گیا ہے، ساتھ ہی جن نبوتوں کے نتیجہ میں اسرائیلیت کا مقام پیدا ہوا، وہ بھی اسرائیلیت کے مبادی کی حیثیت سے اس پیروکاری میں اس کی شریک حال مانی جائیں گی اور اس طرح سارے انبیاء علیہم السلام کے لئے یہی حکم نکل آتا ہے کہ ان کی نبوتیں ختم نبوت کے تابع اور ظل کی حیثیت رکھتی ہیں، جس سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا نبی الانبیاء ہونا کھلے طور پر سامنے آجاتا ہے۔

اس سے یہ مسئلہ بھی صاف ہو جاتا ہے کہ دورہ محمدی میں جو دنیا کا آخری دورہ ہے، جب کہ نبیوں کو بھی اتباعِ محمدی کے بغیر چارہ نہیں تو یہ اس کا کھلا اعلان ہے، کہ ان کی اقوام و امم کو بھی اس دور میں اتباعِ خاتم کے بغیر چارہ کار نہیں، بلکہ نجات کا انحصار ہی دینِ خاتم میں ہے۔

وَمَنْ يَبْتَغِ غَيْرَ الْإِسْلَامِ دِينًا فَلَنْ يُقْبَلَ مِنْهُ وَهُوَ فِي الْآخِرَةِ مِنَ الْخَاسِرِينَ ؂	اور جو شخص (اسلام کے دور میں) سوائے اسلام کے کسی دوسرے دین کے پیچھے جائے گا تو وہ اس سے قبول نہ کیا جائیگا اور وہ آخرت میں گھاٹے والوں میں سے ہوگا۔

پس حضرت خاتم الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم کی اس متبوعیت عامہ اور نبوت کے اصلی ہونے کو خاتم النبیین کے عنوان سے نمایاں کیا گیا ہے۔

نورِ آفتاب سارے ستاروں کے نور کی اصل ہے

کیونکہ اس عنوان کے سوا کوئی دوسرا جامع عنوان تھا ہی نہیں۔ جس سے آخرالانبیاء کے سرچشمۂ نبوت کو ہونے کو نمایاں کیا جاتا۔ جیسے آفتاب مادی سارے ستاروں کے نور کی اصل ہونے کی وجہ سے خاتم الانوار ہے اور ہر ستارہ نور میں اسی کا پیرو اور متبع ہے۔ ایسے ہی آفتاب روحانی (حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم) کی ذات بابرکت تمام انبیاء کی نبوتوں کی اصل ہونے کی وجہ سے خاتم النبیین ہے کہ ہر نجم ہدایت اور نبی نورِ نبوت میں آپ سے مستفید اور آپ کے تابع ہے۔

سرچشمۂ نور کا حجم میں بڑا ہونا ضروری نہیں

پھر جیسے آفتاب تمام ستاروں کے نور میں ان کا مربی ہے، خواہ کوئی ستارہ قد و قامت میں اس سے بڑا ہو یا چھوٹا۔ ایسے ہی آفتابِ نبوت خاتم الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم تمام نجوم ہدایت (انبیاء علیہم السلام) کے انوارِ نبوت میں ان کے مربی اور فیض بخش ہیں خواہ کسی نبی کا قد و قامت حضور سے بڑا ہو یا چھوٹا۔

نجوم ہدایت کے مخصوص رنگ آفتابِ نبوت ہی کا فیض ہیں!

اور جیسا کہ تمام ستاروں کا نور آفتاب ہی کے فیض سے قائم ہے، گو ہر ستارہ کے ظرف کی خاصیت الگ الگ ہے، جس سے ان ستاروں کے نور کا رنگ بھی الگ الگ ہے اور تاثیر بھی الگ الگ مگر نور سب میں آفتاب ہی کا کام کرتا ہے۔ ایسے ہی تمام نجوم ہدایت انبیاء علیہم السلام کا نورِ نبوت بھی خاتم الانبیاء ہی کے فیض سے ہے۔ گو ان کی تعلیم اور تربیت کے رنگ الگ الگ اور اقوام میں آثارِ تربیت مختلف ہیں، جس سے ان کی تربیت یافتہ امتوں کے ذہن بھی الگ الگ ہو گئے، مگر نور سب میں خاتم الانبیاء ہی کا کام کرتا رہا ہے کہ اس کے نور ڈالے بغیر انبیاء کے پاک قلوب کے متفاوت انوار کا ظہور

نہیں ہو سکتا تھا اور نہ علوم نبوت کی یہ نوع بہ نوع خاصیتیں ان ظروف سے گزر گزر کر کھل سکتی تھیں۔

آفتاب کے اصلی نور آجانے پر فروعی انوار کی حاجت نہیں رہتی

اور جیسا کہ طلوع آفتاب کے بعد ستاروں کے ظلّی اور فروعی نور کی کوئی حاجت باقی نہیں رہتی کہ بلا واسطہ نور آجانے کے بعد بالواسطہ نور کی قدر تاً کوئی ضرورت باقی نہیں رہتی۔ ایسے ہی خاتم النبیین کے آجانے کے بعد کسی بھی نجم ہدایت (پیغمبر) کے نور کی حاجت نہیں رہتی۔ جب کہ ان انوار کا اصل اصول نور بلا واسطہ ختم نبوت کے ذریعہ سامنے آجائے کہ اب تنہا سورج ہی کی روشنی سارے عالم کے لئے کافی ہے۔

پس جیسے طلوع آفتاب کے بعد سب ستارے ماند ہو کر اسی کے نور میں گم ہو جاتے ہیں کہ ان کا نور باقی رہنے کے باوجود بھی مشخص ہو کر سامنے نہیں آسکتا۔ ایسے ہی خاتم النبیین کی بعثت کے بعد انبیاء کے انوار بھی نور خاتم میں گم ہو کر لاشئ ہو گئے اور اب وہ مشخص ہو کر اپنی اپنی شریعتوں کی صورت میں سامنے نہیں رہ سکتے۔ اسی کے معنی نسخ شرائع کے ہیں کہ آپ کی شریعت سابقہ شریعتوں کے لئے تو ناسخ ہو گی، مگر قصہ برعکس نہ ہو گا۔

آفتاب نبوت صرف خاتم النبیین ہی نہیں آخر النبیین بھی ہیں

اور جیسے آفتاب سب ستاروں کے طلوع کے بعد آخر میں طلوع کرتا ہے۔ تاکہ نورانیت کی ہر پچھلی کمی کو پورا کر دے۔ ایسے ہی حضرت خاتم الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم کو آخر الانبیاء بھی بنایا گیا تاکہ آپ کا زمانہ بھی سب نبیوں کے آخر میں رہے تاکہ آخری عدالت کا فیصلہ ہر ابتدائی عدالت کے فیصلوں کے لئے حرفِ آخر اور ان کے حق میں ناسخ ثابت ہو سکے۔

آفتاب نبوت ہی مصدر انوار ہے۔

اور جیسے آفتاب کے لئے محض نور ہی ہونا اصل کمال نہیں بلکہ مصدر نور اور اصل انوار ہونا کمال ہے۔ ایسے ہی آفتاب نبوت، ذات بابرکات نبوی صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے محض نبی ہونا امتیازی کمال نہیں کہ یہ کمال سارے انبیاء میں مشترک ہے۔ بلکہ مصدر نبوت اور سرچشمۂ نبوت ہونا کمال ہے کہ یہ کمال اور انبیاء میں نہیں۔ اسلئے اس کے مخصوص آثار بھی اور انبیاء میں نہیں کہ وہ خاتم بھی نہیں۔

آفتاب نبوت اگلوں اور پچھلوں سب کے لئے مصدر فیض ہے۔

اور ظاہر ہے کہ جب انبیاء کی نبوتیں آپ کی نبوت سے ماخوذ اور اس کی تربیت یافتہ ہیں تو ولایت وامامت بہ طریق اولیٰ ختم نبوت کا فیض ہوگی۔ اس لئے آپ نبوتوں کا سرچشمہ بھی ہیں اور ولایتوں کا بھی۔ انبیائے سابقین ہوں یا اولیائے لاحقین سب کو نور اس ایک آفتاب سے ملا ہوا ہے۔ فرق اگر ہے تو صرف یہ کہ اگلوں کو آپ سے یہ نور بہ صورت نبوت پہنچا اور پچھلوں کو بہ صورت ولایت۔ پس انبیائے امم بھی آپ ہی سے مستفید ہیں اور اولیائے امت بھی آپ ہی کے دریوزہ گر ہیں۔ نور سب میں ایک اسی آفتاب نبوت کا کارفرما ہے۔ البتہ یہ تفاوت ضرور ہے کہ اگر آئینہ سورج کے سامنے رکھا جائے تو وہ چمک اٹھے گا۔ مگر اس کی یہ چمک دمک جب ہی تک قائم رہے گی جب تک آئینہ سورج کے سامنے حاضر ہے۔ لیکن اگر آئینہ منہ پھیر لے یا اس پر حجاب ڈال دیا جائے تو آئینہ کی چمک دمک اسی وقت ختم ہو جائے گی۔ لیکن اگر آفتاب کی منور شعاعوں سے بیٹری بھر لی جائے جو سورج کی کرنوں کی روشنی اور گرمی دونوں جذب کرلے تو سورج اگر اوٹ میں بھی آجائے گا تب بھی بیٹری اپنا کام کرتی رہے گی۔ خواہ اس سے روشنی کا کام لیا جائے یا حرارت ڈالنے کی پہلی مثال اولیائے امت کی ہے اور دوسری انبیاء علیہم السلام کی۔ پس انبیاء علیہم السلام کی نبوت اپنے حدوث

ہیں تو خاتم النبیین کے تابع ہے۔ لیکن بقا میں مستقل ہے۔ مگر اولیائے امت کی ولایت حدوث و بقاء دونوں میں آفتاب نبوت کی محتاج اور دریوزہ گر ہے۔ اس لئے انبیائے سابقین کی نبوتیں جہاں آفتاب کا ظل محض ہیں، وہیں ایک گونہ استقلال بھی رکھتی ہیں لیکن ولایت اولیاء حدوث و بقا دونوں میں تابع محض ہے اور آفتاب نبوت سے ہٹ کر کسی درجہ میں باقی نہیں رہ سکتی۔

اب خاتم النبیین کے اس جامع فرائض و رہنمائی کے حاوی نقشہ پر اس تمثیل کی روشنی میں غور کیجئے کہ اس نے عالم میں طلوع ہو کر اس دنیا کے دلی کی خدمت کیا کی اور کس طرح اس ظلماتی دنیا کو نورانی سطح کے سب سے اوپر کے حصہ پر لے جا کر کھڑا کر دیا جس سے ہر قوم اس کے نور کا اقتباس کرنے پر مجبور ہے اور اس نورانیت کے تدریجی مراتب چونکہ خاتم النبیین کی ولادت باسعادت ہی سے شروع ہو جاتے ہیں۔ اسلئے سراج منیر کی اس بلیغ تشبیہ میں ولادت و بعثت اور کارہائے بعثت کا نقشہ دیکھئے۔

آفتاب عالمتاب کے کام

اور اُن سے

مقاماتِ نبوت کی توضیح

خلقت اور ولادت

طبعی طور پر آفتاب کے سلسلہ میں سب سے پہلے اس کا وجود اور خلقت ہے جس سے اسے اپنے سے متعلقہ مقاصد کی تکمیل کا موقعہ ملتا ہے اگر وہ پیدا نہ کیا جاتا تو عالم میں چاندنے اور روشنی کا وجود ہی نہ ہوتا اور کوئی بھی دنیا کو نہ پہچانتا گویا اس کے نہ آنے کی صورت میں نہ صرف یہی کہ وہ خود ہی نہ پہچانا جاتا، بلکہ دنیا کی کوئی چیز بھی نہ پہچانی جاتی۔ ٹھیک اسی طرح اس روحانی آفتاب (آفتابِ نبوت) کے سلسلہ میں بھی اولاً حضور کی پیدائش ہے اور آپ کا اس ناسوتی عالم میں تشریف لانا ہے۔ اسکو ہم اصطلاحاً ولادت باسعادت یا میلاد شریف کہتے ہیں۔ اگر آپ دنیا میں تشریف نہ لاتے تو نہ صرف یہی کہ آپ نہ پہچانے جاتے، بلکہ عالم کی کوئی چیز بھی اپنی غرض و غایت کے لحاظ سے نہ پہچانی جاتی۔ محمدؐ نہ ہوتے تو کچھ بھی نہ ہوتا۔ پس جو درجہ علوی آفتاب میں خلقت کہلاتا ہے۔ اسی کو ہم نے روحانی آفتاب میں ولادت کہا ہے۔ قرآن حکیم میں اس ولادتِ جسمانی کا صراحتہً کہیں ذکر نہیں ملتا۔ بظاہر اس لئے کہ یہ ولادت خود بذاتہٖ مقصود نہ تھی۔ بلکہ اس سے مقصود ولادتِ نبوت و رسالت تھی۔ تاہم قرآن نے اس پہلو کو کلیتہً چھوڑا بھی نہیں ہے۔ کنایتہً اور ضمناً اس

کا بھی ذکر فرما دیا گیا ہے۔ ارشادِ ربانی ہے۔

لَعَمْرُكَ إِنَّهُمْ لَفِي سَكْرَتِهِمْ يَعْمَهُونَ۝

ظاہر ہے کہ عمر کا تعلق ابتداءً ولادت سے لے کر وفات کی آخری ساعتوں تک سے ہے۔ اس لئے اس ضمن میں ولادت شریفہ کا ذکر بھی آجاتا ہے۔ مگر ضمنی ہی طور پر کیونکہ مادی زندگی خود بذاتہ مقصود نہیں۔ اس سے مقصود روحانی زندگی ہے۔ اس لئے جب کسی کی روحانی زندگی کی اس کی بساط کی حد تک تکمیل ہو جاتی ہے جب ہی جسمانی زندگی ختم کر دی جاتی ہے۔ اگر وہ بذاتہ مقصود ہوتی تو ختم نہ کی جاتی۔ جیساکہ روحانی زندگی کبھی ختم نہ ہوگی۔ پس اس تشبیہ سے یہ درجہ بھی دسراجًا منیرًا کے تحت میں آ کر سراج منیر کا مدلول ہو جاتا ہے۔

طلوع اور بعثت

آفتاب میں وجود کے بعد دوسرا درجہ ظہور کا ہے کہ وہ طلوع کرے تاکہ دنیا کو روشنی حاصل کرنے کا موقعہ ملے۔ جس کے لئے اسے آسمانوں میں چمکایا گیا ہے۔ ٹھیک اسی طرح اس روحانی آفتاب (آفتابِ نبوت) کی ولادت باسعادت کے بعد آپ کا ظہور ہے یعنی بحیثیت پیغمبر کے آپ کا دنیا کے سامنے آنا ہے۔ جس سے آپ کا لقب محمد ابن عبداللہ کے بجائے محمد رسول اللہ ہوا۔ گویا یہ حضور کی ولادتِ ثانیہ تھی۔ جو ولادت جسمانی کے چالیس سال بعد ہوئی۔ پس یہ ولادت یا یہ ظہور ثانی ہی تمام سعادتوں اور کمالات کا سرچشمہ ہے۔ شریعت کی اصطلاح میں اسی ظہور کا نام بعثت ہے۔ پس مادی آفتاب میں جس درجہ کا نام طلوع ہے۔ روحانی آفتاب میں اسی درجہ کا نام بعثت ہے چونکہ ولادتِ شریفہ کا اصل مقصد بھی بعثت تھی اور آپ کی نبوت و رسالت کو عالم میں پھیلانا تھا۔ اسلئے قرآن حکیم میں بصراحت اور بار بار اور بصد احسان و تثبت وہی اس کا تذکرہ فرمایا ہے۔

ارشادِ ربانی ہے:۔

لَقَدْ مَنَّ اللّٰهُ عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ اِذْ حقیقت میں اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں پر

بَعَثَ فِیهِمْ رَسُولاً مِّنْ اَنْفُسِهِمْ یَتْلُوا عَلَیْهِمْ اٰیٰتِہٖ وَیُزَکِّیْهِمْ وَیُعَلِّمُهُمُ الْکِتٰبَ وَالْحِکْمَةَ وَاِنْ کَانُوا مِنْ قَبْلُ لَفِیْ ضَلٰلٍ مُّبِیْنٍ۔

احسان کیا، جب کہ ان میں ان ہی کی جنس سے ایک ایسے پیغمبر کو بھیجا کہ وہ ان لوگوں کو اللہ تعالیٰ کی آیتیں پڑھ پڑھ کر سناتے ہیں اور ان لوگوں کی صفائی کرتے ہیں اور ان کو کتاب اور فہم کی باتیں بتلاتے رہتے ہیں اور بالیقین یہ لوگ قبل سے صریح غلطی میں تھے۔

پُکار اور دعوت

طلوع کے بعد آفتاب کی وہ خصوصیت جو سب سے پہلے سامنے آتی ہے۔ یہ ہے کہ وہ رُخ دیگر کائنات پر طلوع کرتا ہے۔ یعنی منہ موڑ کر اور پشت دے کر بے رخی سے سامنے نہیں آتا۔ بلکہ رخِ زیبا سامنے کرکے آتا ہے۔ اگر وہ کائنات کی طرف رخ نہ کرتا، بلکہ اس کا چہرہ صرف اس کے خالق و مالک کے ہی سامنے رہتا۔ مخلوق سے اسے سروکار نہ ہوتا تو عالم میں روشنی کی یہ نوعیت نہ ہوتی جو ہے۔

پس آفتاب کی یہ رونمائی اور رخ دیگر کائنات کی طرف متوجہ ہونا اس کی طرف سے بمنزلہ پکار کے ہے کہ اے روشنی کے پیاسو! میں نور لئے ہوئے آگیا ہوں، روشنی تمہارا میرا کام ہے۔ جسے روشنی درکار ہو وہ کھل کر میرے سامنے آجائے اور مجھ سے رشتہ جوڑے تو میں اُسے وابستگی کی حد تک اُسے روشن کردوں گا۔ پھر اس وابستگی کے سلسلہ میں انتہائی توسع اور گنجائش دیتے ہوئے اسی زبان حال سے اس کی یہ بھی پکار ہوتی ہے کہ ——— ہاں اے روشنی کے طلب گارو! روشنی لینے کی یہ صورت نہیں ہے کہ تم ٹکٹکی باندھ کر میری ذات کو دیکھنے لگ جاؤ۔ کیونکہ ہر کس و ناکس میری ذات کو نگاہ بھر کر نہیں دیکھ سکتا کہ میری ذات ان ضعیف نگاہوں سے بالاتر اور نور کی اعلیٰ ترین قوت و شدت لئے ہوئے ہے۔ جس پر نگاہیں کبھی نہیں جم سکتیں اور جما دی جائیں گی تو

وہ باقی نہیں رہ سکتیں۔ اسلئے مجھ سے روشنی حاصل کرنے کا طریقہ صرف یہ ہے کہ مجھے اور میری نوری خصوصیات سے نگاہ لڑائے بغیر میری شعاعوں کے نیچے آجاؤ جس سے تمہیں نیز سے تیز مگر قابلِ برداشت روشنی مل جائیگی اور میری ذات کے ساتھ کنکشن بھی ہو جائے گا کہ کرنیں میری ہی ذات کی نمائندہ ہیں۔ لیکن کوئی شعاعوں کی تاب نہ لا سکے تو وہ میری دھوپ میں آجائے۔ جو شعاعوں کے نیچے ہر طرف پھیلی ہوئی ہے۔ جو بھی مکان سے باہر نکل کر اس کے دائرہ میں ــــــ چلا آئیگا۔ وہ کُل کا کُل روشن ہو جائیگا اور اسے بھی روشنی اور مجھ سے وابستگی مل جائے گی۔ کیونکہ دھوپ بھی میری ہی ہے۔ مجھ سے منقطع یا الگ نہیں ہے۔ لیکن جسے دھوپ کی بھی سہارنہ ہو اور وہ بند کوٹھری چھوڑ کر کھلے صحن میں بھی نہیں آسکتا تو میری دھوپ کے ساتھ اسکا چاندنا بھی لگا ہوا ہے۔ جو میری ہی چمک دمک ہے۔ وہ اندرونِ مکان میں رہ کر کم از کم مکان کے دروازے ہی کھول دے تو میرا چاندنا ہی اندر پہنچ جائیگا اور اسے چاندنے ہی سے روشنی میسر آجائیگی۔ گو یہ روشنی ہلکی اور ضعیف ہوگی، مگر وہ پھر بھی ــــــ مجھ سے منقطع نہ ہوگا۔ کیونکہ یہ چاندنا بھی میرا ہی فیض ہے۔ ہاں جو کرنوں سے بھی الگ رہے۔ دھوپ میں بھی نہ آئے، مکان کا دروازہ بھی چاندنے کیلئے کھلا نہ رکھے۔ بلکہ کسی اندھے تہ خانے میں گھس کر اوندھے منہ پڑ رہے اور اور اوپر سے آنکھ بھی بند کرلے اور اسی کے ساتھ آنکھوں پر پٹی بھی چڑھالے۔ گویا نہ صرف یہی کہ وہ روشنی کا طلب گار نہیں۔ بلکہ روشنی سے اسے بیر اور نفرت بھی ہو تو اس کیلئے روشن ہونے کی کوئی صورت نہیں۔ وہ ہمیشہ کے لئے روشنی سے محروم رہے گا گو کسی حد تک اس کے بلا ارادے بلکہ مرضی کے خلاف محض علم و شعور کے درجہ میں اسے یہ پتہ چلتا رہے کہ دن ہے رات نہیں اور سورج نکلا ہوا ہے۔ چھپا ہوا نہیں ہے۔ مگر یہ علم اس کے لئے کارآمد یا روشنی بخش نہیں۔ جس سے اس کے بدن میں میری روشنی اور گرمی کے صحت بخش آثار گھس سکیں اور اس کی طبعی زندگی اس سے ابھر سکے۔ بس اس صورت میں وہ اپنی صحت و توانائی سب کچھ کھو بیٹھے گا اور اس کی زندگی دوامی طور پر ختم ہو جائے گی، جو ہر طرح کا گھاٹا ہی گھاٹا اور خسارہ ہی خسارہ ہے۔ ٹھیک اسی طرح آفتابِ نبوت کی

وہ خصوصیت جو فاران کی چوٹیوں سے طلوع کے بعد سب سے پہلے سامنے آتی ہے یہ ہے کہ یہ مبارک آفتاب مخلوق سے منہ موڑ کر اس کے سامنے طلوع نہیں ہوا کہ اس کا رخِ زیبا صرف خالق ہی کے سامنے ہو اور وہ خلوت کدہ میں رہ کر ہمہ وقت صرف یادِ الٰہی میں مستغرق ہو، بلکہ توجہ الی اللہ کے ساتھ ساتھ اس کی پوری پوری توجہ مخلوق کی طرف بھی ہے اور پیغمبری کے رُخِ زیبا کا پورا پورا رُخ خلق اللہ کی طرف بھی ہے ع

ادھر اللہ سے واصل ادھر مخلوق میں شامل

پیغمبری کے رخ دینے کا مطلب یہ ہے کہ آپ نے روحانی ظلمت زدوں کو للکارا اور پکار پکار کر ان سے روحانیت وسعادت کی روشنی کے طلبگاروں میں روحانیت کا وہ کامل نور لئے ہوئے آگیا ہوں، جس کی دنیا عرصہ سے منتظر تھی۔ اب جسے روشنی درکار ہو، وہ میرے سامنے کھلے دل سے آجائے اور پیروی واطاعت کا جذبہ لے کر بڑھے تو میں سلامتی کے راستے دکھا دوں گا اور تاریکیوں سے نکال کر نورانی فضاؤں میں لے آؤں گا۔

قد جاءکم من اللہ نورٌ وکتابٌ مبین یھدی بہ اللہ من اتبع رضوانہٗ سُبُل السلام ویخرجھم من الظلمات الی النور باذنہ ویھدیھم الی صراطٍ مستقیم ؛	تمہارے پاس اللہ کی طرف سے ایک روشن چیز آئی ہے اور ایک کتاب کہ اس کے ذریعہ سے اللہ تعالیٰ ایسے شخصوں کو جو رضائے حق کے طالب ہوں سلامتی کی راہیں بتلاتے ہیں اور ان کو اپنی توفیق سے تاریکیوں سے نکال کر نور کی طرف لے آتے ہیں اور ان کو راہِ راست پر قائم رکھتے ہیں۔

آفتاب نبوت کی جانب سے نور کی پیش کشی نہ کہ ذات کی پیش کشی

مگر اس آفتاب نبوت کی جانب سے یہ بھی جتلا دیا گیا کہ نور حاصل کرنے کا یہ طریقہ نہیں ہے کہ لوگ پیغمبر کی ذاتی زندگی اور خصوصیات پیغمبر کی طرف دیکھنے لگیں کہ یہ زندگی

مقاماتِ نبوت سے وابستہ ہونے کے سبب نہایت ارفع و اعلیٰ ہے جس کی طرف کوئی نگاہ بھر کر نہیں دیکھ سکتا۔ اگر کوئی اس کا حوصلہ کریگا تو عقلیں اور بصیرتیں کند ہو کر رہ جائیں گی اور باطنی آنکھ کی بینائی جاتی رہے گی۔

یہی وجہ ہے کہ خصوصیاتِ نبوت کی پیروی سے روک دیا گیا کہ ان کا تحمل نبوت ہی کی قوت کر سکتی تھی۔ جیسے ابو قتادہ کی روایت میں ہے کہ کسی شخص نے حضور سے سوال کیا کیف تصوم؟ آپ روزے کیسے رکھتے ہیں؟ تو آپ غضبناک ہو گئے کہ پیغمبر کے مخصوص افعال و انداز کی پیروی کا حوصلہ اپنی طاقت اور اندازہ سے بڑھ کر دعویٰ ہے جو بے ادبی بھی ہے اور محرومی بھی۔ جب فاروق اعظم نے یہ سوال کیا کہ یا رسول اللہ افضل روزے کون سے ہیں۔ تب آپ کا غصہ ٹھنڈا ہوا اور جواب عطا فرمایا۔ یا جیسے آپ صوم وصال (بلا افطار روزہ پر روزہ رکھتے چلے جاتے تھے۔ مگر اوروں کو اس کی اجازت نہیں دی اور اَیُّکُمْ مِثْلِی (تم میں مجھ جیسا کون ہے؟) فرما کر اس حوصلہ سے روک دیا گیا۔

بیٹھ کر نفل نماز پڑھنے میں فرمایا گیا کہ اجر آدھا رہ جاتا ہے۔ لیکن عبداللہ ابن عمر نے آپ کو بیٹھ کر نماز پڑھتے دیکھا تو عرض کیا کہ یا رسول اللہ آپ تو اس میں آدھا اجر فرماتے تھے۔ پھر بیٹھ کر کیوں نماز ادا فرما رہے ہیں؟ تو فرمایا۔ اِنِّی لَسْتُ کَاَحَدٍ مِّنْکُمْ (میں تم میں سے کسی جیسا نہیں ہوں)

آپ پر تہجد فرض تھا۔ لیکن دوسروں کی یہ طاقت نہیں کہ اسے فریضہ کی حیثیت سے نباہ سکتے تو انہیں فرضیت سے روک دیا گیا۔ آپ روزانہ پچاس نمازیں فرض کے طور پر ہی ادا فرماتے تھے۔ جو معراج میں ابتداً فرض ہوئیں اور بعد میں تخفیف ہو کر صرف پانچ رہ گئیں۔ لیکن دوسروں کے لئے عادتاً محال تھا کہ وہ اس عزیمت پر ہمیشگی کر سکتے۔ اس لئے ان پر یہ فریضہ عائد نہیں کیا گیا۔ بلکہ ان سے ساقط کر دیا گیا۔

آپ کے خلق عظیم پر عفو و درگزر چھوڑ کر انتقام لینا شاق تھا۔ عمر بھر اپنی ذات کے بارے میں کسی سے انتقام نہیں لیا۔ لیکن دوسروں کی یہ مجال کب ہے کہ اس سبلے نفسی

استقامت دکھائیں۔ اس لئے انہیں انتقام کی اجازت دی گئی۔ آپ نو ازواج مطہرات رکھ سکتے اور سب میں عدل کامل فرما سکتے تھے۔ دوسروں کے لئے متعذر تھا۔ جب کہ وہ عموماً دو میں بھی عدل مشکل ہی سے کر پاتے ہیں تو انہیں اس عدد ہی سے روک دیا گیا۔ آپ کے گھر میں ایک ذرہ برابر سونا چاندی نہ رہتا تھا۔ دوسروں کے لئے یہ محال تھا تو امت کو اس میں توسیع دیا گیا کہ وہ مالی حقوق زکوٰۃ وصدقات وغیرہ دیکر باقی ماندہ مال گھروں میں رکھ لیں۔ بہر حال یہ اور انہیں کی مانند اور بہت سی خصوصیاتِ نبوی امتی کی زندگی سے بالاتر ہیں جن کی اقتدار کرنا کسی کا حوصلہ نہ تھا۔ صحابہ نے بھی اس ذاتی زندگی کی اقتدار نہیں کی۔ تابہ اولیاء چہ رسد؟ لیلئے آفتاب نبوت کی ذات اور ذاتی زندگی کی خصوصیات کو بالاتر رکھ کر اس سے چھنتا ہوا نور یعنی قانون شریعت ہی دنیا کے لئے رہنما بنایا گیا۔ جس میں عام مخلوق کی رعایت سے توسعات اور گنجائشیں رکھی گئیں اور اسے سہل تر کر دیا گیا تاکہ عوام وخواص اس سے یکساں فائدہ اٹھا سکیں کہ یہ شریعت ہی نورِ نبوت ہے۔ مگر قانون عام کی صورت میں نہ کہ ذاتی زندگی کی صورت میں بہر حال آفتاب نبوت نے سب سے پہلے اپنے آنے اور آنے کے مقصد کا اعلان کرتے ہوئے اس مقصد کی طرف اجمالی دعوت دی اور پکار کی۔

یہ فرمایا سب سے کہ اے آلِ غالب
سمجھتے ہو تم مجھ کو صادق کہ کاذب

کہا سب نے قول آج تک کوئی تیرا　　کبھی ہم نے جھوٹا سنا اور نہ دیکھا
کہا گر سمجھتے ہو تم مجھ کو ایسا　　تو باور کروگے اگر میں کہوں گا

کہ فوج گراں پشتِ کوہ صفا پر
پڑی ہے کہ لوٹے تمہیں گھات پا کر

کہا تیری ہر بات کا یاں یقیں ہے　　کہ بچپن سے صادق ہے تو اور امیں ہے
کہا گر میری بات یہ دل نشیں ہے　　تو سن لو خلاف اس میں اصلاً نہیں ہے

کہ سب قافلہ یاں سے ہے جانے والا
ڈرو اس سے جو وقت ہے آنے والا

وہ بجلی کا کڑکا تھا یا صوت ہادی عرب کی زمیں جس نے ساری ہلادی
نئی اک لگن دل میں سب کے لگا دی اک آواز سے سوتی بستی جگا دی

پڑا ہر طرف غل یہ پیغام حق سے
کہ گونج اٹھے دشت و جبل نام حق سے

وداعیاً الی اللہ باذنہ وسراجاً منیرا۔

پس یہ دعوت آفتابِ نبوت کی پکار تھی جو آفتاب ہادی میں رونمائی کی صورت میں زبان حال سے ہوتی ہے اور اس روحانی آفتاب میں توجہ کی صورت میں زبانِ حال سے ہوئی۔ کیونکہ وہ تکوینی پکار تھی اور یہ تشریعی پکار تھی۔

بیدار و سرشار کی تقسیم

پس جس طرح سے کہ مادی آفتاب کی اس عالی پکار اور اس کے رخِ روشن کے سایہ سے لوگ اک دم بڑابڑا کر اُٹھ بیٹھتے ہیں اور آنکھیں ملتے ہوئے ابتدائً تحیر سے آنکھ کھولتے ہیں، پھر جن کو مقاصدِ زندگی عزیز ہوتے ہیں، وہ اٹھ بیٹھتے ہیں اور اپنے معاشی کاموں میں لگ جاتے ہیں، لیکن جنہیں نیند ہی عزیز ہوتی ہے، انہیں یہ آفتاب کی رونمائی سخت گراں گزرتی ہے اور وہ منہ پر پلہ لے کر اور زیادہ گہری نیند سو جاتے ہیں، ٹھیک اسی طرح روحانی آفتاب کی اس ہادیانہ پکار اور دعوت الی اللہ کو سُن کر سننے والے متحیر سے رہ گئے۔ پھر بعض کو سمجھ میں آیا تو وہ خوابِ غفلت کو چھوڑ کر اس روحانی روشنی میں اپنے روحانی مقاصد کی طرف دوڑ پڑے اور انھوں نے اس کی تلاش و جستجو شروع کر دی اور جنہیں تعصب وقساوت ہی عزیز تھی، انھوں نے اس روشنی کو اپنے حق میں گراں بار اور مہلک سمجھا تو پہلے سے بھی زیادہ غافل اور اعراض کنندہ بن کر اس روشنی ہی کے پیچھے پڑ گئے۔ فمنھم من اٰمن بہ ومنھم من کفر ؛

بہرحال آفتاب کی رونمائی اور اس کی پکار کے بعد آپ کا موقعہ آگیا کہ آفتاب اپنا کام کرے اور جو کچھ وہ لے کر آیا ہے، وہ دنیا کو دے، اس لئے اب اس بلیغ تشبیہ کی روشنی

میں آفتاب نبوت کے چار گانہ مقاصد طلوع کو سمجھئے۔

تنویر اور تعلیم

جس طرح مادی آفتاب کی اس توجہ یا پکار کے بعد سب سے بڑا اور سب سے اہم کام تنویر ہے۔ یعنی عالم کو نور بخشنا جس کی روشنی میں لوگوں کو سیاہ و سپید کا امتیاز اور اشیا کی پہچان ہو۔ ان کی زندگی کے مشاغل عمل میں آنے لگیں اور دنیا سوتے ہوؤں کا قبرستان نہ رہے۔ بلکہ جاگتے ہوئے متحرک اور زندہ انسانوں کا جہان نظر آئے اور یہ زندگی بغیر چاندنے کے نہیں۔ چنانچہ قرآن نے زندگی کے معاش کی تکمیل ہی سورج کی روشنی اور دن پر معلق رکھی ہے۔ وَجَعَلْنَا النَّهَارَ مَعَاشًا (جسے ہم تنویر کہتے ہیں)

اسی طرح روحانی آفتاب کی دعوت و پکار کے بعد نبوت کا سب سے بڑا اور سب سے اہم کام علم الٰہی کی روشنی پہنچانا ہے کہ اس کے بغیر نہ حق و باطل میں امتیاز ہو سکتا ہے۔ نہ روحانی زندگی کی بنیادیں ہی قائم ہو سکتی ہیں۔ اور نہ معادی کی زندگی بن سکتی ہے۔ اسی کو شرعی اصطلاح میں تعلیم کہتے ہیں۔ اسی لئے آپ نے فرمایا۔ انما بعثتُ مُعَلِّمًا (میں تو معلم ہی بنا کر بھیجا گیا ہوں) اسی کو فرمایا انا قاسم واللہ یعطی (میں تقسیم کنندہ (علم) ہوں اور اللہ دینے والا ہے) اور اسی کو قرآن نے فرمایا۔ ویعلمکم الکتاب والحکمۃ (اور ان کو کتاب اور دانشمندی سکھاتے ہیں)

پس جس طرح مادی آفتاب اپنا جسمانی جمال دکھلا کر زمین و زماں میں چاندنا کرتا ہے۔ اسی طرح روحانی آفتاب یعنی آفتاب نبوت اپنا پیغمبرانہ جمال دکھلا کر کون و مکان میں چاندنا کرتا ہے۔ وہ اپنا مادی چہرہ دکھلاتا ہے۔ جو ظاہری جمال ہے۔ پیغمبر اپنی پیغمبری کا جمال دکھلاتے ہیں۔ جو ان کا حقیقی جمال ہے اور جس کی حقیقت علم ہے کہ یہی پیغمبری کا اصل اصول ہے کیونکہ پیغمبری وحی الٰہی سے بنتی ہے اور وحی قلب نبی پر علم اتارے جانے ہی کو کہتے ہیں۔ پس پیغمبری درحقیقت علم الٰہی کا ورود ٹھہرا اور اس علم کا دوسروں تک پہنچانا ہی تعلیم ہے۔ اس لئے جو درجہ مادی آفتاب کے سلسلہ میں تنویر کہلاتا ہے۔ (یعنی نور پہنچانا) وہی درجہ روحانی

آفتاب کے سلسلہ میں تعلیم کہلائے گا. یعنی وحی الٰہی اور علم پہنچانا.

تاثیر و تربیت

پھر مادی آفتاب محض روشنی نہیں پہنچاتا. جو اجزائے کائنات کہ بدنوں، چہروں اور بشروں پر پڑ کر رہ جاتی ہے. جس سے اجسام ظاہری کی سطح منور ہو جاتی ہے. بلکہ نور کے ساتھ وہ کائنات پر حرارت اور گرمی بھی پھینکتا ہے جو بدنوں کے اندر گھستی اور نفوذ کرتی ہے خام کو پختہ کرتی ہے. اشیاء کے اندرون میں سے عفونت دور کر دیتی ہے نجاسات کو خشک کر کے پاک کر دیتی ہے. اگر آفتاب تنفیذ حرارت نہ کرے اور اپنی سوزش و تپش سے اشیاء کے مزاجوں تک میں نہ گھسے تو صورتیں تو منور ہو جائیں. مگر مزاج بدستور فاسد رہ جائیں. ان کی اصلاح نہ ہو اور وہ مرطوب رہ کر فنا کے گھاٹ اتر جائیں. اس لئے وہ ظاہر کو روشن کرنے کے ساتھ باطن میں بھی گرمی پہنچاتا ہے. تاکہ مزاجوں میں حرارت عزیزی پیدا ہو اور زندگی کی نمود قائم رہے. چنانچہ اس حرارت رسانی سے مرطوب مزاجوں میں بھی حرارت اس درجہ نفوذ کر جاتی ہے کہ امراضِ باردہ کلیتہً ختم ہو جاتے ہیں. سردی کے مریض گرمی میں ہو جاتے ہیں. حالانکہ در و دیوار وہی ہیں جو پہلے تھے. فرق یہ ہے کہ آفتاب اپنی حرارت کو اندرون مزاج تک میں نفوذ تک کا موقعہ دیتا ہے اور اس موسم میں اسے تیز کر کے زیادہ سے زیادہ طبیعتوں کی گہرائیوں میں پہنچا دیتا ہے. جو سردی میں نہیں کرتا. ہاں جو لوگ خلقتہً اعتدال مزاج یا تحمل کی قوت نہیں رکھتے. بعض اوقات موسم گرما میں شدت حرارت سے ان کے مزاجوں میں جھنجھلاہٹ بھی پیدا ہو جاتی ہے. جو ان کے مزاج کا قصور ہوتا ہے نہ کہ آفتاب کا. لیکن عام طور پر گرمیوں صحت اچھی ہو جاتی ہے. کیونکہ آفتاب کی حرارت اندر گھس کر پسینہ کے راستہ سے فضلات ردیہ اور رطوبات فاسدہ کو باہر نکال کر پھینک دیتی ہے جس سے بدن ستھرا اور منقی ہو جاتا ہے.

ٹھیک اسی طرح آفتاب نبوت جیسے نور علم انسانوں پر ڈال کر ان کے ظواہر کو منور کرتا ہے. ویسے ہی اس کی اخلاقی حرارت اور گرمی عشق خداوندی دلوں کے اندر گھس کر روحوں کو

گرماتی ہے اور روحانی مزاج یعنی فطرت کو صحت مند بنا دیتی ہے۔ سستی و کسل اور کبر و نخوت اور ساری ہی اخلاقی گندگیوں کے فاسد فضلات کا میل کچیل جلا کر قلب کو پاک و صاف بنا دیتی ہے، جس سے روحانی صحت بحال اور ترقی پذیر ہو جاتی ہے۔ کریمانہ اخلاق صبر و شکر، حیاء، سخاء، شجاعت و مروت، غیرت و حمیت، حلم و انابت، رضاء و تسلیم، زہد و قناعت ورع و ایثار اور دوسری پاکیزہ خصلتوں کو نکھار کر نفس میں جلا پیدا کر دیتی ہے۔ مزاجوں میں گرمی عشقِ الٰہی اور محبت نبوی کی آگ بھڑک جاتی ہے، جس سے نفوس مصفّا اور مزکّی ہو جاتے ہیں پس مادی آفتاب کے سلسلہ میں جس چیز کو ہم تاثیر کہتے ہیں۔ روحانی آفتاب کے سلسلہ میں اسی چیز کو ہم تزکیہ اور تربیت کہتے ہیں، پس جیسے مادی آفتاب کی تاثیر اجسام کے اندروں میں پہنچ کر انہیں تپا دیتی ہے۔ ایسے ہی روحانی آفتاب کی اخلاقی تاثیر روحوں میں پہنچ کر انہیں عشق خداوندی میں گرم جوش اور رواں دواں کر دیتی ہے، جس کا ثمرہ انسانی نفوس میں اخلاق ربانی پیدا ہو جانے کی صورت میں نکلتا ہے۔ دل صیقل ہو جاتے ہیں۔ روحیں شفاف بن جاتی ہیں۔ مجاہدہ و ریاضت اور جہاد فی سبیل اللہ آسان ہو جاتا ہے۔

اسی کو حضور نے ارشاد فرمایا :-

بعثت لاتمم مکارم الاخلاق — میں مکارم اخلاق کی تکمیل کے لئے مبعوث کیا گیا ہوں۔

بہرحال آفتاب نبوت کی تعلیم و تربیت کی مثال مادی آفتاب کی تنویر و تاثیر ہے اور خود آپ کے علم و اخلاق کی مثال آفتاب کی روشنی اور گرمی ہے، پس جیسے سورج کا اثر روشنی اور گرمی ہے۔ روشنی سے راہ نظر آتی ہے اور گرمی سے رہروی کی قوتیں ابھرتی ہیں، گویا انسان کی قوت علمیہ اور قوت عملیہ دونوں کے ابھرنے کا سامان مہیا ہو جاتا ہے۔ جو مادی دنیا میں کام کرتی ہیں۔ ایسے ہی آفتاب نبوت کا اثر علم اخلاق کی قوتوں کا ابھار ہے، جس سے انسان میں علم و معرفت اور ہمت و قوت کی طاقتیں ابھرآتی ہیں، کیونکہ انبیاء سب سے پہلا تحفہ جو سعادت مندوں کو دیتے ہیں، وہ ایمان ہے اور ایمان کی حقیقت معرفت جزو اوّل ہے، جس سے راہ حق پہچانی جاتی ہے اور دوسرا جزو محبت ہے۔ جس سے جذبۂ انقیاد پیدا ہوتا ہے پہلی

چیز سے قوت علم مضبوط ہوتی ہے اور دوسری چیز سے قوتِ عمل مستحکم ہوتی ہے۔ یہی دو طاقتیں انبیاء کی مخصوص طاقتیں ہیں، جن کے دینے کے لئے وہ دنیا میں آتے ہیں، ان کی دو طاقتوں کی طرف قرآن حکیم میں اشارہ فرمایا گیا ہے :-

واذکر عبادنا ابراھیمَ واسحٰقَ ویعقوب اولی الایدی والابصار	اور ہمارے بندوں ابراہیم اور اسحاق کو یاد کیجئے۔ جو ہاتھوں والے آنکھوں والے تھے۔

ابن عباس رضی اللہ عنہ نے اولوالایدی کی تفسیر اولوالقوت فی العبادت (عبادت کی طاقت والے) سے کی ہے اور اولوالابصار کی تفسیر اولوالفقہ فی الدین (دین کی سمجھ رکھنے والے) سے کی ہے اور یہی دو قوتیں ہیں، جنہیں قوت علمیہ اور قوت عملیہ سے تعبیر کیا گیا ہے۔ دوسری جگہ فرمایا ہے :-

وجعلناھُم ائمۃً یھدُونَ بامرِنا لمّا صبرُوا وکانوا بِآیاتِنا یُوقِنُونَ ؛	اور ہم نے ان میں جب کہ انہوں نے صبر کیا، بہت سے پیشوا بنا دیئے تھے۔ جو ہمارے حکم سے ہدایت کیا کرتے تھے اور وہ لوگ ہماری آیتوں کا یقین رکھتے تھے۔

اس میں صبر سے قوت عملیہ کی طرف اشارہ ہے، کیونکہ شہوتوں سے نفس کو روک لینا اور طاعتوں پر نفس کو جمائے رکھنا ہی عمل ہے اور ایقان سے قوت علمیہ کی طرف اشارہ ہے۔ کیونکہ یقین ہی سے علم پیدا ہوتا ہے، جیساکہ شک اور تردد سے جہل اور انہی دو قوتوں میں سے جب علم کو دوسروں تک پہنچایا جائے گا تو اسے تعلیم کہیں گے اور عمل پہنچایا جائیگا تو اسے تربیت کہیں گے۔ اس لئے آفتاب نبوت کی تعلیم وتربیت کی مثال آفتاب کی تنویر اور تاثیر بنتی ہے، جس سے نبوت کے یہ دو بنیادی مقام بھی سراج منیر کی تشبیہ سے ثابت ہوکر اس قرآنی آیت کا مدلول ٹھیر جاتے ہیں۔

اوضاع و سنن

پھر جس طرح مادی آفتاب کی نورانیت اور اس نور سے کائنات میں تاثیر اور اس کی تربیت کی کوئی ایک ہی وضع نہیں، بلکہ فلک پر وہ اپنی نقل و حرکت سے اپنی مختلف اوضاع و اطوار اور مختلف ہیئتیں قائم کرتا رہتا ہے۔ جن کے مختلف آثار سے دنیا متاثر ہو کر اپنی مادی تکمیل کرتی ہے۔ جیسے کبھی طلوع اور کبھی غروب، کبھی عروج اور کبھی نزول، کبھی استواء اور کبھی انحطاط، کبھی بانکی حرکت اور کبھی مستقیم حرکت۔ پھر ان میں سے ہر حرکت میں نور بھی متفاوت پڑتا ہے اور تاثیر بھی مختلف ہوتی ہے۔ طلوع کے وقت روشنی اور گرمی ہلکی ہوتی ہے۔ اور ہر جگہ نہیں ہوتی۔ استواء کے وقت روشنی اور گرمی کی شدت ہوتی ہے اور ہر جگہ پہنچ جاتی ہے۔

زوال کے بعد تیسرے پہرے میں وہ شدت نہیں رہتی اور غروب کے وقت انتہائی خفت ہو جاتی ہے۔ غرض سورج کی رفتار اور رفتار سے پیدا ہونے والی اوضاع و اطوار کا کوئی ایک ہی نمونہ اور ایک ہی ڈھنگ نہیں، بلکہ سینکڑوں طریقے اور متعدد متحرک نمونے ہیں جن سے دنیا الگ الگ نوع کا اثر لیتی ہے۔ اس کی ابتدائی وضع یعنی ہیئت طلوع سے تو طبائع میں ابھار آمادگی پیدا ہو جاتی ہے۔ اس کے چڑھاؤ سے ہمتوں اور افعال میں قوت آجاتی ہے اس کے استواء سے مزاجوں میں گرمی اور شدت پیدا ہو جاتی ہے۔ اس کے ڈھلاؤ سے مزاجوں میں سستانے اور راحت لینے کے جذبات ابھر جاتے ہیں۔ اس کے غروب سے تھکن، ماندگی اور خواب راحت کے میلانات ابھر آتے ہیں۔ ان سارے ہی امور سے مل کر انسانی زندگی بنتی ہے اور اس کے مزاج میں پختگی آتی ہے جسے تکمیل انسانیت کہتے ہیں۔

ٹھیک اسی طرح آفتاب روحانی کی تعلیم، مقامات اور تربیت حالات کے نمونے اس کی روحانی رفتار ہی سے ہے اور اس کی تاثیریں الگ الگ انداز سے ہی امت کے روحانی مزاجوں پر پڑیں جن کو اپنی اپنی ہیئت پر آفتاب نبوت نے عملاً پیش کیا۔ آفتاب نبوت طلوع کے بعد جب اٹھا تو اسکا نور ہلکا اور گرمی خفیف تھی۔ جو سمائی ہوئی تھی تو یہی وہ عدم تشدد اور

صبر کا نمونہ ہے۔ جس میں روحانی مزاجوں کو منڈھے اور ہلکے رہنے پر ڈھالا گیا۔ نہ قتال کی اجازت تھی نہ سخت گیری اور سخت گوئی کی۔ جو مکہ کی زندگی تھی اور جمالی تھی۔ پھر آفتاب نبوت اور اونچا ہوا اور تیزی بڑھی تو مزاجوں میں روحانی غیرت کا ہیجان ہوا اور ہجرت کا نمونہ پیش کیا گیا جس میں گزشتہ اعراض اور پہلو تہی کو چھوڑ دیا گیا جو درمیانی زندگی تھی۔ بلکہ دشمنانِ حق سے کنارہ کشی اور یکسوئی کی حکمت عملی اختیار کی گئی۔ پھر استوا پر پہنچا اور نور و حرارت کی شدت انتہا کو پہنچ گئی تو یکسوئی کو خیرباد کہہ کر جہاد و قتال کا نمونہ پیش کیا گیا جو مدینہ کی زندگی تھی اور جلالی تھی۔ جس میں قوت اور تشدد کے مظاہروں کا نمونہ دکھلایا گیا۔ غروب کے قریب پہنچا اور شوکت کی تکمیل ہو گئی تو اجتماعیت کی وعظ، تعلیم تنظیم، تلقین عمومی نظام امر بالمعروف و نہی عن المنکر کے عملی نمونے دکھلائے گئے اور غروب ہو گیا تو قلوب میں اچانک تحیر و ماندگی پیدا ہوئی۔ بعض صحابہ فرماتے ہیں کہ ابھی حضورؐ کو ہم مٹی ہی دے رہے تھے کہ انکرنا قلوبنا (قلوب میں ہم نے نکارت محسوس کی) بعض کو ظلمت کا احساس ہوا۔ بعض پر حیرت زدگی کی کیفیت طاری ہو گئی۔ جیسے عثمان غنیؓ کو یہ بھی خبر نہ رہی کہ مجھے کس نے سلام کیا ہے اور مجھے جواب سلام دینا چاہیئے۔ فاروق اعظمؓ غلبۂ محبت میں یہ بھی پیش نظر نہ رکھ سکے کہ آپ کی وفات ہو گئی ہے۔ بعض صحابہ کے ذہنوں میں یہ جم گیا کہ حضور بھی حضرت مسیح علیہ السلام کی طرح آسمان پر اٹھا لئے گئے ہیں اور یہ محض غلبۂ حال اور غلبۂ حیرت و حسرت کی بنا پر ہوا۔ غرض یہ قلبی ماندگی اور تھکن کے آثار تھے۔ جس سے یہ جتلایا گیا کہ آفتابِ نبوت کے کیا اثرات تھے۔ جو آج بلا واسطہ سامنے نہیں رہے۔ مگر اس سلسلہ میں آفتاب نبوت کی ان ہدایات نے دستگیری کی جو ایسے مواقع کے لئے صحابہ کو دی جا چکی تھیں۔ صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کی ہمت قلبی اور تصرف باطنی نے کام کیا۔ جس سے صحابہ سنبھلے اور کار نبوت کو پھر اسی قوت سے جاری کیا۔ پس اس موقعہ پر بھی آفتاب نبوت کی ایک شان نمایاں ہوئی کہ ایسے مصیبت افزا وقت میں کیا کرنا چاہیئے؟ پھر اس طلوع و غروب کے درمیان کی عروجی اور نزولی زندگی میں جلال و جمال کے ہزار ہا مختلف عملی مدارج امت کے سامنے آتے رہے۔ کبھی جان کی بازی لگا کر میدانِ جہاد کو لالہ زار بنانے کا نمونہ سامنے رکھا اور کبھی میدان سے ہٹ کر گوشۂ مسجد کو اعتکاف و

ذکر اور تسبیح و صلوٰۃ سے معمور کرنے کا نمونہ پیش فرمایا کبھی مہینوں فقر و فاقہ سے کسر نفس کے نمونے سامنے رکھے اور کبھی جائز لذات کو جائز بتلانے کے لئے گاہ و بگاہ بعض لذتوں کے استعمال کرنے کھانے پینے اور بعض اچھے لباسوں میں متنعم ہونے کے نمونے بھی دکھلائے کبھی شفقت علی الخلق کے جذبہ سے اولاد (حسنین) کی محبت زوجۂ پاک (صدیقہ عائشہ) کی محبت۔ دوست صادق (صدیق اکبر) کی محبت کے اعلان کا نمونہ پیش کیا اور کبھی توجہ الی اللہ کے جذبہ سے مخلوق سے استغنائی جذبات کے نمونے یہ کہہ کر پیش کئے گئیں اگر کسی کو دوست بناتا تو وہ ابوبکر تھے۔ مگر میرا دوست صرف اللہ ہے۔ کبھی رحمتِ مجسم بن کر بشارتیں دینے کا نمونہ دکھلایا کہ جس نے لا الٰہ الا اللہ کہا۔ وہ جنت میں داخل ہوا اور اللہ کی رحمت سے ہرگز مت مایوس ہو کہ یہ کام کفار اور منکروں کا ہے اور کبھی غضب مجسم بن کر عذاب الٰہی سے ڈرانے دھمکانے کا نمونہ پیش کیا کہ اگر ذرہ برابر بھی کبر کسی کے دل میں رہا تو وہ جنت کی ہوا نہ کھائے گا۔ کبھی "بُعثتُ مرحمةً" (میں رحمت بنا کر بھیجا گیا ہوں) سے حوصلہ افزائی کا نمونہ دکھلایا اور کبھی "بُعثتُ ملحمةً" (میں جنگ مجسم بنا کر بھیجا گیا ہوں) سے سے دھمکانے اور انذار کا نمونہ پیش کیا۔ کبھی ترکِ جماعت پر گھروں کو جلا دینے کی دھمکی دی اور کبھی بارش سے جوتے تر ہو جانے پر انہی گھروں میں نماز کی اجازت دی۔ کبھی انا الضحوك (میں بہت ہنس مکھ ہوں) فرما کر دلداری کی اور کبھی انا القتال (میں بہت جنگ جُو ہوں) فرما کر نڈر دلوں کو خوفزدہ بنایا۔ غرض مختلف سنتوں اور عمل کے متفاوت پاکیزہ نمونوں کی جلالی اور جمالی روشنیں، مہر اور قہر کے معتدل اور کامل عملی نمونے دیانت و سیاست کے مؤثر ڈھنگ اور صلح و جنگ اور تعمیر و دفاع کے دلپذیر انداز دکھلا کر ایک جامع ترین "اسوۂ حسنہ" قائم فرمایا جو اس روحانی آفتاب کے عروج و نزول اور روحانی نقل و حرکت سے پیدا ہوا۔ جس میں ہزارہا روحانی اوضاع و اطوار شامل ہیں۔ جس سے شمائل کی کتابیں بھری پڑی ہیں۔

احوال و مقامات کے یہ عملی نمونے امت کے طبعی اور طبقاتی تغیرات کی رعایت سے آفتاب نبوت نے پیش کئے۔ تاکہ دنیا ان کی پیروی کر کے اور ان احوال کے سرد و گرم سے

گزار کر پختگی کے مقام تک پہنچ جائے۔ پس مادی آفتاب میں جو درجہ اوضاع فلکی کے نوع بنوع نمونوں کا ہے۔ وہی درجہ آفتاب نبوت میں سنن نبوت اور اوضاع روحانیت یعنی اسوۂ حسنہ کا ہے۔ تکمیل معاش کے لئے مادی آفتاب نے عروج و نزول، نور کی شدت وخفت اور حرارت کی کمی وزیادتی کے نمونوں کا زبان حال سے اعلان کیا تاکہ دنیا ان نمونوں کے تقاضوں پر چلے اور اپنی مادیت کو ان نمونوں سے گزار کر تکمیل کرلے۔ یہاں تکمیل معاد کے لئے آفتاب روحانی نے اپنے روحانی عروج و نزول اور شدت وخفت کے قولی اور عملی نمونے دکھلا کر دنیا کو ان نمونوں کے مطابق زندگی گزارنے کی طرف بلایا۔ پس وہاں فلکی بروج منازل آفتابِ مادی کے عملی مقامات ہیں اور یہاں ملکی احوال و منازل آفتاب روحانی کے عملی مقامات ہیں، وہ مادی سورج کا تکوینی اسوۂ حسنہ ہے اور یہ روحانی سورج کا تشریعی اسوۂ حسنہ ہے۔ جس کو قرآن نے فرمایا:۔

لقد کان لکم فی رسول اللہ اُسوۃٌ حسنۃٌ لِمَن کان یرجوا اللہ والیوم الآخر وذکر اللہ کثیرا ۔

تم لوگوں کے لئے یعنی ایسے شخص کیلئے جو اللہ سے اور روزِ آخرت سے ڈرتا ہو اور کثرت سے ذکرالٰہی کرتا ہو۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ایک عمدہ نمونہ موجود تھا۔

یہی وہ حکمتِ عملی ہے، جس کو قرآن نے تعلیم حکمت کے عنوان سے ذکر فرمایا ہے۔ اب ان تعلیمی، تربیتی اور حکمتی نمونوں کا جو ان ہر دو مادی اور روحانی آفتابوں سے سرزد ہو رہے ہیں، اصطلاحی الفاظ میں اجمال کیا جائے تو اس کے خلاصہ میں چار باتیں نکلیں گی جو گویا ان آفتابوں کے فریضے ہیں۔ مگر مادی سورج پر تکوینی انداز سے اور روحانی سورج پر تشریعی انداز سے یہ فرائض عائد ہیں۔ مادی سورج کو لیجئے تو تکوینی طور پر اس پر چار فریضے عائد کئے گئے

ایک توجہ یعنی منظر عام پر طلوع ہو کر رخِ روشن دکھلانا گویا زبانِ حال سے پکار دینا کہ میں نور لے کر آگیا ہوں، تاکہ نور کے طلب گار چونک سکیں۔

دوسرے تنویر یعنی رخ روشن سے دوسروں کو روشنی پہنچا کر منور بنا دینا تاکہ ایک

چیز دوسرے سے ممتاز ہو کر نظر آنے لگے۔

تیسرے تاثیر یعنی اپنے خواص و آثار جیسے گرمی و تپش اور سوزش سے دوسروں کو تپانا اور ان سے حرارت بھر دینا تاکہ ہر چیز حرارت غریزی کی زندگی سے ہلنے جُلنے کے قابل ہو جائے اور زندگی کی منزلیں عملاً طے کر سکے۔

چوتھے تاسّی یعنی اپنی نقل و حرکت سے مختلف مقابات و اوضاع بنا کر دنیا کو مدارج زندگی طے کرنے کے نمونے دکھلانا اور اسوۂ حسنہ بنانا تاکہ ان سے گزرتے ہوئے لوگ اسے فطرت سمجھیں اور تکمیل انسانیت کی منزلیں طے کریں۔

ٹھیک اسی طرح اللہ کی تشریح نے روحانی سورج (ذات بابرکات نبوی) کو پیدا کر کے ان پر بھی چار ہی فریضے عائد کئے۔

تلاوت

ایک توجہ یعنی منظرِ عام پر پہنچ کر پیغمبری کا جمال پیش کر دینا ہے اور علم کا جمال یا اس کی پاکیزہ صورت اس کے الفاظ ہوتے ہیں۔ اس لئے علم الٰہی اور وحی خداوندی کے الفاظ پڑھ کر سنا دینا بلاشبہ جمالِ علم اور جمالِ پیغمبری ہے، جسے قرآنی اصطلاح میں تلاوت کہا گیا ہے۔

تعلیم

دوسرے تنویر یعنی علم الٰہی کی صورت سے اس کی اندرونی حقیقت تک پہنچانا (جس کا نام علم اور معنی ہے) یعنی الفاظ کے مطالب اور مرادات سمجھانا جو بلاشبہ کمال پیغمبری ہے اور جسے قرآنی اصطلاح میں تعلیم کہا گیا ہے۔

تزکیہ

تیسرے تاثیر یعنی اپنے قلب کی اخلاقی گرمی اور سوزِ عشق سے طالبوں کے قلوب کو تپانا اور قلب نبوت کی گرمی سے قلوب کو گرما کر ان کا تصفیہ و جلا کرنا جو بغیر ریاضت و

مجاہدہ کے نہیں ہوتا۔ جسے قرآن کی زبان میں تزکیہ کہا گیا ہے۔

اسوۂ حسنہ

چوتھے تاسّی، یعنی طالبوں کے عمل کے لئے نمونے دکھلا کر اسوہ حسنہ قائم کرنا تاکہ دنیا انہی اوضاع و اطوار پر چل کر زندگی کی منزلِ مقصود تک پہنچ جائے اور اُسے عملی نمونے خود اختراع کرنے کی نوبت نہ آئے کہ من گھڑت اور اپنے ناتمام نمونوں پر چل کر دنیا حدِ کمال کو نہیں پہنچ سکتی، بلکہ بجائے کمال کے نقصان اور گھاٹے کا شکار ہو کر رہتی ہے جسے قرآن کی اصطلاح میں حکمت کہا گیا ہے۔ یہی وہ چار فرائض نبوت ہیں، جن کو قرآن کریم نے بعثت نبوی کی غرض و غایت ٹھیرایا ہے اور فرمایا:۔

هُوَ الَّذِي بَعَثَ فِي الْأُمِّيِّينَ	وہی ہے جس نے ناخواندہ لوگوں میں ان
رَسُولًا مِنْهُمْ يَتْلُو عَلَيْهِمْ	ہی سے ایک پیغمبر بھیجا جو ان کو اللہ کی آیتیں
آيَاتِهِ وَيُزَكِّيهِمْ وَيُعَلِّمُهُمُ	پڑھ پڑھ کر سناتے ہیں اور ان کو پاک کرتے
الْكِتَابَ وَالْحِكْمَةَ وَإِنْ كَانُوا	ہیں اور ان کو کتاب اور دانشمندی سکھلاتے
مِنْ قَبْلُ لَفِي ضَلَالٍ مُبِينٍ ؕ	ہیں اور یہ لوگ پہلے سے کھلی گمراہی میں تھے۔

بنا بریں جس طرح توجہ، تنویر، تاثیر اور تاسّی سے آفتاب مادی کی غرض و غایت پوری ہو جاتی ہے۔ ایسے ہی تلاوت، تعلیم، تزکیہ اور اسوۂ حسنہ سے آفتاب روحانی کی بعثت کی غرض و غایت بھی پوری ہو جاتی ہے اور جب کہ مادی آفتاب میں چاروں مقامات قانون تکوین کی ایک عظیم الشان آیت میں جو شبیہ اور نظیر ہیں، مذکورہ چاروں روحانی مقامات کے تو نبوت کے یہ چاروں مقامات "سراجاً منیرا" کی تشبیہ کے نیچے آ کر اس آیت کے مدلول اور مصداق بن جاتے ہیں، یعنی اس تشبیہ کے راستہ سے نبوت کے یہ چاروں فرائض اور سیرت نبوی کے یہ بنیادی ارکان اس لفظ سراجِ منیر سے قرآن سے ثابت ہو جاتے ہیں، اس لئے اس تشبیہ کے سلسلہ میں ہم نے ان چار امور کو دوسری تشبیہات

پر مقدم رکھا ہے کہ یہ آفتاب نبوت کے وجود کی بنیادی غرض و غایت اور اس کے ظہور کے اولین مقاصد ہیں۔

آفتاب نبوت سے استفادہ کے مراتب

پھر آفتاب ہی کی اس تمثیل سے آفتاب نبوت کی تاثیر و تربیت اور تعلیم و تمرین سے امت کے استفادہ اور منور ہونے کے متفاوت درجات و مراتب بھی کھل جاتے ہیں جن کا معیار آفتاب سے قرب اور بعد ہے۔ یعنی جو اس سے قریب تر ہے۔ وہ اتنا ہی نورانی تر اور متاثر تر ہے اور جتنا آفتاب سے دور ہے اتنا ہی اس کے فیض سے کم مستفید ہے۔

درجۂ صحابیت

مثلاً طلوع آفتاب کے بعد جو چیز سب سے زیادہ اور سب سے پہلے آفتاب کے آثار سے متاثر ہوتی ہے۔ وہ فضا ہے۔ وہ چونکہ خلقۃً اپنی ذات سے شفاف ہے اور ادھر آفتاب کے سامنے بلا واسطہ حاضر ہے۔ اس لئے سب سے پہلے اور سب سے زیادہ اس کے نور و حرارت کا اثر لیتی ہے۔ وہ اس درجہ منور ہوتی ہے کہ باوجود اس کے چمک اٹھنے کے خود اس کی چمک آنکھوں کو نظر نہیں آتی۔ بلکہ آفتاب ہی کی دھوپ اور شعاعیں نظر پڑتی ہیں۔ اگر فضا میں نگاہ اٹھائی جائے تو فضا کا جو حصہ بھی سامنے آئے گا۔ اس میں سے آفتاب ہی دکھائی دے گا۔ خود فضا کی ہستی نظر نہ پڑے گی۔ گویا وہ اس کے نور میں اس درجہ مستغرق اور فانی ہو جاتی ہے کہ اس کا اپنا تنور کسی کی آنکھ میں نہیں آتا بلکہ آفتاب اس میں سے ایسا دکھائی دیتا ہے کہ گویا بلا واسطہ دکھائی دے رہا ہے۔ حالانکہ فضاء اپنی بے حد وسعت کے ساتھ بیچ میں حائل ہے۔

ٹھیک یہی صورت روحانی آفتاب سے استفادہ کی بھی ہے کہ اس کے عالمگیر آثار سے متاثر تو سب ہوتے ہیں۔ مگر سب سے زیادہ وہ طبقہ متاثر ہوتا ہے۔ جو بلا واسطہ

اس سے قریب ہو کر نور لیتا ہے اور وہ طبقہ صحابہ کرام کا طبقہ ہے۔ جو فضا کی مانند ہے۔ کہ زمین سے بالاتر ہے اور فلک شمس یعنی آسمانِ نبوت سے فروتر ہے۔ وہ فضا کی طرح خلقی طور پر خود شفاف ہے جو محض اس کے نور ہی کو دکھلا دینے کی نہیں بلکہ عین آفتاب کو دکھلانے کی کامل استعداد رکھتا ہے۔ جیسا کہ احادیث میں آپ نے فرمایا کہ سارے نبیوں کے صحابہ میں میرے صحابہ منتخب کر لئے گئے۔ یا جیسے عبداللہ ابن مسعود رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ ان کے دل شفاف تھے، ان کا علم گہرا تھا۔ ان میں تکلفات نہ تھے۔ انہیں اقامت دین کے لئے پوری امت میں سے چن لیا گیا تھا۔ ان کا نقش قدم واجب الاتباع ہے وغیرہ۔ جس سے حضرات صحابہ کی کمال قابلیت کھلتی ہے جو انہیں انوار نبوت کو جذب کرنے کے لئے عطا ہوئی تھی۔ پس وہ فطری، شفافی اور کمال قرب کے لحاظ سے بمنزلہ فضا کے ہوئے، جو شفاف ہے اور ساری دنیا کی نسبت سے آفتاب سے قریب تر بھی ہے کہ بلاواسطہ نور آفتاب جذب کرتی ہے۔ پس انہوں نے ان شفاف سینوں سے اس درجہ آفتابِ نبوت کا نور و اثر قبول کیا کہ فضا کی طرح سرتاپا نور بن گئے اور جیسا کہ فضا آفتاب سے متصل اور ملحق ہو کر اس درجہ منور ہو جاتی ہے کہ وہ خود نظر نہیں آتی یعنی وہ خود اپنے کو نہیں دکھلاتی۔ بلکہ صرف آفتاب اور اس کی شعاعوں اور چمک دمک ہی کو نمایاں کرتی ہے۔ ایسے ہی صحابہ اپنی فطری قابلیتوں کی بنا پر اس درجہ پاک قلوب عمیق العلم، قلیل التکلف اور بے غل و غش بنا دیئے گئے تھے کہ گویا ان میں خود ان کی کوئی ذاتی خصوصیت باقی نہیں رہی تھی۔ وہ صرف سنن نبوی کے مجسم نمونے بن گئے تھے۔ اسی لئے حضور نے ان کے عقیدہ و عمل کو اپنے عقیدہ و عمل کے ساتھ ختم کر کے انہیں معیار حق فرمایا اور اعلان فرما دیا کہ سنن نبوت اور سنن صحابہ ایک ہی ہیں، جس سے نمایاں ہو جاتا ہے کہ صحابہ کی دینی خصوصیات خصوصیات نبوی تھیں، چنانچہ امت کے بہتر فرقوں کے بارے میں جب حضور سے یہ سوال کیا گیا کہ ان بہتر میں وہ ناجی فرقہ کونسا ہے؟ تو فرمایا۔ ما انا علیہ الیوم و اصحابی، جس پر آج کے دن میں اور میرے صحابہ ہیں۔

گویا اپنے عقیدہ و عمل کے ساتھ ان کے عقیدہ و عمل کو اس طرح ملا کر بتلایا کہ انکے عقیدہ و عمل اور حضورؐ کے عقیدہ و عمل کی نوعیت ایک ثابت ہو گئی اور فرقوں کے حق و باطل ہونے کا معیار آپ نے خود اپنی ذات بابرکات اور حضرات صحابہ کو ٹھہرا دیا۔

صحابیت بالاتر از تنقید

پھر جیسے فضا تک کوئی گندگی نہیں پہنچتی اور پہنچائی بھی جائے تو وہ لوٹ کر پہنچانے والے ہی پر گرتی ہے۔ فضا اس سے گندی نہیں ہوتی۔ ایسے ہی حضرات صحابہ کا جو طبقہ روحانی فضا کی مانند ہے۔ امت کی تنقیدوں سے بالاتر ہے۔ اگر ان کی شان میں کوئی طبقہ سب وشتم یا گستاخی یا سوءِ ادب یا جسارت و بے باکی یا ان پر اپنی تنقیدی تحقیر کی گندگی اچھالے گا تو اس کی یہ ناپاکی اسی کی طرف لوٹ آئے گی۔ اس فضاءِ شفاف پر اس کا کوئی اثر نہ ہوگا۔

بہر حال حضرات صحابہ فضاء قریب کی مانند ہیں کہ انہیں شفافی میں بھی آفتاب سے مناسبت ہے۔ وہ آفتابِ نبوت سے نزدیک تر بھی ہیں۔ بلا واسطہ اس سے ملحق بھی ہیں۔ وہ زمین کی کدورتوں سے بالاتر بھی ہیں اور وہ آفتابِ نبوت کے نور میں فانی بھی ہیں کہ اس نور کی نمائش گاہ بن کر رہ گئے ہیں۔ جن میں اپنی خصوصیت بجز انفعال اور قبول حق کے دوسری نہیں رہ گئی تھی۔

پس صحابہ کی اس اعلیٰ ترین زندگی کا نور تیز بھی ہے اور پیغمبر سے اقرب تر اور اشبہ تر بھی ہے کہ اس نے نبوت کی زندگی سے متصل رہ کر اس کی شعاعوں کا نور قبول کیا ہے اس لئے یہ زندگی نہ صرف عزیمتوں کی زندگی اور اولوالعزمانہ زندگی ہے کہ جائزات کی آڑ لئے بغیر عمل کے اعلیٰ ترین حصہ کو اپنا لیا جائے اور نفس کی راحت طلبیوں کو خیرباد کہہ کر عملی مجاہدہ و ریاضت ہی کو زندگی بنا لیا جائے۔ بلکہ یہ زندگی جامع اضداد بھی ہے۔ جو کمال اعتدال لئے ہوئے ہے کہ ایک طرف نفس کشی بھی انتہائی اور ساتھ ہی ادب شریعت اور اتباع سنن نبوی بھی انتہائی اور ایک طرف طبعی جذبات بھی قائم اور دوسری طرف عقلی و داعی اور ملکیت بھی غالب اس کمال اعتدال و جامعیت کے ساتھ یہ زندگی صحابہ

کے سوا امت کے کسی طبقہ کو طبقاتی حیثیت سے نصیب نہیں، آحاد و افراد اس زندگی کے حامل نظر پڑیں گے۔ جس میں شرف صحابیت کے سوا سب کچھ ہوگا۔ لیکن طبقہ کا طبقہ ایک ہی رنگ میں رنگا ہوا ہو اور ہمہ وقت اخلاص و معرفت کی حد کمال کو طے کئے ہوئے ہو، طبقۂ صحابہ کے سوا دوسرا نہیں، جنہوں نے گھر بار چھوڑ کر اور نفس کی خواہشات سے منہ موڑ کر صرف اور صرف رضائے حق کو اپنی زندگی بنایا، طبعی مرغوبات کو شرعی مطلوبات پر قربان کر دیا۔ موطنِ طبیعت سے ہجرت کر کے موطنِ شریعت میں آ کر بس گئے اور شرعی مرادوں کی خاطر نفس کی حیلہ جوئیوں اور راحت طلبیوں سے کنارہ کش ہو کر عزم صادق کے ساتھ ہمہ وقت مرضیاتِ الٰہی اور سنن نبوی کی پیروی میں مستغرق ہو گئے اور اسی کو اپنی زندگی بنا لیا۔ اس جامع اور جامع اضداد زندگی کا سب سے زیادہ نمایاں اور حیرت ناک پہلو یہ ہے کہ وہ کلیتہً تارک دنیا بھی تھے اور رہبانیت سے الگ بھی۔ دنیا اور دنیا کے جاہ و جلال دھن و دولت و حکومت و سیاست، گھر بار، زمین جائیداد کے ہجوم میں بھی تھے اور پھر ادائے حقوق میں بے لاگ بھی، یہ زن، زر، زمین ان کے تصرف میں بھی تھی اور پھر قلباً ان سب چیزوں سے بے تعلق اور کنارہ کش بھی، درویش کامل بھی ہیں اور قبائے شاہی بھی زیب تن ہے۔ حکمران بھی ہیں اور دلق گدائی بھی کندھوں پر ہے۔ ممالک بھی فتح کر رہے ہیں اور فقیری کی خو بھی بدستور قائم ہے۔ ؎

یوں ہم کس نے کئے ساغر و سنداں دونوں؟

انبیاء علیہم السلام کی یہی زندگی ہے کہ بشر بھی ہیں اور ملک بھی، نہ طبائع کو ترک کرتے ہیں، نہ عقل و فراست کے تقاضوں سے ایک انچ ادھر ادھر ہوتے ہیں۔ خالص طبعی جذبات کی پیروی حیوان کا کام ہے اور طبعیات کو بحالہ قائم رکھ کر انہیں عقلی شعور کے ساتھ عقل کی ماتحتی میں انجام دینا اور حدود سے تجاوز نہ کرنا یہ انسان کا کام ہے۔ مگر انسان کامل فرما کر اس کے مقدس و برگزیدگی کو نمایاں کیا گیا۔ اس لئے جس طبقہ کے افعال، قویٰ، عقائد، احوال، اقوال سب میں یہ کامل اعتدال رچا ہوا ہو۔ وہی طبقہ کامل انسانیت کا طبقہ کہلائے گا، سو طبقاتی حیثیت سے یہ کمال بالذات تو انبیاء میں ہوتا ہے اور بالعرض بحیثیت طبقہ ان کے صحابہ میں ان کے

بعد طبقاتی حیثیت ختم ہو جاتی ہے۔ صرف انفرادی حیثیت باقی رہ جاتی ہے اور وہ بھی اس مقام کی نہیں، جس پر یہ طبقہ فائز ہوتا ہے۔ پس صحابہ درحقیقت نبوت کا ظل کامل تھے، جن کے طبقہ سے نبوت اور کمالاتِ نبوت پہچانے جاتے ہیں، اس لئے اگر کسی طبقہ کے طبقہ کو بحیثیت طبقہ اللہ و رسول کے یہاں مرضی و پسندیدہ قرار دیا گیا ہے تو وہ صرف صحابہ کا طبقہ ہے، جس کی شہادت قرآن اور حدیث نے دی ہے اور

رضی اللہ عنھم و رضوا عنہ — اللہ ان سے راضی اور وہ اللہ سے راضی

کی دستاویز رضا ان کے لئے آسمانی کتاب میں تا قیام قیامت ثبت کر دی گئی، کہیں

اولٰئک الذین امتحن اللہ قلوبھم	یہ وہ لوگ ہیں، جن کے قلوب کو اللہ تعالیٰ
للتقوٰی لھم مغفرۃ واجر	نے تقوے کے لئے خالص کر دیا ہے۔
عظیم ؕ	ان لوگوں کے لئے مغفرت و اجرِ عظیم ہے۔

کے ذریعہ ان کے قلوب کی پاکیزگی کی شہادت دی گئی اور کہیں اولٰئک ھم الراشدون فضلاً من اللہ ونعمۃ اور کہیں والذین معہ اشداء علی الکفار رحماء بینھم تراھم رکعا سجدا ؕ فرما کر ان کے اخلاق کی برتری ثابت کی گئی اور کہیں اصحابی کالنجوم بایھم اقتدیتم اھتدیتم، فرما کر ان میں کے ہر ہر فرد کو پوری امت کا مقتدا بتلایا گیا جس کی پیروی اور پیروی سے حصولِ ہدایت میں ادنیٰ کھٹکا نہ ہو۔

طبقات مابعد ائمہ و راسخین فی العلم

فضا سے گزر کر شعاعیں جب نیچے اترتی ہیں تو زمین کے کھلے میدانوں پر پڑتی ہیں اور وہ اس درجہ اس کے نور حرارت کو جذب کرتے ہیں کہ ان کا ظاہر و باطن دونوں ہی نور سے منور ہو جاتے ہیں۔ کیونکہ کھلا میدان اپنے کو کلیتہً آفتاب کے سامنے پیش کر دیتا ہے۔ گویا کل کا کل آفتاب کی محاذات میں آجاتا ہے اور درمیان میں کوئی رکاوٹ در و دیوار وغیرہ کی حائل نہیں ہوتی، تا کہ نور کسی گوشہ سے بھی ان میں آتا ہوا رک جائے۔ یہ درجہ

آئمہ مجتہدین علمائے راسخین سے فقہائے متقین اور ارباب معرفت مجاہدین یعنی اولیائے کاملین کی زندگی کا ہے۔ جنہوں نے کھلے ہوئے صاف میدانوں کی طرح اپنے کھلے دل سے آفتابِ نبوت کی دھوپ کے لئے پیش کر دیا ہے اور فضا سے چھنتا ہوا نور انہوں نے اپنے ظاہر و باطن میں سمو لیا ہے۔ ان میں دریا کی سی تاریک گہرائی، مکانوں کا سا ظلماتی اندرون پہاڑوں کا سا کثیف اور ٹھوس دل نہیں ہے۔ جس میں شعاعیں نہ پہنچ سکیں اور گہرائی کا حصہ قبول نور سے رہ جائے۔ اس لئے فضائی نوران میدانوں کے اندر اور باہر سما جاتا ہے کہ جو ان کا اندر ہے، وہی ان کا باہر بھی ہے۔ کھلے میدان کے معنی ہی یہ ہیں کہ وہ کسی جہت سے بھی بند یا آڑ میں نہ ہو۔ پس جو اس کا ظاہر ہے۔ وہی اس کا باطن بھی ہے اس لئے اُن کا ظاہر و باطن دونوں منور ہو جاتے ہیں۔ فضا اور کھلے میدان میں فرق ہے تو صرف یہ ہے کہ میدان فضا کی طرح اپنی خصوصیات دکھلائے بغیر محض آفتاب ہی آفتاب نہیں دکھلاتا۔ بلکہ خود اپنی خصوصیات بھی کچھ نہ کچھ نمایاں کرتا ہے اگرچہ وہ خصوصیات نورانی اور رنگ سنت ہی میں ڈوبی ہوئی ہوں۔ پس یہ نور پہلے نور سے ہلکا ہے۔ مگر مابعد کے لوگوں کے نور سے تیز ہے۔ یہ ظاہر و باطن میں فانی فی اللہ ہیں۔ علم نبوت ہی ان کا اوڑھنا اور بچھونا ہو جاتا ہے اور وہ ہمہ وقت ذکر و فکر میں مستغرق رہتے ہیں۔ ان میں ماسو اللہ سوخت ہو کر زائل ہو جاتا ہے اور کسی ماسواء سے ان میں خوف و طمع باقی نہیں رہتا بلکہ وہ خوف و خشیت خداوندی میں ہمہ وقت لرزاں و ترساں رہتے ہیں۔

اَلَاۤ اِنَّ اَوْلِیَآءَ اللّٰهِ لَا خَوْفٌ	یاد رکھو اللہ کے دوستوں پر نہ کوئی اندیشہ
عَلَیْهِمْ وَلَا هُمْ یَحْزَنُوْنَ	ہے اور نہ وہ مغموم ہوتے ہیں، وہ وہ
اَلَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَكَانُوْا یَتَّقُوْنَ	ہیں جو ایمان لائے اور پرہیز رکھتے ہیں، ان
لَهُمُ الْبُشْرٰی فِی الْحَیٰوةِ الدُّنْیَا	کے لیے دنیوی زندگی میں بھی اور آخرت میں
وَفِی الْاٰخِرَةِ ؕ	بھی خوشخبری ہے۔

تیسرے درجے میں پہاڑ اور دریا وغیرہ متاثر ہوتے ہیں، جن کی سطح بلند ہے اور آفتاب کی طرف مائل، مگر وہ کل کے کل متاثر نہیں ہوتے بلکہ ان کا کوئی ایک رُخ اثر لیتا

ہے جو آفتاب کی سمت میں آیا ہوا ہو. اگر طلوع کا وقت ہے تو شرقی سمت روشن اور گرم ہو جاتی ہے. غربی نہیں ہوتی اور غروب کا وقت ہے تو غربی سمت منور ہو جاتی ہے مگر شرقی سمت تاریک ہی رہتی ہے. الایہ کہ آفتاب نصف النہار پر آ کر اپنی پوری ہمت سے ان پر پورا نور ڈالے تو وہ ایک لمحہ کے لئے پورے پورے منور ہو جاتے ہیں. مگر یہ تنور دیرپا نہیں ہوتا. استواء کی ساعت گزرتے ہی ان کا یہ کامل تنور گھٹنے لگتا ہے اور آخر کار ایک سمت مثلاً غربی جانب میں باقی رہ جاتا ہے. تاہم ان پہاڑوں پر دن بھر میں کوئی ساعت ایسی نہیں گزرتی کہ ان کی کوئی نہ کوئی سمت روشن نہ ہو اور وہ نور سے خالی رہ جائیں مگر حالے بہ حالے منقلب ہوتے رہتے ہیں.

علماء و اتقیاء

یہ مثال عام علماء و صلحا اور اتقیاء کی زندگی کی ہے. جو پہاڑوں اور ٹیلوں کی مانند ہیں کہ وہ آفتاب کی سمت ابھرے ہوئے بھی ہیں اور ساتھ ہی کسی نہ کسی جہت سے آفتاب سے روشن بھی رہتے ہیں. نیز نور کامل کی ان پر کلیتہً چھا جانے کی کیفیت بھی کبھی کبھی آ جاتی ہے جیسے استواء کے وقت پہاڑوں پر آفتابی نور ہر طرف سے پڑ جاتا ہے. لیکن وہ ہمہ وقت اس کیفیت کا تحمل نہیں کر سکتے کہ فانی محض ہو جائیں. تاہم یہ ضرور ہے کہ کسی نہ کسی سمت اور کسی نہ کسی کیفیت و حال کے لحاظ سے ہر وقت روشن رہتے ہیں. ان پر کوئی ساعت ایسی نہیں آتی کہ وہ نور سے یکسر خالی ہو جائیں. جو پہاڑوں کی کیفیت ہوتی ہے. کبھی کوئی سمت روشن ہوتی ہے اور کبھی کوئی سمت گویا آفتاب نبوت کا نور ان کے وجود پر گھومتا رہتا ہے مگر یک جہتی طور پر کل جہتی انداز سے نہیں. پس وہ مجموعی طور پر تو ہمہ وقت منور ہی رہتے ہیں لیکن ہر جہتی طور پر نہیں. بلکہ بعض اوقات ان میں بشری ظلمت کی پرچھائیاں بھی پڑتی رہتی ہیں. جب کہ اس حیثیت میں شعاع نبوت اوٹ میں آ جاتی ہے. گویہ حالت مغلوب اور گہ بگہ ہو. گویا لوگ گھروں سے باہر نکل کر آفتاب کی دھوپ میں تو آ بیٹھتے ہیں. جن کے کسی نہ کسی سمت سے نور پڑتا رہتا ہے اور بہ حیثیت مجموعی ہر وقت نور میں رہتے ہیں. مگر وہ

شعاعوں کو دیکھتے رہنے کی قوت نہیں پا سکے کہ ہر ما سوا جل کر خاکستر ہو جائے اور وہ ہر وقت فانی فی اللہ اور خشیت اللہ میں مستغرق ہو کر باقی باللہ ہو جائیں۔ تاہم ہر وقت دھوپ میں رہنے کے سبب اپنی غالب زندگی کے لحاظ سے وہ بھی نور ہی میں داخل رہتے ہیں اور احیاناً اگر ظلماتِ نفس ان کے قدم کو کسی وقت پھسلا دیں تو ان کا تقویٰ و طہارت انہیں فوراً بیدار کر دیتا اور وہ فوراً اونگھ سے بیدار ہو جاتے ہیں۔

اِنَّ الَّذِیْنَ اتَّقَوْا اِذَا مَسَّھُمْ طٰٓئِفٌ مِّنَ الشَّیْطٰنِ تَذَکَّرُوْا فَاِذَا ھُمْ مُّبْصِرُوْنَ	یقیناً جو لوگ خدا ترس ہیں، جب ان کو کوئی خطرہ شیطان کی طرف سے آ جاتا ہے تو وہ یاد میں لگ جاتے ہیں، سو یکایک ان کی آنکھیں کھل جاتی ہیں۔

عوام صلحاء

چوتھا درجہ بناؤں اور مکانوں کا ہے کہ ان میں بھی آفتاب کا نور آتا ہے۔ مگر صرف اوپر سے ہی دھوپ پڑتی ہے۔ کوٹھے کے اندر دھوپ کا گزر نہیں ہوتا۔ تاہم مکان کے دروازے اور کھڑکیاں کھلی رہیں تو چاندنا اندر ضرور پہنچ جاتا ہے۔ اِلا یہ کہ کسی وقت بارش یا ہوا کی شدت وغیرہ کی وجہ سے مکانوں کے دروازے بند کر لئے جائیں تو چاندنے میں بھی نمایاں کمی آ جاتی ہے۔ یہ مثال عوام مسلمین کی زندگی کی ہے کہ آفتاب نبوت کے سامنے وہ مثل مکانوں کے ہیں۔ جن کے اوپر دھوپ اور اندر صرف چاندنا پہنچ رہا ہے۔ گویا انہوں نے گھروں سے نکل کر دھوپ میں آ بیٹھنا تو گوارہ نہیں کیا اور شہوات نفس کے اندھیرے مکانوں میں بند اور محبوس پڑے ہوئے ہیں، مگر مکان کے دروازے اور کھڑکیاں بند نہیں کیں۔ دلوں کے دروازے کھلے چھوڑ دیئے جن میں سے نورِ نبوت کا کچھ نہ کچھ چاندنا ان کے اندر ضرور پہنچ گیا۔ پس اگر وہ نورِ نبوت کی ہر وقت کی دید و شنید میں مشغول نہیں ہوتے تو کم از کم آفتاب نبوت کی چمک دمک سے محروم بھی نہیں ہوتے جس سے ان میں طبعی ظلمات کے ساتھ کچھ ایمانی نورانیت بھی سرایت کر گئی اور اس لیئے

جب وہ اس چاندنے کی طرف دیکھ لیتے ہیں تو صلاح و فلاح اور ہدایت کی طرف آنکلتے ہیں اور جب طبعی ظلمت کی طرف رُخ کر لیتے ہیں تو معاصی اور سیئات کا شکار ہو جاتے ہیں۔ مگر گناہ کو گناہ سمجھ کر کرتے ہیں۔ اس لئے ان سے توبہ کی توقع اور اس کی اُمید قائم رہتی ہے:

وَاٰخَرُوْنَ اعْتَرَفُوْا بِذُنُوْبِهِمْ خَلَطُوْا عَمَلًا صَالِحًا وَّاٰخَرَ سَيِّئًا عَسَى اللّٰهُ اَنْ يَّتُوْبَ عَلَيْهِمْ اِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ

اور جو کچھ اور لوگ ہیں جو اپنی خطا کے مقر ہو گئے۔ جنہوں نے ملے جلے عمل کئے تھے، کچھ بھلے اور کچھ بُرے۔ اللہ سے اُمید ہے کہ ان پر کچھ توجہ فرمائیں۔ بلاشبہ اللہ تعالیٰ بڑی مغفرت والے بڑی رحمت والے ہیں۔

کفار و منافقین

پانچواں درجہ آفتاب سے بعید تر حصوں کا ہے۔ جن کی سطح پر تو دھوپ پڑ جاتی ہے۔ مگر اندرونی گہرائی میں کوئی روشنی نہیں پہنچتی کہ سیاہ و سفید کا کوئی امتیاز پیدا کر سکے، اس کے حق میں رات اور دن برابر رہتا ہے۔ یہ حصہ سمندروں کی گہرائی کا ہے۔ جس میں اوپر کافی چمک مگر اندر اندھیرا ہے۔ یہ مثال منافقوں کی زندگی کی ہے۔ جنہوں نے نورِ ایمان کو سطح پر تو لے لیا ہے۔ مگر اندروں کو بند رکھ کر ظلماتِ محض چھوڑ دیا ہے اور چھٹا درجہ اس سے بھی زیادہ ظلماتی اور تاریک تر ہے اور وہ تہِ خاک تہ خانوں کا ہے کہ اس کا ظاہر و باطن دونوں ہی روشنی سے محروم رہتا ہے۔ نہ دھوپ قبول کرتا ہے نہ چمک گویا وہ زبانِ حال سے اعلان کرتے ہیں کہ نہ ہم روشنی قبول کریں گے اور نہ کر سکتے ہیں۔ گویا ہماری ساخت ہی اس لئے نہیں کہ ہم نورانی بنیں۔ یہ مثال کفار و معاندینِ حق کی ہے۔ جنہوں نے نہ آفتابِ نبوت کی کرنوں کو آنکھوں میں لیا نہ دھوپ کی سطح پر لیا اور نہ ہی اس کی چمک کو دل کے کسی حصہ میں آنے دیا۔ یعنی دلوں کے دروازے بھی سب بند کر لئے کہ اندر چمک تک نہ آسکے:

اَمْ عَلٰى قُلُوْبٍ اَقْفَالُهَا

یا ان کے دلوں پر قفل لگ رہے ہیں۔

اوپر سے آنکھیں بھی بند کرلیں کہ کسی بھی سوراخ سے نورِ نبوت کی کوئی شعاع اندر نہ پہنچ جاسکے۔

وَلَهُمْ اَعْيُنٌ لَّا يُبْصِرُوْنَ بِهَا — اور ان کی آنکھیں ایسی ہیں، جن سے نہیں دیکھتے۔

اسی کے ساتھ آنکھوں پر پٹی بھی چڑھالی کہ دیکھنے کا احتمال بھی باقی نہ رہے۔

وَعَلٰٓى اَبْصَارِهِمْ غِشَاوَةٌ — اور ان کی آنکھوں پر پردہ ہے۔

اور اوپر سے اوندھے منہ بھی لیٹ گئے کہ نگاہوں میں روشنی آنے کا کوئی امکان بھی باقی نہ رہے۔

اَفَمَنْ يَّمْشِيْ مُكِبًّا عَلٰى وَجْهِهٖٓ اَهْدٰٓى اَمَّنْ يَّمْشِيْ سَوِيًّا عَلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ — سو کیا جو شخص منہ کے بل گرتا ہوا چل رہا ہو وہ منزلِ مقصود پر زیادہ پہنچنے والا ہوگا، یا وہ شخص جو سیدھا ایک ہموار سڑک پر چلا جا رہا ہو۔

اور ساتھ ہی پختہ عزم بھی باندھ لیا کہ کچھ بھی ہو، اس حق کو قبول کرنا نہیں۔

بَلْ طَبَعَ اللّٰهُ عَلَيْهَا بِكُفْرِهِمْ فَلَا يُؤْمِنُوْنَ اِلَّا قَلِيْلًا — بلکہ ان کے کفر کے سبب ان کے قلوب پر اللہ تعالٰے نے بند لگا دیا ہے۔ سو ان میں ایمان نہیں، مگر قدرے قلیل۔

غرض کسی درجہ میں بھی انہوں نے آفتاب نبوت کی چمک دمک سے استفادہ گوارہ نہ کیا۔ بلکہ اس سے نفرت و عداوت کا مظاہرہ کیا۔ جس سے وہ کسی درجہ میں بھی روحانی روشنی اور رضائے الٰہی کی تابانی نہ پا سکے۔

پس جیسے مادی اشیاء آفتاب سے محروم ہو جانے پر اپنی صحت و توانائی اور مادی زندگی کو قائم نہیں رکھ سکتیں، ایسے ہی روحانیت طلبی کے دائرہ میں یہ ظلمانی انسان بھی آفتابِ نبوت سے محروم ہو کر اپنی روحانی صحت و توانائی ہمیشہ کے لئے کھو بیٹھے اور ابدی ہلاکت کے مورد بن گئے۔ کیونکہ جیسے مادی زندگی کا ضامن مادی آفتاب ہے، ایسے ہی روحانی زندگی

کا ضمانت دار یہ روحانی آفتاب ہے۔

بہر حال سراج منیر کی اس تمثیل سے آفتاب نبوت کے افادہ اور اس سے امت کے استفادہ کے مراتب تشنگانہ بھی کھل گئے اور مستفیدوں کے درجات کا ایک اجمالی نقشہ سامنے آگیا کہ طبعی طور پر انسانوں میں بلحاظ قرب و بعد آفتاب یہی چھ مراتب نکل سکتے ہیں، بعض طبقات آفتاب نبوت کی تعلیم و تربیت سے ہر جہتی حیثیت سے منور ہو کر نور مجسم اور مظہر آفتاب بن گئے۔ جیسے صحابہ کرام بعض نے ظاہر و باطن دونوں کو یکسانی کے ساتھ منور کیا اور مظہر نور آفتاب بن گئے۔ جیسے آئمہ اور راسخین فی العلم، بعض کے باطن نے زیادہ اثر لیا۔ مگر ظاہر زیادہ نہ چمک سکا اور وہ مظہر ضیاء آفتاب بن گئے جیسے ارباب علم و معرفت۔ بعض کے باطن نے اثر کم لیا۔ مگر ظاہر زیادہ روشن ہو کر نمایاں ہوا اور وہ آفتاب کی ظاہری چمک دمک کا مظہر بن گئے۔ جیسے عوام مومنین اور بعض نے باطن کو یکسر بند کر کے محض ظاہر کو صورت چمک سے آراستہ دکھلانے کی کوشش کی اور وہ منافقین ہیں، بعض ظاہر و باطن دونوں کے لحاظ سے محروم اور تاریک رہے اور انہیں مظہریت کی کوئی نسبت بھی حاصل نہ ہوئی، جیسے کفار و منکرین بہر حال اس تمثیل سے اہل حق اور اہل باطل اور پھر اہل حق میں قبول حق کے درجات کی تفصیل سامنے آجاتی ہے جو آفتاب نبوت، تعلیم و تربیت اور تزکیہ و تأسّی سے امت میں پیدا ہوئے۔

خوارق و معجزات

پھر جس طرح آفتاب کی ایک تو روزانہ کی مقررہ عادی شان ہے کہ وہ عادت عامہ کے مطابق طلوع ہو کر دنیا کو اپنی تنویر و تاثیر سے روشنی اور گرمی پہنچاتا ہے، ہر کس و ناکس کو ملتی ہے اور اس کی فیض رسانی سے ہر ایک درجہ بدرجہ مستفید ہوتا اور اسے جانتا پہچانتا ہے۔ لیکن اسی کے ساتھ اس کی ایک غیر معمولی اور غیر عادی شان بھی ہے کہ اس کی اسی روشنی اور گرمی سے جب کہ وہ سمٹ کر کسی چیز پر پڑے، عادت کے خلاف بھی کبھی کچھ آثار نمایاں ہوتے ہیں، جس سے اس کی خاص قوتوں کا اظہار ہوتا ہے۔ جیسے مثلاً اسکی

عام عادت محض اجالا کرنا اور اشیاء کو تپا دینا ہے۔ جلانا اور آگ لگانا نہیں، کہیں اگر آتشی شیشہ کے ذریعہ اس کی حرارت کو سمیٹ کر کسی چیز پر ڈالا جائے تو وہ کپڑے اور کاغذ وغیرہ میں آگ بھی لگا دیتا ہے یا جیسے آج کے بعض سائنسدانوں نے اس کی شعاعوں سے ایک خاص درجۂ حرارت جذب کر کے ایک ایسا چولہا ایجاد کر لیا ہے کہ اس پر محض سورج کی شعاعوں سے کھانا پکایا جا سکتا ہے یا جیسا کہ روسیوں نے سورج کی شعاعوں سے ایک ایسا بم ایجاد کر لیا ہے کہ اُسے روانہ کر دیا جائے تو وہ خود ہی مقام متعینہ پہ پہنچ جاتا ہے۔ اور مقررہ ساعتوں میں خود جل جاتا ہے اور لاکھوں کے لئے جان لیوا ثابت ہوتا ہے ظاہر ہے کہ سورج کا عام معتاد کام آگ لگانا اور مخلوق کو تباہ کرنا وغیرہ نہ تھا لیکن وہ خاص محرکات سے اپنی طاقتوں کو جب خاص طریقوں سے سمیٹ کر نمایاں کرتا ہے تو اس سے تعمیری اور تخریبی دونوں قسم کے کام اعجازی طور پر نمایاں ہوئے ہیں، چنانچہ اس نے کھانا بھی پکا دیا جو تعمیری انداز ہے اور کپڑے، کاغذ اور آدمیوں کو جلا کر خاک سیاہ بھی کر دیا جو تخریبی رنگ ہے یا مثلاً یوشع ابن نون علیہ السلام کے لئے باذن خداوندی آفتاب کا روک دیا جانا کہ اس نے اپنی معتاد حرکت چھوڑ کر قیام اختیار کر لیا تو دن وہیں کا وہیں ٹھہر رہا اور مغرب نہ ہوئی جب تک حضرت یوشع نے جنگ کو فتح نہ کر لیا یا جیسے قرب قیامت میں بلا کسی کی تحریک و دعاء از خود بامر خداوندی آفتاب کا مغرب کی جانب سے طلوع کرنا یا نصف النہار پر پہنچ کر مغرب ہی کی طرف لوٹ کر غروب ہو جانا یا دجال کے خروج کے وقت چالیس دن کے برابر ایک دن کا ہونا۔ گویا چالیس دن کے اندازہ کی برابر سورج کا اپنی حرکت سے رکا رہنا جس سے ایک دن چالیس دن کے برابر ہو جائے گا۔ وغیرہ وہ خاص افعال ہیں جو اس کی حرکت سے تعلق رکھتے ہیں، جس کے کم یا زیادہ ہونے سے پورے عالم کی زمانی مسافت گھٹ بڑھ گئی اور انقلاب عظیم رونما ہو گیا۔ ظاہر ہے کہ یہ سب امور عادت نہیں، خرق عادت ہیں، جو عالم کی تربیت میں موثر ہیں، ان سے یا تو کسی قوم پر اتمام حجت مقصود ہوتا ہے یا کسی قوم کی تقویت ایمان ملحوظ ہوتی ہے۔ بہر حال آفتاب مادی کے حق ہیں، یہ امور خرق عادت ہیں جو خاص خاص اوقات میں خاص مقاصد کے لئے ظاہر کئے جاتے ہیں۔

ٹھیک اسی طرح روحانی آفتاب کی بھی ایک عام اور معتاد چال ہے، جس سے اقوام عالم کو اپنے اپنے وقت پر علم الہٰی اور اخلاق ربانی کی روشنی اور گرمی ملتی رہتی ہے۔ لیکن کبھی کبھی عادت عامہ کے خلاف خرق عادت کے طور پر یہی علمی اور اخلاقی قوتیں علوِ باطنی سے کسی ایک نقطہ پر سمٹ کر نمایاں ہوتی ہیں تو ایسے عجائبات عالم کا ظہور ہوتا ہے۔ جو بشری طاقت سے خارج ہوتے ہیں، تاکہ اس کی نبوت کی کھلی دلیل دنیا دیکھ لے۔ لیکن یہ سب کچھ وہی علم و اخلاق کی طاقت ہوتی ہے۔ جسے اس کی طرف منسوب کیا جاتا ہے۔ چنانچہ سلیمان علیہ السلام کے عرش بلقیس اٹھوا منگانے کے واقعہ میں علم کی اس طاقت کی طرف قرآن نے اشارہ کیا ہے۔ جس سے اسے علم الہٰی کی قوتوں کا کرشمہ کہا جائے گا۔ گو ظہور اس کا پیغمبر کے ہاتھ پر ہو۔ فرمایا گیا:۔

قال الذی عندہٗ علمٌ من الکتٰب انا اٰتیک بہٖ قبل ان یرتد الیک طرفک۔

جس کے پاس کتاب کا علم تھا اور وہ اغلباً خود سلیمان علیہ السلام ہیں) اس نے کہا کہ میں اس (تخت) کو تیرے سامنے تیری آنکھ جھپکنے سے پہلے لا کر کھڑا کر سکتا ہوں۔

بہر حال علم کی قوت یا اس علم میں سمائے ہوئے اسمائے الہٰی کی قوت کی تاثیر سے پیغمبر کے ہاتھوں پر غیر معمولی رموز نمایاں ہوتے ہیں۔ جنہیں معجزہ کہا جاتا ہے۔ کیونکہ وہ عالم کو اپنا مثل لانے سے عاجز کر دیتے ہیں۔

پس آفتابِ نبوت کی ایک روشنی اور گرمی تو وہ ہے۔ جو عادتاً اس کے علم و اخلاق سے چھن چھن کر مخلوق پر برستی رہتی ہے۔ کہیں کبھی خرقِ عادت کے طور پر یہی قوت غیر معمولی انداز میں نمایاں ہوتی ہے۔ کبھی تعمیری صورت سے اور کبھی تخریبی رنگ سے جیسے غزوۂ خندق کے موقعہ پر دو روٹیوں کے ٹکڑے سینکڑوں انسانوں کے پیٹ بھرنے کے لئے کافی ہو گئے کہ یہ تعمیری صورت تھی اور غزوۂ بدر کے موقعہ پر چند کنکروں سے جو پیغمبر نے اٹھا کر پھینک دیں، سینکڑوں کفار کے دماغ پاش پاش ہو گئے کہ یہ تخریبی

صورت تھی یاایک طرف تو فتح بغداد کے موقعہ پر حضرات صحابہ کے گھوڑے دریائے دجلہ کے ہاتھی ڈبان پانی میں کشتیوں سے بھی زیادہ تیز دوڑ پڑے تاکہ ایمان والوں کو فتح مبین نصیب ہو کہ یہ کرامت صحابہ بھی بالواسطہ پیغمبری کا معجزہ تھی اور دوسری طرف ہجرت کی روپوشی پر سراقہ بن مالک کا گھوڑا سخت زمین پر بھی نہ چل سکا اور اس کے پیر زمین نے پکڑ لئے تاکہ کفار پیغمبری کی سراغرسانی نہ کرسکیں۔ ایک تعمیر کی صورت تھی اور ایک تخریب کی۔ مگر اللہ کے ان دونوں قسم کے افعال کا مورد جس سے خدائی کام نمایاں ہوئے وہی علمی اور اخلاقی یعنی روحانی قوت تھی جو پیغمبر کے اندر سے ہو کر گزرتی اور اس نے خرق عادت کی صورت اختیار کر لی۔ پس جیسے مادی آفتاب میں عادت اور خرق عادت دونوں قسم کے افعال موجود ہیں۔ ایسے ہی روحانی آفتاب میں بھی عادت اور خرق عادت دونوں قسم کے افعال موجود ہیں، جو اپنے اپنے موقعہ پر صادر ہوئے۔ فرق اتنا ہے کہ مادی آفتاب کے خوارق میں براہِ راست خدائی ارادہ کام کرتا ہے۔ خود آفتاب کے ارادہ یا ہمت کو دخل نہیں اور روحانی آفتاب کے خوارق میں ارادۂ خداوندی بذیل ہمت نبوی ہی نمایاں ہوتا ہے۔ اس لئے یہ معجزات نبی کی طرف منسوب ہوتے ہیں۔ بہر حال سراج منیر کی تمثیل سے جیسے آفتاب نبوت کے عادی افعال تعلیم و تربیت وغیرہ واضح ہوئے تھے۔ ویسے ہی خوارق اور معجزات کا ثبوت بھی ملا۔ جو اس آیت (آیت عنوان وسراجاً منیرًا) کا مدلول ثابت ہو گا۔

دلیل آفتاب نبوت کی واقعیت و صداقت

اس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ جیسے عام ستاروں کے طلوع و غروب کا کوئی عمومی علم نہیں ہوتا۔ بلکہ فن ہیئت کی فنی دلیلوں اور خارجی وجوہ سے معلوم کرتے ہیں کہ کونسے ستاروں کے طلوع کا کون سا وقت ہے۔ اور وہ کتنے زمانے میں اپنا دورہ پورا کرتا ہے۔ کب طلوع ہوا اور کب غروب ہوا۔ بلکہ طلوع ہو جانے پر بھی اس کے طلوع کا متعین علم نہ ہونے کے سبب خود وہ اپنے علوم کی دلیل نہیں بنتا۔ جب تک کہ فن نجوم کے

قواعد سے مدد نہ لی جائے۔ خود ان ستاروں کی چال سے یہ سب باتیں محسوس نہیں کی جاسکتیں، بخلاف آفتاب کے کہ اس کے طلوع کا ہی عام علم ہوتا ہے۔ بلکہ پہلے سے رہتا ہے اور اس آثار طلوع خود اس کا پتہ دیتے رہتے ہیں اور ساتھ ہی اس کے طلوع ہو جانے کے بعد اس پر یقین لانے کے لئے کسی بیرونی اور خارجی دلیل کی ضرورت نہیں ہوتی بلکہ ع

آفتاب آمد دلیلِ آفتاب   گر دلیلت باید از وے رومتاب

کا قصہ ہوتا ہے کہ اس کا طلوع و غروب حسی ہے، جس کے لئے صرف آنکھ کی ضرورت ہے، قواعد فن کی ضرورت نہیں وہ ایک حسی اور بدیہی چیز ہے، پھر اسکی روشنی اور گرمی جو بدنوں نے اندر سمائی ہوئی ہے اور اس کا باجبروت روشن چہرہ جوانتہائی کے ساتھ نگاہوں کے سامنے ہوتا ہے، خود اس کے وجود کی ایک مستقل دلیل ہوتا ہے۔ باہر سے کسی فنی دلیل کی ضرورت نہیں پڑتی، ورنہ دنیا کے عوام اور بکثرت خواص میں کون فن ہیئت سے واقف ہے، مگر آفتاب سے سب واقف ہیں، ٹھیک اسی طرح نجوم نبوت یعنی انبیاء علیہم السلام کے ظہور ان کے علوم و کمالات اور ان کی خدمات کا علم کسی کو بھی بداہتہً نہیں بلکہ فنِ تاریخ پر یا دلائل عقلیہ صحیحہ سے پرکھنے پر موقوف ہے غرض براہِ راست انبیاء کی سیرتوں اور ان کی لائی ہوئی روشنیوں کا براہِ راست کسی کو علم نہیں بخلاف آفتاب نبوت جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے کہ آپ کی لائی ہوئی صداقت کے لئے کسی خارجی یا منطقیانہ اور فلسفیانہ دلیل کی حاجت نہیں، اس کے پھیلے ہوئے علم کی روشنی اور اس کی اخلاقی اور عملی سیرت کی گرمی اور تاثیر جو شعوری اور غیر شعوری طور پر اقوام عالم کی روحوں کے اندر اتری ہوئی اور ان پر چھائی ہوئی ہے، خود اس کے وجود کی شاہد عدل ہے، نیز اس کا مثالی چہرہ جو پاک زندگی کی صورت میں ہر وقت ان کی نگاہوں کے سامنے رہتا ہے، اس کی صداقت کے لئے کافی دلیل ہے۔

گر دلیلت باید از دے رومتاب

کیونکہ اخلاق و عمل کا وہ کردار جو خاتم النبیین سے ظہور پذیر ہوا اور عمیق ترین علوم

سے نکلے ہوئے وہ جامع مقاصد انسانیت جو ختم المرسلین سے وجود پذیر ہوئے، نہ اگلوں میں نظر آتے ہیں نہ پچھلوں میں، جس کی وجہ یہی ہے کہ آگے اور پیچھے آفتاب کے سوا کوئی دوسرا آفتاب ہی نہیں کہ ایسی روشنی اور گرمی اور ایسا تاباں چہرہ کسی اور کا ہو۔ اسلئے صداقت کے ثبوت کے لئے یہی روشنی و گرمی اور اس کی مثالی سیرت کافی ہے۔ جو ہر کچے پکے گھرانے میں پہنچ رہی ہے۔ خواہ بطور رغبت خواہ بجبوری۔ بعزِ عزیز وَ ذلِّ ذلیل :۔

چنانچہ وہ اعترافات اور بیانات جو دنیا کی اقوام کے ذمہ داروں نے آپ کی صداقت کے سلسلہ میں دیئے ہیں، درانحالیکہ انہوں نے آپ کا اتباع نہیں کیا۔ اس کا بیّن ثبوت ہیں، گویا آپ کی امتیازی فضیلت و بزرگی کے اعتراف سے اغیار بلکہ مخالفین کو بھی چارۂ کار نہ رہا۔ آپ کا سب سے بڑا دشمن ابوجہل ہی تھا۔ (جسے فرعونِ امت کا لقب ملا ہوا ہے) گھر میں بیٹھ کر آپ کی سچائی کا قائل تھا اور سارے ہی مشرکین عرب باوجود شدید عداوت کے آپ کو صادق اور امین کہتے تھے اور دعوئ نبوت کے بعد بھی یہ اعتراف ان کے دلوں سے نہیں نکلا تھا مگر حَسَدًا مِّنْ عِنْدِ اَنْفُسِهِمْ :۔ زبانوں پر انکار اور جحود آ گیا تھا۔ اس لئے باوجود انکار کے بھی وہ معترف ہی کہے جائیں گے۔ اسلئے قرآنِ کریم نے ان کے استفہام اقراری کے لہجے میں فرمایا۔

اَمْ لَمْ یَعْرِفُوْا رَسُوْلَهُمْ فَهُمْ لَهٗ مُنْكِرُوْنَ :۔	کیا لوگ اپنے رسول کو پہچانتے نہیں جو منکر بن رہے ہیں؟ یعنی ضرور پہچانتے ہیں، گو نفسانی اغراض و جذبات کی وجہ سے منکر ہیں۔

اہل کتاب گو عموماً آپ کے پیرو نہ بنے، مگر اپنی کتب سماوی کی خبروں اور آپ کی دیانت و صداقت کے روشن آثار دیکھ کر آپ کی صداقت کا اعتراف کرنے پر مجبور تھے بحیرا راہب جیسے لوگوں کی شہادت حتیٰ کہ نبوت سے قبل آپ کے آثار مقبولیت دیکھ کر اور علامات سے خاتم النبیین کو پہچان کر ابو طالب کو آپ کی حفاظت پر نصرانی راہبوں کا

آمادہ کرنا اور یہ کہنا کہ انہیں یہود سے محفوظ رکھنا یہاں تک کہ بعد نبوت بعض یہود آپ کی خدمت میں حاضر ہو کر کھلے لفظوں میں آپ کی صداقت و نبوت کا اقرار کرتے ہوئے پائے گئے۔ جیسا کہ ترمذی میں صفوان بن عسّال کی روایت میں ہے کہ دو یہودیوں نے (جب کہ حضورؐ نے خود انہی کے مذہب کے اصول پر اُن کو یوم سبت وغیرہ کے بارہ میں نصیحت فرمائی) آپ کے ہاتھ اور قدم چومے اور کہا کہ ہم گواہی دیتے ہیں کہ آپ پیغمبر ہیں۔ گو آپ کے متبع نہ بنے۔ نیز عموماً یہود من حیث القوم اس صداقت کو جانتے تھے۔ مگر سرکشی اور جحود سے انکار کرتے تھے۔ چنانچہ ان کے اعتراف کے بارہ میں قرآن نے فرمایا:۔

یعرفونهٗ کما یعرفون ابناءهم وَاِنَّ فریقاً منهم لیکتمون الحقّ وَهُمْ یعلمون ۝	وہ لوگ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو ایسا پہچانتے ہیں، جس طرح اپنے بیٹوں کو پہچانتے ہیں اور بعضے ان میں سے امر واقعی کو باوجود یکہ خوب جانتے ہیں، اخفا کرتے ہیں۔

مگر پھر ان کے جحود و سرکشی کے بارہ میں بھی فرمایا:۔

وَجَحَدُوا بِهَا وَاستیقنتها انفسهم ظُلْمًا وَعُلوًّا ۝	اور ظلم اور تکبر کی راہ سے ان کے منکر ہو گئے۔ حالانکہ ان کے دلوں نے ان کا یقین کر لیا تھا۔

اگلوں ہی پر موقوف نہیں، آج کے متمدن اقوام کے لیڈروں اور ذمہ داروں کے وہ بیانات جو آئے دن اخباروں میں چھپتے رہتے ہیں اور سیرت کے جلسوں میں زبان پر آتے رہتے ہیں، جن میں منہ بھر بھر کر حضور کی امتیازی شانوں کو سراہا جاتا ہے۔ اس کے شاہد عدل ہیں کہ آفتاب نبوت کے طلوع کے بعد بھی اعترافات کا سلسلہ قائم ہے۔ سو یہ اعترافات کسی منطقی دلیل سے ظہور میں نہیں آئے۔ بلکہ صرف آپ کی سیرت پاک کے پاکیزہ کردار اور آپ کے مثالی اور معیاری علوم کمالات اور اقوام و امم میں پھیلے ہوئے آپ کے اثرات اور آپ کی بین الاقوامی برکات زبانوں اور ان کے دلوں میں آئے یعنی آفتاب اپنی دلیل

خود ثابت ہوا۔ غرض اس تمثیل سے حضورؐ کے ممتاز کمالات کا اعتراف دوست دشمن اور ہر کس و ناکس کی زبان زد ثابت ہوا جو ستاروں میں آفتاب کی شان تھی۔

ناگزیر اعتراف

اس تمثیل (سراج منیر) کو سامنے رکھ کر منکروں کے اس جبری اعتراف کو یوں سمجھئے کہ جس طرح سورج کی روشنی سے کوئی کتنا ہی بھاگے، وہ خود اس کا پیچھا کرتی ہے اور بالآخر اُسے تنگ کر اور اس میں گھس کر اس سے اپنا اعتراف کرا لیتی ہے، کیونکہ کوئی بھی اس کے وسیع ترین دائرۂ اثر سے باہر نکل کر کسی اور سورج کی عملداری میں نہیں جا سکتا۔

زمان ہو یا مکان جب ہر جگہ سورج ہی کی عملداری ہے تو ان احاطوں سے نکل کر کوئی باہر جا بھی کیسے سکتا ہے؟ اسی طرح آفتابِ نبوت کی صداقت سے کوئی کتنا ہی بھاگے صداقت خود اس کا پیچھا نہیں چھوڑتی، حتیٰ کہ وہ ارادہ و شعور سے نہیں مانتا تو زبردستی اس کا دل مانتا ہے اور یہ صداقت اس کے ضمیر میں گھس کر رہتی ہے، کوئی اندھے سے اندھے کوٹھے میں بھی گھس جائے، روشنی کسی نہ کسی درجہ میں وہاں بھی پہنچ کر رہتی ہے۔ پس کوئی تاریک سے تاریک دل انسان بھی آفتابِ نبوت کی صداقت سے انکار نہیں کر سکتا۔ چنانچہ آج بھی اور آج سے پہلے بھی دنیا کی اقوام کی شہادتیں جو انہوں نے پیغمبر اسلام کے بارہ میں دی ہیں اور ان کے قلوب اس کے سامنے جھک رہے ہیں، اس کی شاہد عدل ہیں جیسا کہ اس پر مستقل رسالے اور مقالات لکھے گئے اور مطبوعہ موجود ہیں، کیونکہ دورہ محمدیؐ کے بعد جب کہ کوئی اور نبوت اور کوئی پیغام آنے والا نہیں تو لامحالہ اسی ایک پیغام کی روشنی سارے عالم میں پھیل جانی ضروری تھی، چنانچہ آج دنیا کی قوموں میں نہ صرف آپ کی حقانیت کا زبانی ہی اعتراف کیا جا رہا ہے، بلکہ دین اور سیاست دونوں کے لحاظ سے اسلامی ہی اصول عملاً قبول کئے جا رہے ہیں جو برابر پھیلتے اور مروّج ہوتے جا رہے ہیں، اس حقیقت کی طرف کلامِ نبوت میں بایں الفاظ رہنمائی فرمائی گئی ہے۔

لایبقیٰ علیٰ ظھر الارض بیت مدر ولا وبر الا ادخلہ اللہ کلمۃ الاسلام بعز عزیز وذل ذلیل (فیکون الدین کلہ للہ)

زمین کی پشت پر کوئی کچا اور پکا گھر ایسا باقی نہیں رہے گا کہ جس میں اللہ تعالیٰ اسلام کے کلمہ کو داخل نہ کر دے، عزت والے کی عزت اور ذلت والے کی ذلت کے باوجود اور تمام تر دین صرف اللہ ہی کا ہو گا۔

نہیں بلکہ اگر اس عالم کو بھی چھوڑ بھاگے اور دنیا سے گزر کر عالم قبر اور عالم برزخ میں بھی پہنچ جائے۔ وہاں بھی جس طرح مادی آفتاب کی روشنی اس کا پیچھا کرتی ہے، ایسے ہی روحانی آفتاب کی روشنی بھی پیچھا نہیں چھوڑتی، یہ دونوں آفتاب ان کی روشنیاں بلکہ ان دونوں آفتابوں کی صورت مثالی وہاں بھی آنکھوں کے سامنے آ کر رہتی ہے کہ وہاں بھی ان سے اور ان کے کمالات کے اعتراف سے چارہ کار نہیں رہتا، چنانچہ بتصریح حدیث نبوی جب میت کو قبر میں لٹا دیا جاتا ہے اور اس کا دینی امتحان لینے کے لئے ملائکہ برزخ سوال کرنے آتے ہیں تو اس وقت میت کو یوں نظر آتا ہے کہ آفتاب غروب ہونے کے قریب ہے، دھوپ پر زردی آ چلی ہے اور دن ختم ہو رہا ہے اور آفتاب مغرب کے قریب پہنچ چکا ہے تو یہ مرد صالح جو دنیا میں نماز کا خوگر اور دلدادہ تھا اک دم گھبرا کر ان ملائکہ سے کہتا ہے کہ دعونی اصلی (ہٹو جی مجھے چھوڑو، میں نماز پڑھ لوں، وقت نکلا جا رہا ہے) یہ مادی آفتاب کی صورت مثالی ہوتی ہے جو سامنے آ جاتی ہے۔ پس آفتاب کی صورت اور اس کی حقیقی غرض وغایت نے وہاں بھی اس کا پیچھا نہ چھوڑا، اسی طرح ملائکہ برزخ جب اس میت سے نبی کریم علیہ السلام کے بارے میں یہ پوچھتے ہیں کہ من ھذا الرجل، (یہ کون شخص ہیں؟) تو شراح حدیث کی شرح کے مطابق آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی مثالی صورت یا عینی صورت اسے دور سے نظر پڑتی ہے۔ تاآنکہ وہ اپنے ضمیر کی شہادت سے پہچان لیتا ہے اور پکار اٹھتا ہے کہ یہ تو میرے وہی پیغمبر ہیں، جن کی عقیدت وعظمت دنیا میں میرے دل کی امانت رہی ہے اور فوراً گواہی دیتا ہے کہ یہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم ہیں جو ہمارے پاس ہدایت نامہ خداوندی لے کر آتے تھے۔ البتہ جس نے دنیا میں باوجود ضمیر کی شہادت کے

انکار کی مشق کی اور تعصب و عناد سے خود اپنے ضمیر کو جہالت کی حیرت کا شکار بنائے رکھا جس سے یہ تحیر و تجاہل ہی اس کا جوہر نفس بن گیا تو قبر میں بھی نہ آفتاب مادی کی صورت دیکھ کر نماز کی طرف دوڑے گا اور نہ روحانی آفتاب کی مثالی صورت دیکھ کر اسے پہچانے گا بلکہ وہی جہل و تحیر کا اظہار کر دے گا کہ ھاہ ھاہ لا ادری ہکا بکا ہو کر کہے گا کہ میں تو واقف نہیں کہ یہ کون ہیں؛ بہر حال اس سے واضح ہے کہ عالم برزخ میں جس طرح مادی آفتاب کی صورت مثالی دکھائی جاتی ہے، جس سے عمل و عبادت اور نماز کا امتحان مقصود ہوتا ہے، اسی طرح آفتاب روحانی کی صورت مثالی بھی دکھائی جاتی ہے، جس سے عقیدہ و فکر کا امتحان مقصود ہوتا ہے۔ غرض حسی صداقت ہو جو مادی سورج میں ہے یا معنوی صداقت ہو، جو روحانی سورج میں ہے، ایک فطرت ہے جو کسی حال آدمی کا پیچھا نہیں چھوڑ سکتی خواہ وہ دنیا میں رہے یا عالم آخرت کو سدھار جائے، اب کوئی قبول ہی کا ارادہ نہ کرے تو اس سے صداقت میں فرق نہیں پڑتا۔ پس آفتاب نبوت کی ناگزیری اعتراف اور اس کا اپنی دلیل خود ہونا بھی اسی تمثیل سے نمایاں ہو گیا۔ اس کی ایک بڑی وجہ یہ بھی ہے کہ آپ نے دنیا میں تشریف لا کر تمام انبیائے سابقین کی تصدیق کرائی اور تکذیب کی خوئے بد جو تعصب و عناد سے پیدا ہوتی ہے۔ مٹا دی۔ پس کسی بھی نبی کا کوئی پیرو ہو، جب کہ اس کے نبی کی تصدیق اس سے کرائی جائے گی تو کیسے ممکن ہے کہ وہ اس تصدیق سازی کے قول کی تکذیب کر دے، ورنہ اس سے خود اپنی تکذیب لازم آجائے گی تو کون ہے جو اپنے کو خود جھوٹا کہے، اس لئے بدیں وجہ بھی حضور کی تصدیق اقوام کے لئے ناگزیر ہے کہ آپ سارے انبیاؑ کے مصدّق خود بھی ہیں اور ساری دنیا سے ان کی تصدیق کرانے آئے ہیں، گویا انبیاء سابقین کی نبوتوں کا تحفظ بھی ختم نبوت کا ایک مقبول کام ہے۔ غور کرو تو ختم نبوت کا یہ مقام بھی اس مادی آفتاب کی تمثیل سے واضح ہو جاتا ہے۔ قرآن نے اپنا لقب مصدق ذکر کیا ہے۔ مُصَدِّقٌ لِمَا بَیْنَ یَدَیْہِ۔ مُصَدِّقٌ لِّمَا مَعَکُمْ وغیرہ غور کرو تو حضور کی تصدیق عام کی یہ وجہ بھی اسی سراج منیر کی تمثیل سے واضح ہوتی ہے۔

عمومی تصدیق

کیونکہ جیسے طلوع آفتاب کے بعد ستاروں کی روشنیاں مٹ نہیں جاتیں اور نہ ان کی تاثیرات گم ہوتی ہیں، بلکہ باقی رہتی ہیں، مگر سورج کے نور کی تیزی اور غلبہ کی وجہ سے ان کا وجود الگ سے دکھائی نہیں دیتا وہ نور آفتاب سے گم ہو کر اسی کے ضمن میں مل جل رہتی ہیں اور یقین ہوتا ہے کہ وہ اس نور میں کھپی ہوئی موجود ہیں، جو دنیا پر بہ ضمن آفتاب پڑ رہا ہے، گویا آفتاب زبانِ حال سے یہ کہتا ہوا آتا ہے کہ چونکہ میرے نور میں سب کے انوار مجتمع ہیں، اسلئے میں سب کو لے کر آیا ہوں، میرا نور قبول کرنا سب کے انوار کو قبول کرنا ہے۔ میری تصدیق سب کی تصدیق ہے اور میرا انکار سب کا انکار ہے۔ اسی طرح آفتاب نبوت کے طلوع کے بعد انبیائے سابقین کے علوم و مآثر کو آفتاب نبوت نے مٹا نہیں دیا ہے۔ بلکہ باقی رکھا ہے چنانچہ اسی لئے ان کی تصدیق ضروری قرار دی ہے۔ مگر یہ سب علوم و کمالات آفتاب نبوت کے عظیم نور میں اس حد تک گم ہیں کہ ان کا مستقل وجود الگ سے نہیں نظر آسکتا۔ لیکن وہ ختم نہیں ہوئے۔ دور رس نگاہوں کو ان کے وجود کا علم و یقین حاصل رہتا ہے۔ اس لئے اس آخری شریعت کے ضمن میں ان سابقہ شریعتوں پر ایمان لانا ضروری قرار دیا گیا۔ بلکہ اس شریعت پر ایمان لانا ہی ساری شریعتوں کو مان لینا ہے کہ وہ سب کی سب اس جامع الشرائع شریعت میں موجود ہیں۔ اس لئے جیسے مادی آفتاب ستاروں کی روشنیوں کو جھٹلاتا ہوا نہیں آتا، بلکہ انہیں اپنی ضمن میں لے کر ان کی حفاظت کرتا ہوا آتا ہے اور ان کے وجود کو اپنے ضمن میں زندگی دوام بخشتا ہوا آتا ہے۔ ایسے ہی آفتاب نبوت نے سابقہ نبوتوں کے علوم کو اپنے اندر کھپا کر انہیں ضائع ہونے سے بچالیا ہے اقوام نے انہیں مسخ کیا، ضائع کیا، لیکن قرآن نے ان کی تصدیق کی۔ انہیں اپنے اندر جگہ دی اور اپنی دوامی بقاء کے ساتھ انہیں بھی باقی دوام بنا دیا اسی لئے ان کی تصدیق ضروری قرار دی اور تکذیب سے باز رکھا اور کھلا اعلان کر دیا کہ میں سب کے علوم لے کر آیا ہوں۔

اوتیتُ علم الاوّلینَ والاٰخِرِین۔ میں اگلوں اور پچھلوں سب کے علوم عطا کیا گیا ہوں۔ اس لئے میری تصدیق سب کی تصدیق اور میرا انکار سب کا انکار ہے۔ بلکہ انبیاً سابقین

ہیں سے کسی ایک کا بھی اِنکار سب کا انکار ہے۔ کیونکہ اَب سب کے انوار مجھ میں مل کر ایک ہو گئے ہیں۔ اس لئے کسی ایک کے ساتھ تصدیق وتکذیب کا معاملہ سب کے ساتھ سمجھا جائے گا۔ بالخصوص جبکہ خود ان انبیائے سابقین کی سابقہ نبوتوں کے صحیفوں میں پہلے سے بھی اِس صحیفۂ خاتمیت (قرآن) کا نور پھیلا ہوا تھا۔

وَاِنَّہٗ لَفِی زُبُرِالاولین ۔ اور اُسکا ذکر پہلی اُمتوں کی کتابوں میں ہے۔

تو اس حالت میں ان صحف کو جھٹلانا خود اپنے کو جھٹلانا ہے۔ جس کی کوئی دانشمند جرأت نہیں کر سکتا، اس لئے تصدیق عام کا فرمان ان جامع الفاظ میں دیا گیا۔

قولوا اٰمَنَّا باللّٰہ وَمَآ اُنزل الینا وَمَآ اُنزِلَ اِلٰی ابراھیمَ وَاِسمعیلَ واسحٰق ویعقُوبَ والاسباط ومآ اوتِیَ موسیٰ وَعیسیٰ ومآ اُوتِیَ النَّبِیُّوْن من ربِّھم لا نفرقُ بَیْنَ اَحَدٍ مِنہُمْ وَنَحْنُ لَہٗ مُسْلِمُوْن ؛	کہہ دو کہ ہم ایمان رکھتے ہیں، اللہ تعالیٰ اور اس پر جو ہمارے پاس بھیجا گیا اور اس پر جو حضرت ابراہیم اور حضرت اسمٰعیل اور حضرت اسحاق اور حضرت یعقوبؑ اور اولادِ یعقوبؑ کی طرف بھیجا گیا اور اس پر بھی جو حضرت موسیٰ اور حضرت عیسیٰ کو دیا گیا اور اس پر بھی جو کچھ اور انبیا کو دیا گیا ان کے پروردگار کی طرف سے اسی کیفیت سے کہ ہم ان میں سے کسی ایک میں بھی تفریق نہیں کرتے اور ہم تو اللہ تعالیٰ کے مطیع ہیں

بہرحال اس سراجِ منیر کی اس تمثیل سے حضورؐ کی حفاظت ادیان سابقہ اور مصدّقیت علم بھی نمایاں ہو گئی، جو ختم نبوت کا (جس کی تشریح آگے آرہی ہے) اساسی اور بنیادی مقام ہے۔ وللہ الحمد

تمت بالخیر ——— (حصہ اوّل)

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

دوامِ ظہور

پھر اسی تمثیل سے حضور کے ان مخصوص اوصاف ومقامات پر روشنی پڑتی ہے، جو ذات بابرکات کو ممتاز طریق پر عطا ہوئے. مثلاً جس طرح سے کہ عام ستاروں کی ہمہ وقت ضرورت نہیں، بلکہ مدتہا مدت بھی ضرورت نہیں ہوتی، چنانچہ بعض ستارے سال میں ایک مرتبہ طلوع ہوتے ہیں، گویا سال بھر میں اپنا دورہ پورا کرتے ہیں، بعضے دس سال میں بعضے سو سال میں، بعضے ہزار سال میں، یعنی ہزاروں برس میں طلوع ہوتے ہیں، جن کے طلوع و غروب کا ہمیں علم بھی نہیں ہوتا، دنیا جانتی بھی نہیں کہ کس ستارے نے کس وقت طلوع کیا اور کب وہ غائب ہوگیا. گویا ان کا ظہور وقتی ہوتا ہے اور اس وقت ہی کی مصلحت سے ہوتا ہے. نہ ہمہ وقت وہ مصلحت درکار ہوتی ہے، نہ ہمہ وقت ان کا ظہور ہوتا ہے. جس کا مطلب یہ ہے کہ اگر وہ ہزاروں برس بھی ہماری نگاہوں سے بلکہ خود ہم سے اوجھل رہیں تو ہماری نگاہ اور ہماری اپنی دنیا میں اس سے کوئی نمایاں نقصان نہیں آتا. بالفاظ دیگر عالم ان کا زیادہ محتاج نہیں، لیکن آفتاب کو دیکھو تو بارہ مہینہ موجود اور چوبیس گھنٹہ میں اپنا دورہ پورا کرکے روزانہ ہمیں زیارت بھی کراتا ہے. نور بھی بخشتا ہے، گرمی بھی پہنچاتا ہے، اور راستے بھی دکھاتا ہے. پھر اگر وہ رات میں نگاہوں سے اوجھل اور غائب بھی ہوتا ہے تو صرف انہی سے جن کی مغرب میں وہ غروب ہو رہا ہے، لیکن وہ خطۂ دنیا سے غائب نہیں ہو جاتا، اگر یہاں غروب ہو رہا ہے تو دوسری جگہ طلوع بھی ہو رہا ہے اور جبکہ زمین

مدور کر دی ہے تو ہر ہر قدم پر اگر غروب ہے تو ہر ہر قدم پر طلوع بھی ہے۔ اسلئے وہ ہمہ وقت موجود اور فیض رساں ہے اگر کسی بھی خطے سے وہ مقررہ ساعتوں سے زیادہ غائب ہو جائے تو عالم تباہی کے کنارے آ لگے۔ اس لئے وہ ہمہ وقت دنیا اور بنی نوع انسان کے سامنے رہے۔ ورنہ لاکھوں ستارے ہیں کہ اول تو ان کے خصوصی ظہور اور طلوع ہی کا پتہ نہیں چلتا اور چلتا ہے تو عام ستاروں میں مِل جل کر ان کا ظہور بھی ہو جاتا ہے۔ جس کا دنیا کو احساس بھی نہیں ہوتا۔

ٹھیک اسی طرح نجوم نبوت یعنی انبیاء علیہم السلام کے ظہور کا ایک وقت، خاص مقرر تھا کہ وہ دنیا میں تشریف لائے اور اپنے نورانی آثار چھوڑ گئے۔ دس، بیس، سو، پچاس ہزار دو ہزار برس میں ایک نبی کے ظہور کا وقت آیا اور انہوں نے ایک مدت نمایاں رہ کر مخلوق کو راستہ دکھایا۔ لیکن جب غروب ہوئے تو آج ہزاروں نفوس ہیں کہ دنیا ان کے نام نامی تک سے واقف نہیں اور یہ بھی نہیں جانتی کہ دلوں پر ان کے اثرات کیا تھے اور باقی ہیں یا ختم ہو گئے اور نہ ہی دنیا اسکی تمنا ہی کر سکتی ہے کہ وہ اثرات پھر لوٹ آئیں، جبکہ وہ اثرات متعارف ہی نہیں اور نہ ان کی ضرورت ہی دلوں میں آئی ہوئی ہے لیکن آفتاب نبوت کا ظہور دوامی از روز اول تا آخر ہے یعنی اس کا دورہ بارہ کے بارہ مہینہ کا ہے۔ حتیٰ کہ اس ظاہری ظہور سے پہلے آپ ہی کا علمی ظہور تھا۔ عہد الست میں آفتاب نبوت ہی کے بلیٰ (کیوں نہیں بیشک آپ ہمارے رب ہیں) کہنے سے سب انبیاء و اولیاء و صلحا کی زبانوں پر بلیٰ کا ایمانی کلمہ جاری ہوا، جیسا کہ حدیث الست سے نمایاں ہے۔ پھر ہر نبی آپ کی بشارت دیتا ہوا آیا، اور حضرت عیسیٰ کی بعثت کا تو بڑا مقصد ہی یہ بشارت دینا تھا جیسا کہ قرآن شاہد ہے پھر اسی ازل میں سب سے آپ کا یہ علمی ظہور دکھلا کر آپ کے ماننے اور اطاعت کا عہد لیا گیا۔ جیسا کہ آیت میثاق سے واضح ہے پھر پیدائش کے وقت رحم مادر میں توحید کے ساتھ آپ کی رسالت ماننے کی تجدید کی جاتی ہے اور فرداً فرداً ہر ایک سے وہی عہد لیا جاتا ہے۔ جو اجتماعی طور پر یوم الست میں لیا گیا تھا۔ جیسا کہ روایات حدیث میں موجود ہے۔

پھر دنیا میں ہر نبی نے اس آفتابِ نبوت کی بشارت دی اور اپنی قوموں سے عہد لیا کہ اگر وہ ان کے سامنے آئیں تو سب ان کی اطاعت کریں۔ جیسا کہ قرآن نے اس میثاق کو کھول کر بیان فرمایا۔ پھر آپ ہی کی یہ قرآنی تعلیم قرونِ سابقہ کی تمام آسمانی کتابوں میں کام کرتی رہی وانہ لفی زبر الاولین۔ گویا آپ علم و آثار اور اپنے نام اور کام کے لحاظ سے امم و اقوام سابقہ میں ظاہر و نمایاں اور متعارف رہے۔ پھر قبر میں بھی آپ کو یا آپ کی صورت مثالی یا صورت صفاتی کو دکھلا کر پھر اس عہد سابق کے بارہ میں امتحانی سوالات کئے جاتے ہیں جس سے ظاہر ہے کہ برزخ میں بھی آپ کا ظہور ہے۔ پھر عالم حشر میں آپ ہی کے جھنڈے کے نیچے سب اقوام و امم ہونگی، آپ ہی کی طرف سارے بنی آدم مل کر شفاعت کبریٰ کے لئے رجوع کرینگے۔ جس سے عالم آخرت میں بھی آپ کے ظہور کا صاف پتہ ملتا ہے۔ غرض زمانہ الست سے لے کر رحم مادر و دار دنیا، دنیا کے قرون و دہور، عالم برزخ اور عرصاتِ قیامت تک کونسا عالم ہے۔ جس میں آپ کا ظہور نہیں اور وہ بھی ایک ایسے امتیاز کے ساتھ جو اور کسی کو میسر نہیں۔ حاصل یہ ہوا کہ آفتاب کی طرح اگر آپ کسی جہان سے کسی وقت غائب بھی ہوتے تو کسی جہان میں علمی ظہور کے ساتھ آپ نمایاں بھی رہے۔ آپ دنیا میں تھے تو عالم غیب میں آپ کے آثار صالح پھیلے ہوئے تھے اور اب عالم آخرت میں ہیں تو عالم دنیا میں آپ علمی ظہور کے ساتھ جلوہ گر ہیں۔ چنانچہ آپ کا عظیم الشان زندہ معجزہ ہی علمی ہے، جو قرآن کی صورت میں دنیا پر ضیاء پاشی کر رہا ہے اور اس معجزہ کی زندہ شرح حدیث پاک کی صورت میں جلوہ گر ہے جو سند صحیح اور اعلیٰ تاریخی اصولوں کے ساتھ ہمارے ہاتھوں میں ہے اور پھر اس کتاب و سنت کی زندہ تفصیلات فقہ و تصوف اور کلام وغیرہ کی صورت میں ہماری آنکھوں کو روشن کئے ہوئے ہیں، جو ذوق نبوی کی حامل اور با ذوق راسخین فی العلم کے قلوب صافی پر الہام شدہ ہیں۔ اس لئے واسطہ بلا واسطہ آثار نبوت اسی شان سے دنیا میں آج بھی جلوہ پیرائی کر رہے ہیں جس شان سے وہ قرن اول میں ضیاء پاشی کر رہے تھے۔

ے ہنوز آن ابر رحمت درفشان است
خم و خمخانہ با مہر و نشان است

یہ ضیاء افگنی اور علمی ضوافشانی اتنی کھلی ہوتی ہے کہ ساری دنیا ان اصول و علوم سے زندگی حاصل کر رہی ہے۔ پس یہ آفتاب نبوت گویا اولین و آخرین کی نگاہوں کے سامنے ہر وقت موجود اور جانا پہچانا ہے۔ جس کے اثرات کو دنیا کھلی آنکھوں محسوس کر رہی ہے، حضور کی اس موجودگی یا حیات کو کوئی کور باطن حاضر و ناظر کے معنی میں نہ لے کہ حاضر و ناظر خاصۂ الوہیت ہے۔ مخلوق میں جو ظہور تمام باذن اللہ ہو سکتا ہے۔ حضور سے بڑھ کر کسی کو نصیب نہیں پس آفتاب مادی کی طرح یہ آفتاب روحانی بھی عالم کائنات میں اگر ایک جگہ غائب ہے تو دوسری جگہ حاضر ہے اور جہاں سے غائب ہے۔ وہاں اس کے علمی اثرات قائم رہتے ہیں۔ اس لئے گویا وہاں سے بھی غائب نہیں ہوتا۔ ورنہ اگر اس کے اثرات عالم سے ایک لمحہ کے لئے بھی منقطع ہو جائیں تو دنیا کی روحانیت تباہ ہو جائے تو نہ دنیا کا موجودہ تمدن ہی برقرار رہ سکتا ہے نہ ذہنیت میں وسعت باقی رہ سکتی ہے۔ آفتاب نبوت کا دوامی ظہور اس تمثیل سے ثابت ہو جاتا ہے۔

۵۲

عظمت و شہرت عامہ قبول عام اور پیروی اقوام

پھر جس طرح سارے ستاروں میں آفتاب ہی سب سے زیادہ رفیع و بلند پُر نور اور بزرگ ترین ستارہ ہے۔ نیز سب ستاروں سے زیادہ جانا پہچانا اور سب سے زیادہ مشہور ہے کہ نہ اس کی شہرت کی حد کو کوئی ستارہ پہنچا ہوا ہے اور نہ رفعت و عظمت ہی اس جیسی رکھتا ہے۔ چنانچہ کتابوں اور کہاوتوں تک میں جو شہرت اسکی ہے۔ وہ کسی ستارہ کی نہیں۔ اکثر و بیشتر ستاروں کے تو نام تک سے بھی دنیا واقف نہیں نہ ان کا کوئی مخصوص ذکر زبانوں اور قلموں پر ہے اور نہ ان کی کوئی یاد ہی دلوں میں ہے اور جن چند ستاروں کے

اسماء معلوم بھی ہیں، جیسے زہرہ، مشتری، زحل، مریخ، عطارد وغیرہا تو وہ زیادہ تر جنتریوں کی زینت ہیں۔ خواص وعوام میں سے بہت کم لوگ ہیں جو ان ناموں سے واقفیت رکھتے ہیں۔ بخلاف سورج کے کہ کوئی فرد بشر اس سے اور اس کے نام سے ناواقف نہیں اور کون ہے جو اس کی صورت زیبا اور سیرت نور افزا سے باخبر نہ ہو۔ حتیٰ کہ بہت سی قومیں تو اُسے معبود کی حیثیت سے جانتی ہیں، طلوع وغروب کے وقت اس کے سامنے سجدہ ریز ہوتی ہیں، حتیٰ کہ ابلیس کو بھی صورت معبودیت بنانے کے لئے اسی کی آڑ لینی پڑتی ہے کہ عین طلوع وغروب کے وقت اسی کو سر پر لے کر کھڑا ہوتا ہے: تاکہ سجدے کرنے والی قوموں کا سجدہ اپنے حق میں تصور کر کے دل ہی دل میں خوش ہو کر یا وہ صورتًا ان کا معبود بن گیا ہے۔ یا غیر اللہ کی پرستش کرانے میں وہ سورج کی معرفت کامیاب ہو گیا۔ بہر حال ابلیس لعین روسیاہ بدنام کو بھی اپنی نام نہاد بڑائی میں چار چاند لگانے کے لئے سورج کی ضرورت پڑتی ہے۔ ظاہر ہے کہ سورج کی اس عمومی شہرت وعظمت اور اس عمومی وخصوصی تعارف کی بناء بجز اس کے فیضان عام کے اور کیا ہو سکتی ہے۔ کیونکہ فضاء اور سطح زمین کا ذرہ ذرہ اس کی تنویر اور تاثیر سے فیضیاب اور اس سے روشنی اور گرمی کا فیضان لئے ہوئے ہے تو عدم تعارف کے کوئی معنی ہی نہیں ہو سکتے۔

ٹھیک اسی طرح آسمان نبوت کے تمام ستاروں میں آدمؑ سے لے کر حضرت مسیحؑ تک آفتاب نبوت کو جو عظمت و رفعت اور جو شہرت و وجاہت حاصل ہے، وہ کسی سیارے کو نہیں، ہزارہا نجوم نبوت (انبیاء علیہم السلام) ہیں۔ جن کے اسماء گرامی سے بھی دنیا واقف نہیں ہے۔ جن کا آج کوئی تذکرہ تک نہیں، قرآن نے بھی فرمایا۔

نمنهم من قصصنا عليك ومنهم من لم نقصص عليك	پس انبیاء میں سے کچھ وہ ہیں، جنہیں ہم نے آپ کے سامنے بیان کیا اور کچھ وہ ہیں جنہیں بیان نہیں کیا۔

قرآن کریم یا کتب تاریخ کی بدولت جن کے اسماء معلوم بھی ہیں، جیسے موسیٰ وعیسیٰ، یونسؑ سلیمان، یعقوب ویوسف، داؤد وشعیب، یحییٰ وزکریا، ارمیا، شعیا اور دانیال وغیرہ علیہم السلام،

ان کی مکمل تاریخ نامعلوم اور جس حد تک ہے بھی تو وہ ہر قوم میں یکساں متعارف نہیں، کوئی قوم کسی پیغمبر کو جانتی ہے اور کوئی کسی کو کیونکہ کوئی بھی ان میں سے عالمی پیغمبر نہیں تھا۔ اور عالمی پیغام لے کر نہیں آیا تھا کہ پورا عالم اس سے واقف ہوتا اور پوری دنیا پر اس کا فیضان عام ہو جاتا۔ نہ ان میں سے کسی نے سلاطین عالم کو فرامین ہدایت بھیجے۔ نہ کسی نے دنیا کے تمام انسانوں کو خطاب کر کے اپنے پیغام سے آشنا کیا اور نہ وہ پیغام ہی عالمی اسپرٹ اپنے اندر رکھتا تھا کہ ایسا کیا جاتا۔ کیونکہ نجوم ہدایت کا نور محدود اور بلا پھیلاؤ کے ہوتا ہے۔ اس لئے نجوم کا تعارف بھی عمومی نہیں اور رفعتِ ذکر بھی عام نہیں۔

لیکن آفتابِ نبوت سیدالمرسلین صلی اللہ علیہ وسلم کا اسم گرامی دنیا کی ہر قوم میں معروف، آپ کی شہرت آسمانوں اور زمینوں میں یکساں، بحر و بر اور صحرا و بیاباں میں اذانوں کی آوازیں گونجتی ہیں، جن میں اللہ کے نام کے ساتھ نام نامی کا تذکرہ لازم ہے۔ ورفعنالک ذکرک کوئی جگہ نہیں جہاں آپ کے علوم کی روشنی نہ پہنچی ہو اور کوئی خطہ نہیں، جہاں آپ کی اخلاقی تاثیرات و برکات نہ پھیلی ہوں، جس کی وجہ وہی ہے کہ آپ کا فیضان عام پوری دنیا کو پہنچا کیونکہ آپ مقامی پیغمبر نہ تھے، بلکہ آپ عالمی پیغمبر اور پورے عالم انسانیت کے مصلح اور مربی تھے، آپ کا پیغام کسی ایک قوم یا ایک طبقہ کے لئے خاص نہ تھا۔ بلکہ عمومی تھا۔ شرعی حیثیت سے بھی، تاریخی حیثیت سے بھی اور تمدنی حیثیت سے بھی شرعی طور پر دیکھو تو قرآن نے آپ کو رحمتہ للعالمین، نذیر للعالمین کہا۔ جس سے آپ کا سب جہانوں کے لئے رحمت ہونا اور سارے جہانوں کے لئے ہادی و نذیر ہونا واضح ہے، پھر ان دونوں اوصاف کے ساتھ آپ کی رسالت کو سارے انسانوں کے لئے بنایا گیا اور کہا گیا اور آپ کی رحمت ممالک دنیا میں پھیلی اور عام ہوئی۔

وَمَا اَرْسَلْنٰكَ اِلَّا كَافَّةً لِّلنَّاسِ بَشِيْرًا وَّ نَذِيْرًا۔	اور ہم نے تو آپ کو تمام انسانوں کیلئے بشیر و نذیر بنا کر بھیجا ہے۔

آپ کو ارشاد فرمایا گیا کہ جہانوں کے سارے انسانوں کو خطاب فرمائیں،

قُلْ يٰۤاَيُّهَا النَّاسُ اِنِّىْ رَسُوْلُ	آپ فرما دیجئے کہ اے لوگو میں تم سب کی

الله الیکم جمیعاً ۔ طرف رسول بنا کر بھیجا گیا ہوں۔

اس لئے روم و شام، مصر و فلسطین، ایران و توران، ہند و سندھ، یورپ و ایشیاء افریقہ و امریکہ، چین و روس، افغانستان و ترکستان، جاوا و سماٹرا غرض مشرق و مغرب میں آپ کی امت پھیلی اور آپ کا ملک وسیع ہوا۔ تاریخی حیثیت سے دنیا اُسے مان چکی ہے کہ آپ علمی مصلح اور عالمگیر تعلیم لے کر آئے ہیں اور دنیا اس تعلیم کو قبول کرنے پر مجبور بھی ہے۔ جو آپ کی نبوت کو نہیں بھی مانتے۔ وہ بھی آپ کو دنیا کا سب سے بڑا حکیم اور سب سے بڑا دانا اور عاقل ضرور تسلیم کرتے ہیں۔ آپ کے تعلیم فرمودہ اصول سے فائدہ اٹھا رہے ہیں۔ بلکہ زندگی کے ہر شعبہ میں استفادہ کرنے پر مجبور ہیں۔

توحید کامل کا پیغام آپ ہی نے دیا جو مذہب کی جان اور روح رواں ہے۔ اسی توحید کی گونج کا نتیجہ تھا کہ عیسائیوں میں پروٹسٹنٹ فرقہ پیدا ہوا۔ جس نے تثلیث سے بیزاری کا اظہار کر کے وحدانیت کا درس قبول کیا۔

انہی توحیدی مواعظ کا نتیجہ تھا کہ ہندوؤں میں آریا مت کھڑا ہوا۔ جس نے توحید کا نام لینا شروع کیا۔

انہی توحیدی تعلیمات کا ثمرہ تھا کہ ہندوؤں میں سکھوں کا فرقہ توحید کا نام لیوا بن کر کھڑا ہوا۔ جس کے بانی گرونانک صاحب نے حضرت بابا فرید شکر گنج سے مستفید ہو کر توحید کی اشاعت شروع کی۔

اسی توحیدی تربیت کا نتیجہ ہے کہ آج بت پرست قومیں بھی بت پرستی کو عیب اور شک کی نگاہ سے دیکھنے لگیں۔ معاشرت کی لائن کو دیکھو تو اونچ نیچ مٹا کر مساوات کا درس آپ نے دیا اور دنیا کی قومیں اس اصول کو اپنانے پر مجبور ہو گئیں، بالخصوص آج کے مشینی دور میں جبکہ پوری دنیا ایک عائلہ اور ایک قبیلہ بن چکی ہے اور اقوام عالم میں ایک دوسرے سے خلط ملط ہو جانے کی وجہ سے عوامیت اور عمومیت ابھر رہی ہے جس میں مساوات کے بغیر چارہ کار نہیں ہے۔ اس لئے اونچ نیچ والی قومیں بھی آج اونچ نیچ کو لعنت قرار دینے لگی ہیں۔ نسلی امتیازات کو تحقیر کی نگاہ سے دیکھا جا رہا ہے۔ یہ درس

انہیں کہاں سے ملا؟ بلاشبہ وہیں سے ملا ہے۔ جہاں سے بطور اصول اعلان کیا گیا تھا کہ

۱۔ ان الناس کلھم اخوۃ (حدیث نبوی) — تمام بنی آدم بھائی بھائی ہیں۔

۲۔ یاایھا الناس انا خلقناکم من ذکر و انثیٰ (القرآن) — اے انسانو! ہم نے تمہیں ایک مرد اور ایک عورت سے پیدا کیا۔

۳۔ کلکم بنو ادم و ادم من تراب (حدیث نبوی) — تم تمام اولادِ آدم ہو اور آدم مٹی سے بنائے گئے۔

آج ہندوستان کے وزیر اعظم (مسٹر نہرو) اعلان کرتے ہیں کہ اگر عالمیت چاہتے ہو تو نسلی امتیازات ختم کرو۔ چھوت چھات کی لعنت دور کرو۔ اونچ نیچ مٹاؤ! گاندھی جی بھنگی بستی میں ٹھہرتے ہیں اور ہریجنوں کیلئے مندر کھلوانے کا پرچار کرتے ہیں۔ پنتھ جی چماروں کے گھر کے گلاس میں دودھ پیتے ہیں۔ آخر کار چھوت چھات کے دلدادوں کو یہ تعلیم کہاں سے ملی؟ کوڈ بل کے پاس کرانے پر آج تعلیم یافتہ ہندو کیوں تلے ہوئے ہیں جو سرتاسر فقہ اسلامی کا چربہ ہے۔ میراث بنات، تعداد ازدواج، طلاق بل، خلع بل وغیرہا کا اسمبلیوں میں کیوں چرچا ہے؟ مسئلہ غلامی کی تحقیر پر آج کیوں نظر ثانی کی جا رہی ہے؟

سیاسی لائنوں میں بادشاہت لیڈری کی شکل میں کیوں آرہی ہے؟ گدی نشینی کے بجائے انتخاب اصلح کا اصول کیوں جاری ہو رہا ہے؟ شخصی استبداد کے بجائے رائے عامہ کی اہمیت کیوں پیدا ہو رہی ہے۔ جس سے امراء و سلاطین ہمیشہ گریزاں اور متنفر رہتے تھے۔ تنگدلی کے بجائے رواداری کا درس آج کس نے دیا ہے، تعصب کو بری نگاہوں سے کیوں دیکھا جا رہا ہے۔ جو اب تک بقاء قومی کا بنیادی اصول سمجھا جاتا تھا آج اسٹیجوں پر دوسروں کے مقتداؤں کی تعریف وہ لوگ کیوں کرنے لگے ہیں، جن کی مذہبی بنیادیں ہی مقتدایان مذاہب کی تحقیر پر قائم تھیں؟ جن کے یہاں مذہب تکذیب غیر کا نام تھا۔ نہ کہ تصدیق غیر کا۔ آج یہ نفرت کی بنیادیں کیوں بری سمجھی جا رہی ہیں اور انہیں فرقہ واریت بتا کر ان کے مقابلہ میں بین الاقوامی موانست کا پرچار کیوں کیا جا رہا ہے؟ یہ بلاشبہ صرف اسی

آفتاب نبوت کی روشن تعلیمات سے شعوری اور غیر شعوری طور پر متاثر ہونے کا ثمرہ ہے۔ جس نے عالمیت کی طرف دنیا کو بلایا۔ سب مقتدایان مذاہب پر ایمان لانا سکھلایا جس نے ایمان کے سلسلہ میں تفریق بین الرسل کو ممنوع قرار دیا۔ سارے انسانوں کو بھائی بھائی کہا۔ ساری دنیا کو پیغام امن سلامتی دیا۔ سارے انسانوں کو بلا تفریق نسل و رنگ ایک ذاتِ واحد کی طرف بلایا اور اس پر جمع کر دیا۔ ساری اقوام کو قوم واحد بنانیکا اصول رکھا۔ سلاطین عالم کو فرامین بھیجے۔ قیصر و کسریٰ کی جابرانہ اور مستبدانہ سیاستوں کو الٹ کر اخلاقی سیاست پھیلائی۔ پوری دنیا میں اپنے نقیب بھیج کر پیغامِ فطرت پہنچایا جو ہر قوم کے لئے یکساں قابلِ قبول تھا۔

یہی وہ عالمگیر فیض رسانی تھی جس سے آپ کی مقبولیت عالمگیر شہرت و عظمت عالمگیر اور معرفت و پہچان عالمگیر ہوئی۔ جیسا کہ ستاروں میں آفتاب کی ہے۔ پس دنیا اور انبیاء کے ناموں تک سے واقف نہیں کہ ان کی روشنی پھیلتی ہوئی روشنی نہ تھی۔ لیکن آپ کی تعلیمات آفتاب کی دھوپ کی مانند تھیں۔ جنہوں نے دن بھی کر دیا اور ذرہ ذرہ پر پھیل کر ہر فردِ بشر کے سامنے اپنے کو خود روشناس کرا دیا۔ اس لئے کوئی وجہ نہ تھی کہ آفتابِ نبوت کو پورا عالم جان نہ جاتا اور پہچان نہ لیتا، نیز سارے نجوم نبوت میں اس کی یہ امتیازی معرفت و پہچان عام نہ ہو جاتی۔

جامعیت شئون

پھر آفتاب میں جہاں جامعیت کی شان بھی موجود ہے۔ وہ جلاتا بھی ہے اور بجھاتا بھی ہے۔ اس میں سوز و تپش بھی ہے اور خنکی و برودت بھی ہے۔ جلال بھی ہے اور جمال بھی ہے۔ کیونکہ اس مادی آسمان پر جب سورج طلوع کرتا ہے تو یہ کھلی ہوئی بات ہے کہ بے تحاشا گرمی برسنے لگتی ہے۔ جس سے اشیاء تپ جاتی ہیں اور سوختہ ہو جاتی ہیں اور اسی آسمان پر چاند بھی طلوع کرتا ہے۔ جس سے ٹھنڈک برسنے لگتی ہے اور چیزیں ٹھنڈی ہو جاتی ہیں۔ اگر سورج کی گرمی نہ برسے تو اشیاء میں حرارتِ عزیزی نہ رہے جو منشاء حیات ہے اور اگر چاند کی ٹھنڈک نہ برسے تو پھلوں میں رس، نلیوں میں گودا اور چھلکوں میں مغز پیدا نہ ہو، جو شے کی زندگی کی بنیاد ہے۔ چنانچہ ہڈیاں اگر خشک ہو جائیں، پھل رس نہ رہنے کی وجہ سے سوکھ جائیں،

اور چھلکے مغز کو کھو کر خشکی سے سکڑ جائیں تو یہی ان کی فنا ہے جس سے واضح ہے کہ جہاں اشیاء کے لئے خشکی کی ضرورت ہے۔ وہیں تری کی بھی حاجت ہے اور یہ دونوں چیزیں آسمان نے جمع کر رکھی ہیں خشکی کو سورج لاتا ہے اور تری کو چاند، لیکن غور کرو تو یہ تری بھی سورج ہی لاتا ہے کیونکہ چاند میں خود اپنی کوئی روشنی نہیں۔ وہ تو ایک شفاف آئینہ کی طرح ہے جس کی چمک دمک اور نورانیت سب آفتاب کا فیض ہے۔ اس لئے چاند میں درحقیقت آفتاب ہی کا نور ہے۔ فرق اتنا ہے کہ خود چاند کے ظرف میں کچھ ٹھنڈک کی خاصیتیں رکھدی گئی ہیں جس سے سورج کا نور اس میں پہنچکر رنگ بھی بدل دیتا ہے۔ اس کی تیزی او خیرگی بھی باقی نہیں رہتی اور تپش بھی تبدیل ہو جاتی ہے کہ شعلہ باری باقی نہیں رہتی اور روشنی کا نام بھی بدلدیتا ہے کہ دھوپ کے بجائے اُسے چاندنی کہنے لگتے ہیں۔ لیکن ہوتا ہے۔ وہ سورج ہی کا نور پس چاند کی ٹھنڈی روشنی درحقیقت سورج ہی کی روشنی ہے جو مقامات خصوصیات سے کچھ تبدیلیاں پیدا کر لیتی ہے۔ جیسے بجلی کو ہیٹر میں دوڑا دیا جائے تو کمرے گرم ہو جاتے ہیں اور اسی بجلی کو ایئر کنڈیشن کے طور پر اسکی مشین میں دوڑا دیا جائے تو کمرے ٹھنڈے ہو جاتے ہیں۔ پس بجلی کی اصل تو درحقیقت ناریت اور تیزی ہے۔ لیکن ایئر کنڈیشن کے راستے سے اسے لایا جائے تو وہی تیزی اور گرمی ٹھنڈک میں تبدیل ہو جاتی ہے۔ جو مشین اور اس کے ظرف کی خاصیت ہوتی ہے، اس لئے کہہ سکتے ہیں کہ بجلی ہی آگ جلانے اور بجھانے کے دونوں کام کرتی ہے صرف ظرف کی خصوصیات بدلتی ہیں بجلی نہیں بدلتی، ٹھیک اسی طرح سورج کے نور میں بھی گرمی اور جو چاند کے ظرف کی خصوصیت ہے۔ ٹھنڈک دونوں کی خاصیتیں موجود ہیں۔ فرق ہے تو یہ کہ گرمی بلا واسطہ ہے جو سورج کی اصل خاصیت ہے اور ٹھنڈک بواسطۂ چاند ہے جو چاند کے ظرف کی خصوصیت ہے۔ مگر نور دونوں جگہ سورج ہی کا کام کرتا ہے۔ اس لئے ان دونوں حالتوں کو سورج ہی کی شانیں کہا جائے گا کہ وہ جلاتا بھی ہے اور بجھاتا بھی ہے گرماتا بھی ہے اور ٹھنڈا کرتا بھی ہے۔ صرف واسطہ اور بلا واسطہ کا فرق ہے۔ لیکن اگر نگاہ کو اور گہرا لیجایا جائے تو واضح ہوگا کہ چاند کے واسطہ کے بغیر بھی سورج براہ گرمی اور

ٹھنڈک دونوں بیک آن جمع ہیں۔ کیونکہ سورج جہاں سمندروں کو تپاتا ہے جس کا کام ہی جلانا اور تپانا ہے۔ وہیں اس تپش سے ان میں ابخرات بھی اٹھاتا ہے جو مانسون لیکر ٹھنڈا پانی دنیا پر برساتے ہیں جس سے گرمیاں بجھتی چلی جاتی ہیں اور یہ سب کچھ سورج ہی کا فیض ہوتا ہے۔ وہ نہ ہو تو سمندروں میں بخارات بھی نہ اٹھیں، مان سون بھی نہ بنے اور ٹھنڈے پانی سے دنیا محروم ہو جائے۔ اس سے نمایاں ہے کہ سورج ایک ہی وقت میں سمندروں میں تپش اور ٹھنڈک کے دونوں سامان پیدا کرتا ہے۔ پھر بحر ہی میں نہیں بر میں بھی یہ دونوں کیفیات سورج ہی کی ذات سے نمایاں ہوتی ہیں۔ عین گرمی کے شدید میں جس آن سورج زمین کی سطح کو تپاتا ہے اسی آن زمین کے اس اندرونی حصہ کو ٹھنڈک بھی بخشتا ہے چنانچہ اوپر کی گرمی جتنی شدید ہوتی ہے اندرونی ٹھنڈک اسی حد تک بڑھ جاتی ہے۔ گرمیوں میں پانی تک زمین کے اندر سے ٹھنڈا نکلتا ہے۔ لیکن سردی کے موسم میں اس کا عکس ہوتا ہے، یہی آفتاب جب زمین کے اوپر کے حصہ کو گرمی کم دیتا ہے گویا اس میں ٹھنڈک ملا دیتا ہے تو زیر زمین گرمی بڑھا دیتا ہے۔ حتیٰ کہ سردیوں میں پانی بھی زمین کے اندر سے گرم نکلنے لگتا ہے، تہ خانے بھی گرم ہو جاتے ہیں اس سے صاف نمایاں ہے کہ سورج چاند کے واسطہ کے بغیر بھی سردی و گرمی اور حرارت و برودت کی دونوں شانیں اپنے اندر ملی جلی لئے ہوئے ہے جس سے واضح ہوتا ہے کہ جامعیت اضداد اس کی خاص شان ہے اگر گرمی میں یہ زمین کی ذاتی ٹھنڈک تھی تو سردیوں میں یہ ذاتی وصف کہاں گم ہو جاتا ہے اور کیوں گم ہو جاتا ہے اور زمین کے اندر کی گرمی اصل اور ذاتی ہے تو گرمی میں وہ کیوں زائل ہو جاتی ہے اور اگر زمین کی یہ سردی گرمی ذاتی نہیں، بلکہ آفتاب کا اثر ہے تو یہی ہمارا مدعا ہے۔ جس سے نمایاں ہو جاتا ہے کہ سورج بحر و بر میں گرمی و خنکی دونوں کے آثار نمایاں کرتا ہے۔ ٹھیک اسی طرح آفتاب نبوت بھی جلال و جمال نرمی و گرمی، مہر و قہر دونوں شانیں اپنے اندر لئے ہوئے ہے۔ جس سے اس کا کمال اعتدال ثابت ہوتا ہے۔ حضرت خاتم الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم ایک طرف رحمت مجسم ہیں تو دوسری طرف غضب مجسم بھی ہیں۔ ارشاد نبوی ہے

بعثت مرحمۃ و ملحمۃ — میں رحمت مجسم بنا کر بھیجا گیا ہوں اور غضب مجسم بنا کر بھی۔

اور فرمایا گیا۔

انا الضحوک القتال — میں بہت ہنس مکھ بھی ہوں اور بہت جنگی بھی ہوں۔

چنانچہ ایک طرف آپ کی شریعت میں عفو و درگزر، نفی جرم، عذر پذیری، مصالحت وچشم پوشی انتہائی ہے جو مہر کی شان ہے اور دوسری طرف حدود و قصاص، سزا و تعزیر، جہاد و قتال اور کفارات بھی مکمل پیمانہ پر ہیں جو قہر و سیاست کی شان ہے۔ پس جیسے اس آفتاب روحانی کی روشنی سے مہر و رحمت ٹپکتی ہے۔ ویسے ہی قہر و سیاست بھی چھنتی ہے اور جیسے وہ جمال کا مصدر ہے۔ ویسے ہی جلال کا مظہر اتم بھی ہے۔

اسی لئے اس روحانی آفتاب کو "سراج منیر" فرمایا گیا۔ "سراج" کے لفظ سے جلال و قہر اور گرمی کا ثبوت ملتا ہے۔ اور "منیر" کے لفظ سے ٹھنڈک اور جمالی شان کا پس لفظ سراج سے گویا نذیر للعالمین کی شان نمایاں ہے اور منیر کے لفظ سے رحمۃ للعلمین کی شان واضح ہے اور یہ دیانت و سیاست کے دونوں نور ایک ہی ذات میں جمع کرائے گئے۔ ایک طرف حکم ہے:۔

خذ العفو وأمر بالمعروف و اعرض عن الجاهلين: — آپ عفو اور درگذر اختیار کریں، بھلائی کا حکم کریں اور جاہلوں سے اعراض کریں۔

اور دوسری طرف حکم ہے۔

یا ایها النبی جاهد الکفار و المنافقین واغلظ علیهم: — اے نبی صلعم مخالفوں سے جہاد کیجئے اور ان پر سختی کیجئے۔

ایک طرف فتح مکہ کے وقت مکہ میں آپ لشکرِ جرار کے ساتھ مسلح داخل ہوتے ہیں۔ جو قہر و سیاست کی شان ہے اور اسی آن تواضع اور خاکساری اور شفقت کا یہ عالم ہے کہ شدت تواضع سے گردن جھکی ہوئی ہے۔ حتیٰ کہ اونٹ کی گردن کے قریب سر مبارک آیا ہوا ہے

اور اس عام کا اعلان فرماتے جاتے ہیں۔ پس انذار بھی ہے اور تبشیر بھی، مہر بھی ہے اور قہر بھی، دیانت بھی ہے اور سیاست بھی، فقیری بھی ہے اور شاہی بھی، آپ ہی کی روحانی قوتیں جب صدیقِ اکبرؓ میں سے ہو کر گذرتی ہیں تو وہ رحمتِ محضہ اور جمالی صورت میں نمایاں ہوتی ہیں اور وہی قوتیں جب فاروقِ اعظمؓ میں سے گذرتی ہیں تو جلالی اور سیاسی شان اختیار کر لیتی ہیں، مگر دونوں میں نور ایک ہی آفتاب کا کارفرما تھا۔ غرض اس آفتابِ نبوت اور سراجِ منیر میں نرمی و گرمی دونوں بیک وقت ملی جلی قائم ہیں۔ پس جیسے سورج کی تشبیہ سے آفتابِ نبوت میں اجتماعیت کبریٰ کی شان ثابت ہوتی تھی، ویسے ہی اس تشبیہ سے اس میں جامعیت جلال و جمال کی شان بھی ہویدا ہو جاتی ہے اور ایک ذات میں دونوں متضاد کمال جمع دکھائی دیتے ہیں، ورنہ پہلی امتوں میں یہ دونوں شانیں الگ الگ رہتی تھیں، انبیاء شرعی احکام دیتے تھے اور سلاطین و ملوک ان کا نفاذ کرتے تھے۔ یعنی دین اور سیاست دو طبقوں میں الگ الگ منقسم تھے گویا اس وقت کا دین مادی قوت و شوکت برداشت نہیں کر سکتا تھا کیونکہ اس وقت کی قومیں مزاج کی شدید قوتوں کے لحاظ سے قوی تر اور نفسانی قویٰ کے لحاظ سے شدید تر تھیں انہیں دین پر لانے کے لئے اس درجہ یکسوئی اور ترکِ دنیا کی ضرورت تھی کہ اس کے ساتھ دنیوی جاہ و جلال اور تاج و تخت کسی طرح جمع نہیں رہ سکتے تھے اگر جمع کئے جاتے تو اُن کی شدید نفسانی قوتیں اس کرّوفر سے نفسانی جذبات ہی کی طرف مائل ہو کر رہ جاتی اور روحانیت کا کوئی شمّہ اُن میں قائم نہ ہوتا۔ پس انبیاء کا گروہ تو اُن کے دلوں میں ترکِ دنیا کے مجاہدہ سے دین اور خدا ترسی پیدا کرتا تھا اور ان کی سرپرستی میں ملوک و سلاطین کا گروہ سیاسی قوت سے اس دین کو نافذ کرتا تھا۔ تب اقوام کا دین خالص ہوتا تھا۔ اس پر بھی عام قومیں دین اور روحانیت پر نہ آسکیں اور انبیاء کا مقابلہ کر کر کے ہلاک ہو گئیں، مگر امت مسلمہ آخری امت تھی، قدیم دنیا کے منقسم جلال و جمال کا ردّعمل دیکھ دیکھ کر اس کے قویٰ میں کمال اعتدال آچکا تھا اور جامعیت کی استعداد پیدا ہو چکی تھی۔ اس لئے اسے نبوت اور شریعت جامع دیدی گئیں اور ایک ہی ذات بابرکات (آفتابِ نبوت) میں یہ جلال و جمال کی دونوں شانیں رکھدی گئیں۔ جس سے دیانت میں سیاست اور روحانیت کے ساتھ ملوکیت مخلوط ہوئی۔ اس طرح الملک والدّین

توامان (ملک اور دین دو جوڑواں بچے ہیں جنہیں ایک دوسرے سے جدا نہیں کیا جا سکتا) کا ظہور ہوا گویا امم سابقہ میں ان دونوں چیزوں کی جدائی امتوں کے ضعف استعداد کے سبب سے تھی۔ اصل حقیقت نہ تھی یہ ضرور ہوا کہ بعض انبیاء علیہم السلام کو جہاد کا حکم دیا گیا اور ملک کا کوئی خاص حصہ فتح کرنے پر مامور فرمایا گیا۔ لیکن بعد از فتح پھر وہی دیانت وسیاست کی تقسیم ہوتی رہی، صرف اسلام میں جہاد اور فتح کے بعد دین وملک جمع کر دیئے گئے تھے جو ان کی اصلیت تھی، اس سے آفتابِ نبوت کی شانِ جامعیت اسی تمثیل سے نمایاں ہو جاتی ہے جو بہت سی شرعی نص کا مصداق ہے۔

جامعیت احوال

پھر اسی جامعیت کا ایک اور نمونہ اور ایک دوسرا پہلو بھی اسی تمثیل سے کھلتا ہے اور وہ یہ کہ آفتاب ہی کی ایک اور خصوصیت پر نگاہ ڈالنے سے نمایاں ہوتا ہے کہ اس کے دو رخ ہیں، ایک طرف تو وہ ہر آن دنیا کو نور وحرارت اور روشنی بخشتا رہتا ہے کوئی ایک لمحہ اس سے فارغ نہیں کہ اس سے نور وحرارت دنیا کو ملنا بند ہو جائے۔ عناصر اور موالید کو گرمانا اور روشن کرنا، ہر ایک کے گھر پر روشنی وگرمی ڈالنا، بیماروں کی طبیعتوں میں گرمی اور روشنی بھرنا، تندرستوں میں حرارت عزیزی کو ابھادنا، پھر اس روشنی اور گرمی سے دنیا کے کام کاج میں اعانت کرنا۔ جیسے مسافروں کے سفر کی تکمیل جو بلا روشنی کے نہیں ہو سکتی، معاش کی تکمیل جو بغیر روز روشن کے نہیں ہو سکتی۔ آتشگیر مادوں میں آتشیں مادے بھرنا۔ وہ طلوع نہ کرے تو کسی بھی آتشگیر مادے اور آتشدان ظرف میں آتشیں اثرات کا نام ونشان باقی نہ رہے۔ نہ چقماق سے شرارہ بلند ہو، نہ لوہے سے چنگاری پیدا ہو، نہ پتھر سے آگ نکلے، نہ پانی سے بجلی بنے، نہ سمندر سے مان سون اٹھے، نہ رطوبات فاسدہ خشک ہوں نہ مرطوب مزاجوں میں اعتدال پیدا ہو۔ جس سے واضح ہے واضح کہ سورج کا ایک ایک لمحہ تمام اشیاء کائنات کو فیض رسانی میں مشغول ہے۔ جسے خدمت خلق کا عنوان دیا جانا غیر موزوں نہ ہوگا۔

لیکن خدمتِ خلق کے ساتھ ساتھ اگر اس کے دوسرے حال پر نظر کیجائے تو نظر آتا ہے کہ اس کا کوئی لمحہ عبادت رب سے بھی فارغ نہیں ہے۔ کیونکہ حدیث ابوذر غفاری رضی اللہ عنہ میں ہے۔ وہ فرماتے ہیں کہ

كنت مع النبي صلى الله عليه وسلم في المسجد عند غروب الشمس فقال يا اباذر اتدري اين تذهب هذه الشمس ؟ قلت الله ورسوله اعلم قال تذهب لتسجد فتستأذن فيؤذن لها في الرجوع كما جاء (كما في رواية الترمذي واحمد) ويوشك ان تسجد فلا يؤذن لها فقال لها ارجعي من حيث جئت فتطلع من مغربها فذلك قوله عز وجل والشمس تجري لمستقر لها ؛	میں ایک دن مغرب کے وقت حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ مسجد میں تھا۔ حضور نے مجھ سے فرمایا۔ اے ابوذر جانتے ہو یہ سورج کہاں جاتا ہے میں نے جواب دیا۔ اللہ اور اس کا رسول ہی بہتر جانتا ہے آپ نے فرمایا (اس عرش کے پاس) جاتا ہے۔ سجدہ کرتا ہے اور اجازت چاہتا ہے پس جس طرح آیا تھا۔ اسی طرح جانے کی اجازت مل جاتی ہے۔ اور قریب ہے کہ سجدہ کرے اجازت نہ ملے۔ اور کہا جائے کہ جہاں سے آئے وہیں واپس جاؤ (پس یہی وہ قیامت کا قرب ہوگا) کہ سورج مغرب سے طلوع کریگا۔ پس یہی معنی ہیں۔ اللہ تعالیٰ کے قول "والشمس تجری لمستقر لہا" کے۔

مراد حدیث متعین کرنیکے لئے اس پر غور کیجئے کہ زمین گول ہے۔ جیسا کہ اپنی جگہ ثابت شدہ ہے اور آفتاب اس کے ارد گرد گردش میں ہے تو اس کا مطلب اس کے سوا اور کیا ہو سکتا ہے کہ ہر آن کہیں طلوع ہے اور کہیں غروب گویا ہر لمحہ وہ طلوع بھی کرتا ہے اور غروب بھی ہوتا ہے اور جبکہ ہر غروب کے بعد سجدہ کر کے نئے طلوع کی اجازت چاہتا ہے تو نتیجہ صاف نکلا کہ وہ ہر آن سجدے کرتا ہوا چلتا ہے۔ [illegible] اس چال سے ہر لمحہ اشیاء کو نور اور گرمی بخشتا ہے۔ اسی طرح اس حال میں ہر لمحہ سجدہ کرتا ہے جسے عبادت رب کہنا چاہیئے۔ گویا سورج کا ایک ایک لمحہ خدمتِ خلق اور

عبادتِ رب دونوں میں یکساں مشغول ہے۔ نہ خدمت خلق سے عبادت اُسے مشغول کرتی ہے اور نہ عبادتِ رب سے خدمت خلق میں فرق آتا ہے جس سے سورج کی جامعیت احوال واضح ہے۔

ٹھیک یہی صورت روحانی آفتاب کی بھی کہ ادہر تو شب و روز مخلوق خدا کی تربیت اور انہیں علم کی روشنی اور عشق الٰہی کی گرمی پہنچانا جس سے ایک منٹ فارغ نہیں تھا کیونکہ آپ کی پوری زندگی کو اسوۂ حسنہ کہا گیا ہے۔ جس کا ایک ایک لمحہ دین اور شریعت ہے۔ وہ قول ہو یا عمل، عادت ہو یا عبادت ہر ایک میں نمونۂ عمل اور ذخیرۂ اتباع و پیروی موجود ہے۔ آپ کا سونا ہو یا جاگنا سب نمونۂ شریعت ہے اور ظاہر ہے کہ یہ اتباع دین میں ہے۔ دنیا میں نہیں۔ اسلئے آپ کی پوری زندگی اور زندگی کا ایک ایک حرکت وسکون دین بخشنے والا ہے۔ جس کی تعبیر دوسرے لفظوں میں یہی ہو سکتی ہے کہ آپ کا ہر ہر لمحہ خدمتِ خلق اور تربیت مخلوق میں مصروف تھا لیکن اسی کے ساتھ آپ کا کوئی لمحہ یاد الٰہی اور ذکرِ خداوندی سے فارغ نہ تھا۔ صریح حدیث میں ہے:

کان یذکر اللہ علیٰ کل احیانہ — آپ ہر وقت اللہ کا ذکر کرتے رہتے اور

کان دائم الفکرۃ حزیناً — ہر وقت مستغرق اور حزین رہتے تھے۔

ہر لمحہ ذکر الٰہی میں اور ہر ہر دقیقہ فکر میں مشغول تھا کوئی گھڑی ذکر و فکر سے خالی نہ تھی اور سونے اور جاگنے کا کوئی عمل نہ تھا جس میں اخلاص کامل اور جہت کاملہ کی روح دوڑی ہوئی نہ ہو پس وہی ساری زندگی جو خدمت خلق میں لگی ہوئی تھی۔ وہی پوری کی پوری عبادت رب میں بھی مشغول تھی کہ لوجہ اللہ تھی۔ اسلئے ہر آن آپ شفقت علیٰ خلق اللہ میں بھی مشغول تھے اور ہر آن تعظیم لامر اللہ میں بھی لگے ہوئے تھے نہ خدمتِ خلق سے عبادت غافل بنا سکتی تھی نہ عبادتِ رب سے خدمت غافل کر سکتی تھی۔ اس لئے آفتابِ نبوت کی جامعیت احوال بھی اسی آفتاب مادی کی تمثیل سے واضح ہو گئی۔

رحمت مطلقہ

پھر جیسے سورج کے لئے طلوع وغروب رکھا گیا۔ طلوع سے وہ سامنے آجاتا ہے اور غروب سے پردہ کر لیتا ہے نہ ہر وقت موجود نہ ہر وقت غائب کیونکہ اسکی ہمہ وقت کی موجودگی بھی دنیا کے لئے باعثِ تباہی ہوتی۔ عدم تحمل کی وجہ سے، اور اس کی ہمہ وقت کی غیبت بھی دنیا کی بربادی کا باعث ہوتی۔ انقطاع حرارت کی وجہ سے، اس لئے اس کا ظہور بھی نافع ہے اور خفا بھی مفید اور دونوں ہی عالم کے لئے ضروری ظہور سے دنیا خود اس سے نور لیتی ہے اور اس کی استفادی صلاحیتیں بروئے کار آتی ہیں اور اس کے خفاء سے دنیا اپنے ان نور افگن اجزاء سے افادہ کرتی ہے، جن میں آفتاب کے فیض سے نور افگنی کی صلاحیتیں پیدا ہوتی ہیں اور دنیا میں نئی نئی قسم کی روشنیاں اور گرمیاں نمودار ہوتی ہیں۔ جس سے دنیا کی افادی قوتیں بروئے کار آتی ہیں، ٹھیک اسی طرح آفتاب نبوت کا دور بھی ظہور وخفاء پر مشتمل رکھا گیا۔ اس کے ظہور سے دنیا نے اس سے علم و اخلاق کی روشنی و گرمی حاصل کی، اپنے سینوں کو روشن کیا جس سے خالق و مخلوق کو اور ان کے فرق کو پہچانا، اپنا علم وعقیدہ درست کیا اور اس سے اپنا صحیح انجام اس میں دیکھا اور اس طرح روحانیت کا کارخانہ جاری ہوا۔ جس سے انسان کی اپنی روحانی زندگی کی تکمیل ہوئی، ظاہر ہے کہ طلوع آفتاب کے بغیر یہ ہدایت کی روشنی کسی طرح بھی نمایاں نہ ہوتی اور انسان ظلم وجہالت کی تاریکیوں میں پڑا رہ جاتا۔ جس سے ظاہر ہے کہ آفتاب نبوت کا طلوع عالم کے لئے ایک مستقل رحمت اور نعمت ہے۔ انا رحمة مھداة میں ایک رحمت ہوں جو بطور ہدیہ (عالم انسانیت) کو دی گئی ہے۔

لیکن غور تو آفتاب نبوت کا غروب اور پردہ کر لینا بھی کچھ کم رحمت نہیں۔ کیونکہ جیسے مادی آفتاب کے غروب کے بعد ہی لوگ جدوجہد کرتے ہیں کہ آفتاب کی بخشی ہوئی روشنی و گرمی جس جس مادہ میں بھی موجود ہے۔ اس سے نکال کر دنیا میں چاندنا کریں تو ان کی قوتِ ایجاد چراغ۔ لالٹین۔ گیس۔ لیمپ بجلی اور قمقمے دیا سلائی اور چقماق اور ٹارچ وغیرہ

کی طرف متوجہ ہوتی ہے اور رنگ برنگ کی روشنیاں دنیا میں نمودار ہوتی ہیں۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو انسان کی قوت ایجاد بروئے کار نہ آتی اور اس کی یہ ایجادی صلاحیتیں پردۂ عدم میں مستور پڑی رہ جاتی۔ ایسے ہی آفتاب نبوت کا غروب یا اس کی موجودگی میں اس سے یہ حسّی اور مکانی جدائی بھی اللہ کی ایک عظیم نعمت اور رحمت ثابت ہوئی۔ آفتاب نبوت کے پردہ کر لینے کے بعد ہی جبکہ دنیا اندھیر ہوگئی۔ ان وارثان نبوت میں جو روشنی بفیض نبوت آئی تھی، اس کے ظہور کا وقت آیا اور جس جس فرد میں اس آفتاب روحانی کی کوئی کرن پیوست تھی، اس سے استنباط کر کے حوادث میں اس نے راہ نکالی۔ نئے نئے مسائل رونما ہوئے اور لاکھوں وہ علوم و معارف جو نور نبوت کی شکنوں میں لپٹے ہوئے تھے شکنیں کھول لینے کے بعد ظاہر ہونے شروع ہوئے۔ جس سے دین ایک مرتب گلدستہ کی صورت میں دنیا کے سامنے آگیا۔ اگر آفتاب نبوت یہ ظاہری پردہ نہ کر لیتا تو کس کی مجال تھی کہ اس کے روبرو کوئی اپنے اجتہاد و استنباط سے کام لیتا۔ جس کا نتیجہ یہ ہوتا کہ امت کی اجتہادی صلاحیتیں کبھی بھی بروئے کار نہ آتیں۔ پس مادی آفتاب کے غروب سے جیسے کاشانی مادوں کی نور بخشی کی ایجادی صلاحیتیں کھلتی ہیں۔ ایسے ہی روحانی آفتاب کے غروب سے روحانی مادوں کی علم بخشی کی اجتہادی صلاحیتیں کھلیں۔ پس طلوع سے اگر نور گیری کی قوتیں کھلیں تو غروب سے نور بخشی کی صلاحیتیں نمودار ہوئیں۔ ایک سے استفادہ کی قوت نمایاں ہوئی اور ایک سے افادہ کی۔ گو ان دونوں حالتوں میں نور آفتاب ہی کا ہوتا ہے۔ جو ضیاء بخش ثابت ہوتا ہے مگر طلوع میں بلا واسطہ اور غروب میں بالواسطہ پس طلوع سے نبوت کا نور نمایاں ہوا اور غروب سے ولایت کا طلوع سے تقلید و اتباع کا رنگ کھلا اور غروب سے اجتہاد و استنباط کا جو بالواسطہ وہی نور نبوت ہے۔ صرف ظرف کی خصوصیات اس میں لگ جاتی ہیں۔ اس لئے وہ رنگ برنگ ہو جاتا ہے جیسے نبوت کی شانیں خود رنگ برنگ ہیں، اسی طرح ان کے مظاہر بھی رنگ برنگ ہونے ضروری تھے۔ اسلئے نبوت کے پردہ کر لینے کے بعد ہی صدیقیت، فاروقیت، امامت اور اولوالامری کی استنباطی قوتیں نمایاں ہونی ممکن تھیں۔ اسلئے غروب آفتاب نبوت بھی ایک

مستقل نعمت اور رحمت ثابت ہوا اور اسی طرح ذات بابرکات نبوی اسی تمثیل سے رحمت مطلقہ بھی ثابت ہوئی۔ انا رحمۃ مہداۃ۔

ادھر یہ ظہور و غیبت اور حضور و شہود خود آپ کی ذات بابرکات کے حق میں ہر لمحہ ترقی مدارج کا ذریعہ تھا۔ ظہور اور شہود کے وقت تو تعلیم و تربیت اور تنویر و تاثیر سے آپ سب کے سامنے ہوتے تھے اور ہر لمحہ ترقی درجات تھی اور غیبت کے وقت جبکہ غیبت تامہ ہوتی تھی۔ جیسے مثلاً نزول وحی کے وقت فنائیت کاملہ کا غلبہ ہوتا تھا اور غیبت تامہ ہوتی تھی کہ نہ آپ کسی کے پاس ہوتے تھے نہ آپ کے پاس کوئی ہوتا تھا یا حسی طور پر جیسے شب معراج میں آپ سب سے اوجھل تھے تو اس میں بلاواسطہ ترقی درجات ہوتی تھی۔ پس شہود میں ترقی بواسطہ تعلیم و تربیت و خدمت خلق تھی اور غیبت میں ترقی بلاواسطہ تھی۔ اسلئے آفتاب نبوت کا یہ ظہور و خفاء خود آفتاب نبوت کے حق میں بھی ہر لمحہ رحمت کاملہ ثابت ہوا۔

پختگی اور تکمیل

پھر جیسے آسمانی ستارے جڑی بوٹیوں میں رس ضرور بھر دیتے ہیں۔ نلیوں میں گدا ضرور پیدا کر دیتے ہیں۔ لیکن انہیں پکا نہیں سکتے۔ پختگی صرف آفتاب ہی سے پیدا ہوتی ہے جس سے جڑی بوٹیوں کا رس حد کمال کو پہونچتا ہے اور ہڈی کی نلکیوں میں گدا پختہ ہو کر بدن کی جان بن جاتا ہے۔ اگر آفتاب اپنی حرارت سے ان مغزوں کو نہ پکائیں اور وہ بہتے ہوئے سیال مادے رہ جائیں تو کسی بدن میں جان اور توانائی پیدا نہیں ہو سکتی۔ ٹھیک اسی طرح نجوم نبوت (انبیائے سابقین) نے قلوب اور دماغوں میں ایمانوں کا ضرور بھرا اور دین کے مغز کو ان کے ظرفوں میں بھرتے بھی رہے۔ مگر دین کی پختگی اور تکمیل آفتاب نبوت کے بغیر ناممکن تھی۔ البتہ امم سابقہ میں تو پختگی کی صورت یہ تھی کہ علوم خاتم النبیین ان کے صحیفوں میں کارفرما تھے۔ وانہ لفی زبر الاولین (اور اسی قرآن کی روح پچھلوں کی کتابوں میں موجود تھی) اور اس طرح انبیاء کی ہنگامی تعلیمات کے خاکوں میں یہ قرآنی علوم و معارف اپنا رنگ بھرتے تھے۔

جس سے تعلیم و تربیت میں پختگی کی صورت پیدا ہو جاتی تھی، ادھر امتِ محمدیہ میں اس کے برعکس علوم سابقین تو بواسطہ حضرت خاتم النبیین موجود تھے اور علومِ نبوی براہِ راست کارفرما ہوئے، اس لئے امم سابقہ اور امتِ مرحومہ سب کے لئے پختگی کا سبب آفتابِ نبوت ہی ہوا یا دوسرے رنگ سے یہ حقیقت یوں ادا کیجائے گی کہ پختگی کا مطلب دین کی تکمیل ہے اور تکمیل کے معنی ازسرِ نو ایجاد کے نہیں بلکہ ایجاد شدہ کو حدِ کمال تک پہنچانے کے ہیں۔ پس وہ دین جو آدم سے چلا تھا اور تکمیل کی طرف درجہ بدرجہ بڑھ رہا تھا، اسکی تکمیل آخر کار حضرت خاتم النبیین علیہ السلام کے ہاتھوں ہوئی کہ خاتم کے کامل ترین علوم کے بغیر یہ تکمیل وجود پذیر ہو ہی نہیں سکتی تھی۔

پس آفتابِ روحانی نے دین سابق کو اپنی جامعیت کبریٰ کے راستہ سے بلحاظ اصول و فروع حد کمال کو پہنچایا۔ دلائل قاہرہ اور معجزات عظیم سے مضبوط اور پختہ فرمایا، نیز اپنے جامع اسوۂ حسنہ سے دین کے ان گوشوں کو جو خالی تھے، پُر کر کے دین کی ہر جہتی تکمیل فرما دی۔

الیوم اکملت لکم دینکم	آج میں نے تمہارے لئے تمہارا دین مکمل
اتممت علیکم نعمتی و رضیت	کر دیا اور تم پر اپنی نعمت پوری کر دی اور تمہارے
لکم الاسلام دینا ؕ	لئے دین اسلام پسند کیا۔

پس پہلی صورت میں ارباب دین کی پختگی اور تکمیل ثابت ہوتی ہے کہ وہ بھی بغیر علوم خاتم وجود پذیر نہیں ہو سکتی اور دوسری صورت میں نفس دین کی پختگی اور تکمیل ثابت ہوتی ہے کہ وہ بھی بغیر علوم خاتم کے ناممکن تھی۔

حکمت تربیت اور نسخ شرائع

پھر جیسے طلوع آفتاب کے بعد اُسے ایک جگہ ساکن نہیں رکھا گیا بلکہ متحرک بنایا گیا، جو مشرق سے مغرب کیطرف چلتا رہتا ہے اور حرکت بھی مستقیم نہیں دَوری رکھی گئی کہ ایک دائرہ پر گھومتا ہے اور ایک جگہ سے چلکر وہیں پھر آجاتا ہے، جہاں سے چلا تھا، پھر یہ حرکت بھی دفعی نہیں تدریجی رکھی گئی کہ چند منٹوں میں نہیں، چوبیس گھنٹہ میں اپنا دورہ پورا کرتا ہے۔ یہ نہیں کہ ایک دم

چھلانگ لگا کر مشرق سے خطِ استواء پر آجائے اور اس کے نکلتے ہی دن میں دھوپ کی وہی تیزی اور حدت وگرمی آجائے جو نصف النہار کے وقت ہوتی ہے۔ یا یہ کہ وہ نصف النہار سے ایک ذقند بھر کر یکدم مغرب میں پہنچ جائے اور وہ نصف النہار کی روشنی وتیزی اکدم رفع ہو کر ٹھنڈک پیدا ہو جائے۔ اگر ایسا ہوتا تو لوگ رات کے ٹھنڈیائے ہوئے اکدم طلوع کے وقت گرما جاتے اور استواء کے وقت کی انتہائی گرمی سے گرمائے ہوئے اچانک غروب سے یکدم ٹھنڈیا جاتے اور نتیجہ یہ ہوتا کہ ان میں اس دفعی اور اچانکی کی ٹھنڈک اور گرمی سے فساد مزاج پیدا ہو کر طرح طرح کی بیماریاں لاحق ہو جائیں اور اگر سرے سے آفتاب میں حرکت ہی نہ رکھی جاتی۔ بلکہ وہ طلوع ہو کر ایک نقطہ پر کھڑا رہا کرتا تو دنیا اس کی حدت وشدت سے تنگ آجاتی۔ اسلئے اسے متحرک بھی رکھا اور حرکت میں سرعت اور تیزی کے بجائے تدریج رکھی۔ جسے عروج ونزول اور قرب وبعد سے مقید فرما دیا تاکہ تدریج کے ساتھ ساتھ کائنات ہر ہر کیفیت کے اثرات سے آہستہ آہستہ متاثر اور مستفید ہو اور ہر اگلی حالت پچھلی حالت کو بتدریج ختم کر کے اگلی کے لئے مزاجوں کو مستعد بناتی رہے۔ کیونکہ جب تک یہ پہلی حالت ختم نہ ہو، جو مزاجوں کی رعایت سے رکھی گئی تھی۔ دوسری حالت کی استعداد نمایاں نہیں ہو سکتی۔

ٹھیک اسی طرح آفتابِ نبوت کے احوال میں بھی حق تعالیٰ نے ترقی رکھی ہے، جو ہر وقت حرکت میں ہے۔ جس میں روحانی احوال کے عروج ونزول اور شدت وخفت کی مختلف کیفیات نے اُبھر اُبھر کر روحانی مزاجوں پر اپنے اپنے اثرات ڈالے اور مزاجوں کو ایک خاص انداز پر ترتیب دیا۔ ابتداء اسلام میں جو طلوع آفتاب کے مشابہ زمانہ ہے۔ آفتابِ نبوت کی روشنی دھیمی اور ہلکی تھی جو طبیعتوں کے قریب تھی۔ کیونکہ زمانہ جاہلیت کی طبیعتیں ایک دم کمال دین کی خوگر نہیں ہو سکتی تھیں۔ نماز کی جو مکمل صورت آج ہے۔ وہ ابتداء اسلام میں نہ تھی۔ اس میں سلام وکلام سننا سنانا۔ ادھر اُدھر دیکھنا۔ حرکت کر کے اِدھر سے اُدھر ہو جانا سب جائز تھا کیونکہ حدیث العہد اور نو مسلم لوگ اچانک اسلامی نماز کی ساری ہی پابندیاں عائد ہو جانے سے نماز ہی سے اکتا جاتے اور اُسے برداشت نہ کرتے۔ اس لئے جوں جوں طبیعتیں سہتی گئیں۔ اسی طرح قیدیں عائد ہوتی گئیں۔ پہلے نقل وحرکت ممنوع ہوئی۔ پھر اِدھر

اُدھر دیکھنے کی ممانعت ہوئی۔ پھر سلام و کلام کی ممانعت آئی اور حسب قول حضرت عبداللہ ابن مسعود رضی اللہ عنہ۔

فامرنا بالسکوت ونھینا عن الکلام — پس ہمیں خاموش رہنے کا حکم دیا گیا اور کلام کرنے سے روک دیا گیا۔

اگر ان ساری آزادیوں سے اکدم روکدیا جاتا تو یہ ایسا ہی ہوتا۔ جیسے کہ سورج کی دفعی حرکت سے اکدم سردی سے گرمی میں پہونچا دیا جاتا۔ سو اس سے اگر مادی مزاج فاسد ہوتا تھا تو اس سے روحانی مزاج فاسد ہو جاتا۔ پس رفتہ رفتہ ابتدائی احکام منسوخ ہوتے گئے اور جدید احکام آئے تاکہ طبائع اسے سہتی جائیں اور روحانی مزاجوں میں بتدریج ترقی وسکون کی کیفیات پیدا ہوں۔ یہی تدریجی نسخ احکام کی صورت کتوں کے ختم کرانے میں کی گئی۔ یہی تدریجی اور تنسیخی صورت شراب کے احکام میں رکھی گئی۔ یہی تدریجی صورت صوم عاشورا اور ماہ رمضان کے روزوں کے لئے اختیار کی گئی۔ یہی تدریجی صورت وصیت و مواریث کے احکام میں رکھی گئی۔ یہی تدریجی صورت تشدد اور جہاد کے بارہ میں اختیار کیگئی۔ غرض آفتاب نبوت کی شرعی نقل وحرکت سے بتدریج احکام آتے گئے اور تہذیب وترتیب اختیار کر کے پچھلے احکام کو ہر باب میں ختم کرتے گئے۔ اس حکمت تربیت کے ماتحت کہیں شریعت تساہل سے تشدد کی طرف چلی ہے۔ جیسے شراب بندی میں اور کہیں تشدد سے تساہل کی طرف چلی ہے۔ جیسے کتوں کے قتل کے بارہ میں مگر تدریج اور تسہیل بہر دو صورت پیش نظر رکھی گئی ہے۔ جو حکمت تربیت کی اساس وبنیاد ہے۔

پس آفتاب ہی کی تمثیل سے نسخ شرائع اور حکمت تربیت کا مشغلہ بھی آفتاب نبوت میں ثابت ہوا۔

ما ننسخ من آیۃ او ننسھا نأت بخیر منھا او مثلھا: — ہم کسی آیت کا حکم جو منسوخ کر دیتے ہیں یا اس آیت کو فراموش کر دیتے ہیں تو ہم اس آیت سے بہتر یا اس آیت ہی کی مثل لے آتے ہیں۔

عموم فیضان اور عمومیت بعثت

پھر مادی آفتاب کے اس پہلو پر بھی نظر ڈالئے کہ اس کا فیضان کسی فرد یا نوع یا جنس کی ساتھ خاص نہیں بلکہ اس آسمان کے نیچے کی کائنات کے ذرہ ذرہ پر اس کی روشنی اور گرمی کے اثرات عام اور اس کی تنویر و تاثیر ہمہ گیر ہے۔ وہ جس طرح امیروں کے محلات اور شاہی قلعوں پر روشنی اور گرمی ڈالتا ہے۔ ایسے ہی غریبوں کی جھونپڑیوں اور فقیروں کی کٹیوں پر بھی ڈالتا ہے اور جس طرح انسانوں میں اس کی شعاعیں نفوذ کرتی ہیں، جس سے بدن کی گہرائی تک متاثر ہوتی ہے۔ ایسے ہی حیوانات، نباتات اور جمادات بھی اس کے فیض سے محروم نہیں رہتے۔ آفتاب چڑھنے پر شجر حجر کنکر پتھر لوہا لکڑی چمڑا اور کپڑا سب سے سوزش اور تپش کے آثار نمایاں ہوتے ہیں، ندی، نالوں اور تالابوں میں پانی تک اپنی خنکی کھو بیٹھتا ہے اور گرم ہو جاتا ہے، فضا میں ہوا تک گرما جاتی ہے اور خود فضا بھی گرم ہو جاتی ہے غرض کوئی چیز بھی آفتاب کا اثر لئے بغیر نہیں رہتی، بلکہ ان سب کی زندگی ہی اس حرارت عزیزی سے قائم ہے۔ جو آفتاب انہیں بخشتا ہے۔

پھر آفتاب کی یہ فیض رسانی یکساں بھی ہے۔ وہ ذرہ ذرہ پر چمکتا ہے اور سب کو یکساں اپنی نورانیت اور حرارت کا فیض پہونچاتا ہے۔ یہ نہیں کہ کسی کو نور کم بخشے اور کسی کو زیادہ۔ کسی کو گرمی کم دے اور کسی کو بہت۔ گویا کسی کی نسبت وہ سخی ہو اور کسی کی نسبت بخیل نہیں اس کی وہ ایک ہی گرمی اور روشنی ہے جو سب پر یکساں پڑتی ہے۔ لینے والے اگر اپنی صلاحیت واستعداد کے فرق سے لینے میں کمی زیادتی کریں یا آفتاب کے قرب و بعد کی وجہ سے کم زیادہ لیں تو یہ تفاوت خود ان کا ہے۔ اس سے آفتاب کی عطاءِ وجود کی یکسانی میں کوئی فرق نہیں پڑتا۔ ظاہر ہے کہ آئینہ سورج کا جو نور قبول کریگا۔ وہ کالا توا نہیں کر سکتا ہے لوہا، پتھر دھوپ سے جتنا گرم ہو جاتا ہے۔ لکڑی اور کپڑا اتنے نہیں ہوتے۔ لیکن یہ سب ان کی قابلیتوں اور قبول کا فرق ہے۔ آفتاب کی دین کا نہیں، غرض کائنات کا کوئی گوشہ ایسا نہیں، جہاں آفتاب کی روشنی اور گرمی کا فیض یکساں نہ پہنچ رہا ہو۔

ٹھیک اسی طرح آفتاب نبوت اپنی علمی روشنی اور اخلاقی گرمی کائنات کے سارے نفوس کو یکسانی کے ساتھ پہنچا رہا ہے۔ امیر و غریب، قرب و بعید یگانہ و بیگانہ، ملکی اور غیر ملکی، کالے اور گورے، آزاد اور غلام حتیٰ کہ مقر اور منکر سب ہی پر ان کے انوار یکساں پڑ رہے ہیں اور اس کا پیغام ساری دنیا کے لئے عام ہے۔ اس نے جیسے غریبوں کو پکارا، ویسے ہی سلاطین عالم کے نام بھی فرامین نبوت بھیجے۔ وہ جیسے عوام اور سادہ لوحوں کیلئے راہنما ہے، ویسے ہی خواص اور فلسفیوں کے لئے بھی راہبر ہے۔ اعلان کر دیا گیا کہ

بعثت الی الاسود والاحمر	میں کالے اور گورے سب کی طرف بھیجا گیا ہوں۔

عمومیت کے ساتھ پکارا گیا کہ

قل یاایھا الناس انی رسول اللہ الیکم جمیعاً ؛	آپ فرما دیجئے، اے لوگو میں تم سب کا رسول ہو چکا۔

اور اقوام و انبیاء کی نسبت سے اس عمومیت کو اور زیادہ واضح الفاظ میں کھول دیا گیا کہ

کان النبی یبعث الی قومہ خاصۃ وبعثت الی الناس کافۃ"	پہلے نبی اپنی اپنی قوم کی طرف بھیجے جاتے رہے اور میں سارے انسانوں کی طرف بھیجا گیا ہوں۔

جس سے عموم فیضان اور یکسانی ہدایت نمایاں ہے۔

ماننے والوں میں قبولیت کے مراتب

لیکن ماننے والوں میں ہر ایک اس سے اپنی اپنی قابلیت و صلاحیت کی حد تک مستفید ہوا۔ جس سے درجات و مراتب کا فرق پیدا ہوا اور اسی فرق کے سبب ماننے والوں میں کوئی صدیق و فاروق بنا اور کوئی ذوالنورین، کوئی اسد اللہ ہوا، اور کوئی سیف اللہ کوئی عیسیٰ صفت ہوا، اور کوئی ابراہیمی نقش پر، کوئی محدِّث ہوا، اور کوئی محدَّث، کوئی حکیم بنا اور کوئی

فقیہ کوئی صالح بنا اور کوئی شہید. غرض اپنی اپنی صلاحیتوں کے فرق سے، جسے جو بننا تھا وہ اس عام روحانی سوزش و تپش اور نورانی آب و تاب سے بن گیا، عطار نور و حرارت میں کوئی فرق نہ تھا۔

منکروں کے تاثرات

پھر اس فیضانِ عام سے نہ صرف ماننے والے ہی اثر پذیر ہوئے. بلکہ منکر اور کٹر سے کٹر معاند بھی اپنی جگہ پر رہتے ہوئے آفتابِ نبوت کے فیض سے محروم نہیں رہے کسی قوم نے اس دین سے تمدن کا فائدہ اٹھایا اور کسی نے مذہب کی اصلاح و ترمیم کا. دنیا کی قوموں نے اپنے تمدنوں اور قومی و ملکی دستوروں میں آفتابِ نبوت کی شعاعوں سے ترمیمیں کیں. تمدنی قوانین بدلے. مذہبی عقیدوں میں فرق پیدا ہوا. مشرک سے مشرک انسان بھی توحید کا نام لینے لگے. عیسائیوں میں پروٹسٹنٹ فرقہ پیدا ہوا، جو اندلس کی اسلامی تعلیمات کا اثر تھا. ہندوؤں میں سکھ اور آریہ ورت پیدا ہوا جس نے توحید کا نام لینا شروع کیا. لوتھر نے اندلسی یونیورسٹیوں کی اسلامی تعلیم سے یورپ کے تمدن میں انقلاب بپا کیا. منکر سے منکر قومیں بھی نبوت کی قوتِ قدسیہ کی قائل ہوگئیں. سیاسیوں نے اپنی سیاستوں کے دھارے بدل دیئے. شاہیت سے عوامیت آئی. شخصیت سے جمہوریت ہوگئی. تقربِ خواص رابطۂ عوام کی صورت میں تبدیل ہوگیا. تشدد اور عدمِ تشدد کا فرق اور محلِ استعمال کھلا تشدد کی جنگ کے ساتھ ذہنی اور عصبی جنگ کے نقشے بھی بنے. مدنی زندگی کے ساتھ مکی زندگی بھی کمزور دنیا کا دستور بن کر رہی. حکمرانی کا عنوان لیڈری کا چولہ پہن کر رہا. غرض تمدنی قومیں ہوں یا مذہبی قومیں، سب کی سب آفتابِ نبوت کی کرنوں اور شعاعوں سے درجہ بدرجہ متاثر ہوکر رہیں اور ان کے اندرون میں اس روحانی سورج کی تاثیر شعوری اور غیر شعوری طور پر گھس کر رہی. اگر یہ اقوام ان ہی اصولوں کو انقیاد و طاعت اور تسلیم و رضا کے ساتھ قبول کرتیں تو دنیا کے ساتھ آخرت بھی اس نور سے منور ہوجاتی، جو اصل مقصود تھی. لیکن ان کا یہ تاثر بلا مرضی مجبوری سے ہوا اور انہوں نے ہوا کا عام رُخ دیکھ کر ان تبدیلیوں کے سوا چارۂ کار نہ پایا تو

ان کی دنیا سطحی طور پر اس روشنی سے روشن اور اس گرمی سے گرم ہو گئی ہے۔ مگر آخرت کی تاریکی زائل نہ ہو سکی، تاہم ماننے والوں کی طرح نہ ماننے والے بھی آفتاب نبوت کے فیضان سے بے تعلق اور بے اثر نہ رہ سکے۔ جس کی تفصیلی مثالیں گزر چکی ہیں اور اس طرح یہ فیض عام پورے عالم بشریت پر چھا گیا۔ جیسے مادی سورج دنیا کے ہر ہر ذرہ پر چمک جاتا ہے۔

غیر ذی روح اشیاء پر آفتاب نبوت کا اثر

پھر یہ فیضان عام نہ صرف عالم بشریت ہی تک محدود رہا۔ بلکہ جمادنبات اور حیوان و جنات تک بھی اس صدائے عالم کے اثرات پہنچے۔ جیسے مادی آفتاب کی روشنی اور گرمی کا اثر ان تک پہنچتا ہے۔ کنکریاں دستِ مبارک میں آئیں تو تسبیح پڑھنے لگیں، کھجور کے سوکھے تنے کو کچھ دن آفتاب نبوت کی صحبت و معیت کی گرمی ملی تو وہ عشق نبوی سے اتنا گرمایا کہ عارفین کاملین کی طرح فراق نبوی میں گریہ وبکا کرنے لگا۔ حدیبیہ میں کیکر کے درخت سے آفتابِ نبوت کا بدن مبارک قریب ہو گیا تو وہ شجرۃ الرضوان بن گیا جس کو رب العالمین نے اپنے کلام مبارک میں سراہا۔ شجر و حجر میں سلام کرنے اور نبوت کی شہادتیں دینے کی صلاحیت پیدا ہو گئی۔ جانور اپنی اپنی فریادیں لانے لگے اور پیغمبر کے حق فیصلے سے مطمئن ہو ہو کر جانے لگے۔ اونٹوں نے آکر قدم مبارک پر سر رکھا۔ رو رو کر اپنے مالک کے ظلم و ستم کی فریاد کی اور مراد پا گئے۔ بھیڑیوں نے صداقت نبوی کی شہادتیں دینی شروع کر دیں۔ قربانی کے لئے جانور خود اپنے آپ کو پیش کرنے لگے۔ جبکہ آپ نے حجۃ الوداع کے موقع پر سو اونٹ کی قربانی فرمائی تو ذبح ہونے کے لئے ہر ایک خود آگے بڑھتا اور گردن جھکا کر دست مبارک سے ذبح ہونے کیلئے پیشقدمی کر رہا تھا۔

ع سر دوستاں سلامت کہ تو خنجر آزمائی

چلتا پانی تسبیح الہٰی کرنے لگا۔ سفید کپڑا تسبیح خداوندی میں لگ گیا۔ ہری ٹہنیاں تسبیح میں مصروف ہوئیں، چرند پرند اپنی اپنی زبان میں تسبیح پڑھنے لگے۔ جنات کے وفود مواعظ نبوی

کی فرمائش لیکر آنے لگے اور متاثر ہوکر اسلام کا کلمہ پڑھنے لگے۔ بادلوں پر نگاہِ پاک پڑی تو وہ سایہ گستری کی خدمات انجام دینے لگے اور سر مبارک کیلئے دھوپ میں چھتری بن گئے۔

مکان اور فضا میں آفتاب نبوت کے آثار

پھر نہ صرف اس جہان کے اعیان و اشخاص یعنی جماد و نبات اور جن و حیوان ہی اس آفتاب روحانی سے روشن ہوئے، بلکہ وہ مکان اور خلا بھی جس میں گھر اور گھر والے جاگزیں ہیں، آفتاب نبوت سے گرمائے بغیر نہ رہے۔ جن کے یہ اشخاص مکین اور باشندے ہیں۔ پس جیسے مادی آفتاب سے فضا روشن اور گرم ہوتی تھی۔ ایسے ہی روحانی آفتاب سے بھی وہ معنوی روشنی اور گرمی حاصل کر رہی ہے، جو عبادتِ الہٰی کی روشنی ہے اولاً اس وجہ سے کہ جو بھی طاعۃ و عبادت کوئی ذی روح یا غیر ذی روح انجام دے گا۔ وہ یقیناً کسی نہ کسی جگہ اور مکان ہی میں واقع ہوگی لا مکان میں نہیں ہوسکتی۔ اس صورت میں مکان ظرف عبادت اور وسیلۂ طاعت بن جائے گا اور سب جانتے ہیں کہ وسیلہ مقصود کے حکم میں ہوتا ہے۔ اس لئے اگر عبادت مقدس فعل ہے اور ضرور ہے تو اس کے ظرف کا مقدس ہونا بھی ضروری ہے۔ جیسے عطر اگر خوشبودار ہے اور بلاشبہ ہے تو اس کے شیشے اور کنستر کا خوشبودار ہوجانا بھی قدرتی ہے۔ اس دلیل سے مکان عبادت کا مقدس ہوجانا واضح ہوگیا چنانچہ اس اصول پر شریعت نے مساجد کو خیر البقاع (ساری جگہوں میں پاکیزہ ترین جگہ) فرمایا وہ پاکیزہ ترین عمل یعنی عبادت کی جگہ ہے اور بازار کو شر البقاع (ساری جگہوں میں بدترین جگہ ہے) کہا کہ وہ عموماً دنگہ فساد اور جھگڑوں جیسے ناپاک عمل کی جگہ ہے، جس سے مکان کے خیر و شر ہونے کا معیار واضح ہوگیا کہ وہ عبادت ہے اور عبادت بلاشبہ آفتاب نبوت کا اثر ہے۔ جس جس موضع میں عبادت اور اطاعۃ خداوندی ادا کی جائے گی۔ بلاشبہ اس موضع اور مکان کو بھی آفتابِ نبوت سے متاثر کہا جائے گا۔ اس لئے واضح ہوگیا کہ مکین ہی نہیں، خود مکان بھی آفتابِ نبوت کی روشنی اور گرمی سے اثر پذیر ہے۔

پھر یہ مکان نہ صرف واسطۂ عبادت ہونے کیوجہ سے مقدس بن گیا ہے، بلکہ براہِ راست

خود بھی عبادت گذار اور بلا واسطہ آفتاب نبوت سے یہ معنوی روشنی اور گرمی لے رہا ہے۔ چنانچہ جس راستہ سے حضور گذر گئے۔ وہی مقدس بن گیا۔ جائے ولادت مقدس، جائے وفات مقدس، جائے دفن مقدس اور زیارت گاہ خلائق۔

بجائیکہ نشانِ کفِ پائے تو بود
سالہا سجدۂ صاحب نظراں خواہد بود

زمین کے گڑھوں اور قبروں تک سے قرآن خوانی کی آوازیں آنے لگیں۔ زمین کے جس خطہ کو کسی غلام نبوی سے بھی نسبت ہو گئی۔ وہ بھی مقدس بن گیا۔ زمین کے جس حصہ پر کسی بھی عبد صالح نے عبادت کا وظیفہ ادا کر لیا تو وہ خطہ سرکاری گواہ بن گیا اور قیامت کے دن اپنے عابد کے بارہ میں اس کی گواہی معتبر اور مقبول ہو گی۔ گویا عدالت و پارسائی جو گواہوں کے مخصوص اوصاف ہیں، اس خطہ کے نصیب میں آ گئے۔ جو اس کے مقدس ہو جانے کی واضح دلیل ہے۔ جس بیت کو صاحب نبوت سے دور کی بھی نسبت ہو گئی۔ وہی بیوت اللہ (اللہ کے گھروں) میں شمار ہونے لگا۔ عالم کی ساری مسجدیں، ساری خانقاہیں، سارے مدارس سارے وہ ادارے، جن میں خدائی احکام کی تنفیذ و اجراء عمل میں آئے۔ ساری مجالسِ وعظ و تذکیر سارے مقاماتِ مذاکرۂ علم و عمل ساری مقدس پہاڑیاں اور وادیاں جو کسی نہ کسی صاحب الہام، صاحبِ وحی کی طرف منسوب ہوں، (درحالیکہ ہر صاحبِ وحی و الہام اور ہر صاحب کشف و منام خواہ وہ اگلوں میں ہو یا پچھلوں میں، بالآخر خاتم النبیین کی طرف منسوب اور خاتم ہی کے فیض سے مستفیض ہے) ان نسبتوں کے سبب مقدس اور عبادت گذار شمار ہوں گے کہ انہیں کسی نہ کسی واسطہ سے آفتابِ نبوت سے نسبت حاصل ہو گئی۔ حرم کعبہ، حرم مکہ حرم مقدس، حرم مدینہ، مسجدِ حرام، مسجد اقصیٰ، مسجد نبوی، مسجد قبا، مسجد خیف، مسجد نمرہ وغیرہ وغیرہ۔ پھر قبر مبارک میں وہ بقعہ جس میں جسم مبارک محفوظ ہے، وہ عرش سے بھی افضل ہے کہ اس سے جسم لطیف لگا ہوا ہے۔ پھر پہاڑوں کے سلسلہ میں جبل طور، جبل نور، جبل حراء جبل ثور، جبل اُحد، وادیٔ سینا، وادیٔ آدم۔ دریاؤں میں سیحون و جیحون اور نیل و فرات وغیرہا۔ کنوؤں میں بیر زمزم اور مدینہ کے مشہور سات کنوئیں بیر آریس، بیر خاتم، بیر بضاعۃ وغیرہا اور تمام

وہ مبارک خطے جن میں ان مقدسین کی کوئی نسبت لگی ہوئی ہے یا وہ ان کے نام لگے ہوئے ہیں، پھر تمام وہ مشاہد و آثار اور عالم کے تمام مقامات مقدسہ اسی لئے مقدس ہوئے کہ انہیں آفتاب نبوت سے کوئی نسبت و مناسبت حاصل ہے۔ پس کوئی مقام تو وہ ہے جسے شریعت نے نام لیکر صاحب نسبت کہا اور اس کا بالفعل مقدس ہونا خود متعین کیا، جیسے مقامات مذکورہ اور بعض وہ ہیں، جنہیں نیک انسانوں کے انتخاب پر چھوڑ کر ظرف عبادت قرار دیا، یعنی جو انسان جہاں بھی عبادت کرلے وہ جگہ مقدس اور اس کے حق میں گواہ بن جائے گی اور چونکہ یہ صلاحیت ہر خطہ میں ہر وقت ہے۔ اس لئے گویا سارے جہان کے تمام خطوں کو بالقوت مقدس فرما دیا۔ اس حقیقت کو حدیث ذیل میں ارشاد فرمایا گیا کہ

جعلت لی الارض مسجداً و طھوراً ؂	میرے لئے ساری زمین جائے عبادت اور ذریعۂ پاکی بنا دی گئی ہے۔

اس صورت میں زمین کا کونسا خطہ باقی رہ جاتا ہے، جو بالفعل یا بالقوۃ یا بالخصوص یا بالعموم آفتاب نبوت کی روشنی اور گرمی سے بے تعلق کہا جائے۔ حاصل یہ کہ جہاں بھی آفتاب نبوت کی کوئی شعاع اور کرن پہنچ گئی، وہی خطہ روشن اور گرم ہوگیا۔ بالواسطہ بھی اور بلا واسطہ بھی اور ظاہر ہے کہ مکان عالم کی ہر چیز کو اپنے احاطہ میں لئے ہوئے ہے۔ کوئی بھی مکانی شئی اس کے گھیرے سے باہر نکلی ہوئی نہیں اور جب وہ خود ہی کل کا کل آفتاب نبوت سے مستفید ہے تو اس کے احاطہ کی کوئی شئے باقی رہ جاتی ہے جو اس کے نورانی اثرات سے الگ یا بے تعلق رہ جائے؟ اس سے واضح ہوگیا کہ جس طرح مادی سورج کا حسی فیضان دنیا کے ہر ہر خطہ میں پہنچا ہوا ہے کہ مکان اور مکین کا کوئی فرد اس سے محروم نہیں اسی طرح اس روحانی سورج کا معنوی فیضان بھی ذرہ ذرہ پر چھایا ہوا ہے۔ جس سے فضا اور مکان اور ان کے مکینوں کا کوئی فرد بچا ہوا نہیں ہے۔ البتہ بعض کو آفتاب نبوت نے خود اپنے انتخاب سے نام لے کر بالفعل نورانی کہا ہے اور بعض کو مطیع انسانوں کے انتخاب پر چھوڑ کر بالقوہ نورانی بتلا دیا ہے۔

آفتاب نبوت کے اثرات زمانہ پر

پھر جس طرح مادی سورج کا فیضان مکان اور مکانی اشیاء تک محدود نہیں، بلکہ اسکی روشنی اور گرمی زمانہ کو بھی متاثر کئے ہوئے ہے اسی طرح آفتاب نبوت کی فیض رسانی بھی مکان اور مکانیات سے گزر کر زمانہ اور زمانی اشیاء تک پھیلی ہوئی ہے جس دن پر نگاہ پڑ گئی، وہی دن مقدس ہوگیا جس رات پر نگاہ جا پڑی وہی رات پاکیزہ ہوگئی، وہ ساعتیں وہ مہینے وہ سال، وہ حصہ زمانہ جو آفتاب نبوت کی کسی نسبت کے نیچے آگیا، وہی مقدس مقبول اور مبارک بن گیا اور اسی طرح جو اشیاء زمانہ کے گھیرے میں آگئیں، وہ بھی مبارک ہوگئیں جس کی صورت یہ ہے کہ جس طرح کائنات کے ذرہ ذرہ کو مکان نے اپنے احاطہ میں لے رکھا ہے اور کوئی جسمانی چیز ایسی نہیں جو مکان اور جگہ سے مستغنی ہو، بقول فلاسفہ کل جسم لہ حیز طبعی (ہر جسم کیلئے طبعی طور پر کوئی نہ کوئی جائے قرار اور مکانی ظرف ضروری ہے) اسی طرح عالم کی کوئی شے زمانہ کے احاطہ سے بھی باہر نہیں ہو سکتی، یعنی زمانہ بھی مکان کی طرح کائنات کو گھیرے ہوئے ہے، بلکہ زمانہ کا احاطہ مکان کے احاطہ سے بھی بڑھا ہوا ہے، کیونکہ مکان تو صرف موجودات کو (جو پیدا ہو چکی ہے) اپنے احاطہ میں لئے ہوئے ہے، غیر موجود اشیاء یعنی معدومات سے مکان کا کوئی تعلق نہیں اور نہیں کہا جا سکتا کہ جو چیزیں ابھی پیدا نہیں ہوئیں، وہ فلاں مکان میں بند ہیں، لیکن زمانہ موجودات کے ساتھ ان معدومات کو بھی اپنے احاطہ میں لئے ہوئے ہے، جو ابھی تک پیدا نہیں ہوئیں، کیونکہ زمانہ فقط حال ہی کو نہیں کہتے، جس میں موجود اشیاء سمائی ہوئی ہیں، بلکہ ماضی کو کہتے ہیں، جس میں گذری ہوئی اشیاء بھری ہوئی ہیں، ہر مرنے والی شے کو کہتے ہیں کہ وہ ماضی ہوگئی یعنی زمانۂ ماضی میں چلی گئی، پھر زمانہ ہی کا حصہ مستقبل بھی ہے، یعنی آئندہ زمانہ جس میں وہ چیزیں سمائی ہیں جو ابھی تک پیدا ہی نہیں ہوئیں، پس ماضی کے احاطہ میں پیدا ہو کر گزر جانے والی اشیاء گھری ہوئی ہیں اور مستقبل کے احاطہ میں ناپیدا شدہ اشیاء گھری ہوئی ہیں اور حال کے احاطہ میں صرف وہ اشیاء گھری ہوئی ہیں، جو پیدا ہو کر موجود ہیں اور ظاہر ہے کہ حال میں گھری ہوئی موجودا

سے گزری ہوئی ماضی کی اشیاء اور آنے والی مستقبل کی اشیاء کہیں زائد ہیں، اس لئے زمانۂ حال کی گرفت بہ نسبت ماضی و مستقبل کے بہت کم ہے اور سب جانتے ہیں کہ مکان کے احاطہ میں صرف وہی اشیاء آئی ہوئی ہیں جو حال کی گرفت میں ہیں، ماضی و مستقبل کی اشیاء سے مکان کا کوئی تعلق نہیں، اس لئے واضح ہو گیا کہ مکان کا احاطہ زمان کے احاطہ سے بہت چھوٹا اور مختصر ہے اور اس کے احاطہ میں بہ نسبت زمانہ کے احاطہ کے بہت کم چیزیں آئی ہوئی ہیں، جو مکان اور زمان کے احاطوں میں فرق کی کھلی دلیل ہے۔

دوسرا فرق یہ ہے کہ کائنات کی وہ اشیاء جو مکان کی گرفت میں آئی ہوئی ہیں، خود تو رات دن متحرک ہیں مگر مکان ساکن ہے اور ان اشیاء کو گھیرے ہوئے اپنے مقام پر ساکن اور غیر متحرک ٹھیرا ہوا ہے لیکن زمانہ ان اشیاء کو گھیرے ہوئے خود حرکت میں ہے اور زمانی اشیاء ساکن ہیں، کوئی شئے خود حرکت کر کے ایک زمانہ سے دوسرے زمانہ میں نہیں جاتی، بلکہ زمانہ خود ان پر سے گذرتا اور آتا جاتا رہتا ہے، ماضی گزر رہی اور پیچھے کو جا رہی ہے، گویا بعید ہو رہی ہے، مستقبل آرہا ہے اور اشیاء سے قریب ہوتا جارہا ہے اور حال ان دونوں حالوں کے درمیان ایک موہوم سا نقطہ ہے، جو دونوں طرف رخ کئے ہوئے ہے اس لئے قرآن حکیم نے زمانہ کو اشیاء سے قریب آتا ہوا اور بعید ہوتا ہوا کہہ کر زمانہ کو گویا متحرک کہا ہے اور اشیاء کو ساکن فرمایا۔

اقترب للناس حسابھم و ھم فی غفلۃ معرضون ⁂ — لوگوں کے حساب کا وقت قریب آگیا مگر یہ لوگ غفلت میں پڑے ہوئے ہیں۔

ایک جگہ فرمایا۔

اقتربت الساعۃ وانشق القمر ⁂ — قیامت قریب آگئی اور قمر شق ہو گیا۔

اور زمین کو فراش فرمایا۔ جو اس کے ساکن ہونے کی علامت ہے کیونکہ فراش حرکت نہیں کرتا، صاحب فراش اس پر حرکت کرتا ہے، بہر حال کائنات کا ذرہ ذرہ زمان و مکان کی گرفت میں ہے مگر مکان ساکن ہے اور مکانی اشیاء متحرک ہیں اور زمانہ خود متحرک ہے اور زمانی اشیاء ساکن ہیں، مگر اس فرق کے باوجود کہ زمانہ کا احاطہ مکان سے

وسیع تر اور متحرک تر ہے دونوں کا یہ قدر مشترک اپنی جگہ ایک حقیقت ہے کہ مکان و زمان کائنات کے ذرہ ذرہ کو احاطہ میں لیے ہوئے ہیں۔ اب غور اس پر کیجئے کہ یہ زمان اور مکان باوجود اپنی بے انتہا احاطی وسعتوں کے دونوں کے دونوں مل کر خود آفتاب کے احاطہ میں آئے ہوئے ہیں۔ چنانچہ جیسے مکان اور مکانی اشیاء آفتاب سے منور اور گرم ہوتی ہیں۔ ایسے ہی زمانہ اور زمانی اشیاء بھی آفتاب سے گرم اور منور ہیں۔

زمانہ کا وجود آفتاب سے

بلکہ زمانہ مکان کی نسبت زیادہ سے زیادہ آفتاب کی گرفت میں ہے۔ کیونکہ مکان صرف آفتاب سے متاثر ہے آفتاب کا بنایا ہوا نہیں ہے۔ لیکن زمانہ کا تو وجود ہی آفتاب سے ہے کیونکہ زمانہ نام ہی آفتاب کی گردش کا ہے۔ وہ طلوع غروب کرے تو رات دن بھی نہ بنیں اور رات دن نہ ہوں تو وقت اور زمانہ بھی نہ ہو۔ اس لئے زمانہ گویا آفتاب کی اولاد اور اس سے پیدا شدہ مولود نکلا تو زمانہ کا مکان کی بہ نسبت آفتاب سے زیادہ متاثر ہونا قدرتی چیز ہے۔ یہی وجہ ہے کہ رات اور دن گرم بھی ہوتے ہیں اور منور بھی۔ دن کا گرم اور روشن ہونا تو سب محسوس کرتے ہیں لیکن رات کا موسم گرما میں گرم ہونا آخر آفتاب کے سوا کس کا اثر ہے اور پھر ستاروں کی روشنی سے کسی حد تک منور ہونا گو بظاہر ستاروں کا اثر ہے لیکن خود ستاروں کی روشنی درحقیقت آفتاب کی روشنی ہے۔ فلاسفوں کے دعوؤں کے مطابق چاند ستارے بعض شفاف قسم کے اجسام ہیں جن میں خود روشنی نہیں، ان میں یہ چمک دمک آفتاب کے تقابل سے آتی ہے۔ اس لئے رات کا ستاروں سے منور ہونا بالواسطہ سورج ہی سے منور ہونا ہے۔ پس دن بھی اور رات بھی سورج سے گرمی اور روشنی دونوں چیزیں لے رہے ہیں۔ اس لئے زمانہ بھی آفتاب کے فیض سے محروم نہیں کہ آفتاب ہی سے بنتا بھی ہے اور اسی سے آثار بھی لیتا ہے۔

ٹھیک اسی طرح آفتاب نبوت بھی اپنا زمانہ خود بناتا ہے۔ وہاں مادی سورج کی حسی گردش سے حسی رات اور دن بنتے تھے کہ سورج نکل آیا تو دن ہو گیا سورج چھپ گیا تو رات

ہو گئی۔ اسلئے سورج کی جھلکیاں رات اور دن کو بناتی رہتی ہیں۔ یہاں روحانی سورج کی شرعی نقل و حرکت سے شرعی رات اور دن بنتے ہیں۔ جب یہ روحانی سورج طلوع کرتا ہے تو شرعی دن ہو جاتا ہے اور جب غروب ہوتا ہے تو رات ہو جاتی ہے اور دونوں میں ہزاروں مصالح مخفی ہیں۔ دن سورج کے افادہ کا وقت ہے اور رات خود اس کے استفادہ کا۔ جیسے مادی سورج رات میں نگاہوں سے اوجھل ہو کر بنص حدیث عرش کے نیچے جا کر سجدہ کرتا ہے اور طلوع کی اجازت چاہتا ہے۔ گویا سجدۂ نیاز سے نیا نور اور نور کی نئی زندگی لے کر آنیوالے دن کو نور بخشنے کی تیاری کرتا ہے اور افادی شان سے طلوع کرتا ہے۔ اسی طرح آفتاب نبوت راتوں میں عام نگاہوں سے اوجھل ہو کر قیام لیل اور سجدہ ہائے عبودیت کے لئے عرش تک پہنچتا ہے اور آئندہ کے افادات کیلئے نئی روحانی تو تیں لیکر پھر دن میں طلوع کرتا ہے تاکہ خلق اللہ کی رہنمائی فرمائے۔ فرق اتنا ہے کہ مادی سورج غروب ہو کر زمین کے نیچے جاتا ہے اور عرش کے نچلے حصہ کے سامنے ہو کر بارگاہِ خداوندی میں سجدہ ریز ہوتا ہے۔ لیکن روحانی سورج غروب ہو کر زمین سے بالاتر بلکہ آسمانوں سے بھی گزر کر حتیٰ کہ عرش کے بالائی حصہ تک پہنچ کر رب العرش العظیم کو سجدہ کرتا ہے اور وہاں سے نئی سے نئی روحانی زندگی لیکر پھر عالم کی طرف لوٹتا ہے تو دن ہو جاتا ہے اور ان قوتوں سے افادہ کا وقت آجاتا ہے۔ گویا دن اس کی اجتماعی اور جلوتی کی زندگی کا ظہور ہے اور رات اس کی دل جمعی اور انفرادی یا خلوت کی زندگی کا ظہور ہے۔ بہر حال جیسے طلوع و غروب سے روحانی سورج شرعی دن اور رات بناتا ہے اور اسطرح روحانی آفتاب کا بنایا ہوا زمانہ بھی مادی آفتاب کے بنائے ہوئے زمانہ کے دوش بدوش قائم ہے۔

آفتاب نبوت کے ایام

اب اگر آپ مادی سورج کے بنائے ہوئے زمانہ پر غور کریں تو نظر آئیگا کہ وہ کل زمانہ جو سورج سے بنتا ہے۔ حقیقتاً صرف دن اور سات راتیں ہیں، اس لئے پوری دنیا کی کل عمر سات دن سات رات یعنی ایک ہفتہ سے زائد نہیں۔ البتہ یہ ہفتہ چونکہ لوٹ لوٹ کر بار بار آتا رہتا ہے،

تو اس کی تکرار کی حد تک دنیا اور دنیا کی قوموں اور دنیا کے بڑے بڑے حوادث کی عمریں دراز ہو جاتی ہیں اور ہزاروں برس کی کہلائی جاتی ہیں، مگر ان لمبی سے لمبی عمروں کا حاصل ایک ہفتہ سے زائد نہیں۔

سات دن کا ہفتہ یوم السبت (شنبہ) سے شروع ہو کر یوم الجمعہ پر ختم ہو جاتا ہے اور یہی ہفتہ پوری دنیا کی اصل عمر ہے۔ گو مکرر ہوتا رہے اگر دنیا کی عمر یہ ہفتہ رکھنا منظور نہ ہوتی یا بالفاظ دیگر ہفتہ بھر سے زائد عمر ہوتی، سورج کو گردش دینے کے بجائے ایک سمت سے سیدھا چلا کر ہمیشہ آگے ہی کی طرف خطِ مستقیم پر دوڑاتے رہتے۔ وہ کبھی غروب نہ ہوتا اور مشرق و مغرب میں بار بار گھوم کر ایک ہی دائرہ میں چکر نہ کھاتا رہتا، مگر ظاہر ہے کہ اس صورت میں صرف ایک دن بنتا جو ہزاروں سال کی برابر ہوتا اور اس سے رات کا واسطہ بیچ میں نہ آتا۔ مگر اس صورت میں وہ تمام تغیرات و حوادث اور ان کی بے انتہا مصالح جو رات کے بعد دن اور دن کے بعد رات کے اول بدل میں پنہاں ہیں، فوت ہو جاتیں، زمانوں کی کوئی حد بندی نہ ہوتی، کوئی مدت معین نہ ہو سکتی، کوئی حساب نہ بن سکتا، نہ مہینے بنتے نہ سال نہ سنہ پیدا ہوتے نہ تاریخ اور اس طرح دنیا کی تاریخ ہی نہ بن سکتی، جس سے عبرتوں اور مصلحتوں کے سارے کارخانے درہم برہم ہو جاتے۔ اسلئے سورج کی چال میں بجائے مستقیم حرکت کے دوائی حرکت اور گردش رکھی گئی، جس سے طلوع و غروب پیدا ہوا، اس سے رات اور دن بنتے تاکہ وہی رات اور دن لوٹ لوٹ کر زمانہ کی مقداریں بناتے رہیں اور ان تمام مصالح کائنات کا وجود ہوتا رہے جو اس لیل و نہار کے انقلاب سے وابستہ ہیں، نیز طبائع میں اس لیل و نہار کی تجدید سے تجدد پیدا ہوتا رہے، تاکہ طبیعتیں روزانہ تازہ بتازہ اور نو بہ نو ہو کر سعی و عمل کے میدانوں میں دوڑتی رہیں اور عالم کے مصالح نمایاں ہوتے رہیں گو اس طریق سے عالم کی عمر کل ایک دن نکلتی ہے جو لوٹ کر بار بار آسکتا ہے اور عالم کی عمر دراز ہو سکتی ہے۔ لیکن اس صورت میں حساب قائم کرنے اور حوادث کی عمریں متعین کرنے میں دشواریاں لاحق ہو جائیں گویا سارے انسان ایک ہی دن کی پیدائش ہوتے ایک ہی دن موت کا ہوتا، ایک ہی دن شادی بیاہ کا ہوتا، ایک ہی دن عمر کے ہر حادثہ کا، تو امور زندگی میں تمیز کرنا ہی دشوار ہو جاتا، اس لئے دن اور رات کی سات

گردشیں رکھ کر عالم کی عمر ایک ہفتہ کر دی گئی اور سات ناموں کے سات دن نفہ دیئے گئے اور ان کے تکرار سے مہینے متعین کئے ... بارہ رکھ دیئے گئے تاکہ مہینوں کے ساتھ دنوں کا اور دونوں کے ساتھ ساعتوں اور گھنٹوں کا تعین بآسانی ممکن ہو جائے۔

شاید اس لئے قرآن حکیم نے دنیا کی تخلیق اور پیدائش کے سلسلہ میں ایک دن کے بجائے سات دن کا ذکر کیا ہے۔ چھ کا صراحتہً اور ایک کا اشارۃً فرمایا۔

ان ربکم اللہ الذی خلق السموٰت	بیشک تمہارا پروردگار وہ اللہ ہے جس نے
والارض فی ستۃ ایام ثم استویٰ	آسمانوں اور زمین کو چھ دن میں پیدا فرمایا پھر
علی العرش ۔	عرش پر متمکن ہوگیا۔

اس آیت کا صاف مفہوم یہ ہے کہ چھ دن کائنات کی تخلیق کے ہیں اور ایک دن استواء علی العرش کا جسے یوم الفراغ کہنا چاہیئے اور وہ ان چھ کے علاوہ ہی ہوسکتا ہے اور بعد ہی کا ہو سکتا ہے کیونکہ تخلیق عالم کے چھ دن ناقص اور ناتمام تو مراد ہو ہی نہیں سکتے کہ ستۃ ایام کا لفظ مطلق رکھا گیا ہے اور مطلق سے فرد کامل ہی مراد ہوتا ہے۔ اس لئے یہ چھ دن بلاشبہ کامل دن مراد ہوئے اور چھ دن کی تکمیل کے بعد جو وقت آئیگا۔ ایسے ہی ساتواں دن کہا جاویگا اور وہی استوار کا دن ہے۔ اس لئے اس آیت سے دنیا کی تخلیق کے سلسلہ میں مجموعہ عمل و فراغ کے دن سات ہی نکلتے ہیں۔ چھ صراحتاً اور ایک کنایۃً اور یہ ایک دن یقیناً چھ کی تکمیل کے بعد ہی کا دن ہوسکتا ہے۔ جیسا کہ لفظ ثم اس چھ کی بعدیت کی واضح دلیل ہے تو تخلیق عالم اور اس سے فراغت کی مجموعی مدت نص قرآنی کی روشنی میں وہی ایک ہفتہ ہوگیا۔ نیز احادیث میں جبکہ مخلوقات دنوں پر تقسیم کی گئی ہیں اور ان کی تخلیق اتوار سے شروع ہو کر جمعہ پر ختم ہوئی تو چھ دن تو اس روایت سے ثابت ہوئے اور ایک دن یوم السبت کا ذکر صراحتہً دوسری حدیث میں آچکا ہے جس کا تذکرہ آگے آئیگا۔ اس لئے زمانہ کے سات ایام جس طرح آیت سے نکلے گو عدداً ہی سہی اسماءً سہی ایسے ہی احادیث سے بھی نکلے مگر تفصیلاً اور اسماءً۔

ہفتہ دنیا پر اقوام عالم کا اجماع

پھر یہ ہفتۂ دنیا کی مدت جیسے قرآنی صراحت، دلالت اور حدیث سے ثابت ہوتی ہے ایسے ہی اجماع اقوام سے بھی ثابت شدہ ہے جس پر دنیا کی بڑی بڑی قوموں کا اتفاق ہے یہود کے یہاں یوم السبت (شنبہ کا دن) واجب التعظیم اور یوم عید ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ یہ یوم الراحت ہے جس میں حق تعالیٰ نے تخلیق عالم سے فراغت پاکر راحت پائی یعنی اتوار کے دن سے شروع ہو کر جمعہ کے دن تخلیق عالم پوری ہوئی تو شنبہ کا دن یوم الراحت ہوا اور کسی مہم کام سے فارغ ہو کر جب راحت کی ساعتیں آتی ہیں تو وہ قدرتاً خوشی کی گھڑیاں ہی ہوتی ہیں۔ اسلئے یہ دن خوشی کا بھی ہونا چاہیئے اور عید و تہوار کا بھی، جس سے ہفتہ کا ثبوت بنص حدیث یہود کے یہاں نکلا۔ نصاریٰ نے یوم الاحد (اتوار) کو واجب التکریم دن کہا اور عید مقرر کیا۔ وہ کہتے ہیں کہ اس دن عالم کی تخلیق کا آغاز ہوا اور جن ساعتوں میں کسی امر مہم کا افتتاح کیا جاتا ہے تو وہ وقت خوشی کا ہوتا ہے، چنانچہ امور مہمہ کے افتتاح کے وقت جلسے کرتے ہیں، کسی عمارت کا سنگ بنیاد رکھتے ہیں تو تعمیر کے اس افتتاح پر خوشی کا اظہار کرتے ہیں۔ کسی تعمیر کے مکمل ہونے پر جب اس کے استعمال کا آغاز کرتے ہیں تو عادۃً اس میں خوشیاں منائی جاتی ہیں اسلئے جبکہ اتوار کا دن عالم کی تخلیق کے افتتاح کا دن تھا تو وہی دن یوم عید ہونا چاہیئے۔ اس سے نصاریٰ کے یہاں بھی سات دن کا ثبوت ملا۔

مسلمانوں نے کہا کہ جمعہ کے دن تخلیق کائنات کی تکمیل ہوئی اور پورا عالم مکمل بنکر تیار ہو گیا۔ اور جن ساعتوں میں کوئی مہم حد کمال کو پہنچتی ہے تو وہ وقت بنانیوالوں اور استعمال کرنے والوں کیلئے انتہائی خوشی کا ہوتا ہے۔ اس لئے جمعہ اس قابل ہے کہ اُسے خوشی اور عید کا دن قرار دیا جائے اس سے بھی وہی سات دن ثابت ہوئے۔ رہا یہ کہ اس ہفتہ میں ایک دن ہر قوم کے یہاں خوشی اور عبادت کا دن ہے تو اس میں کسی قوم کا انتخاب کردہ دن خوشی کے لئے موزوں اور عبادت کے لئے مناسب ہے، سو غور کیا جائے تو شئے بنا کر فراغت و راحت کی ساعتوں کا پالینا شئے کی تکمیل سے کوئی تعلق نہیں رکھتا۔ خود اپنی راحت و فراغت کی گھڑی سے تعلق رکھتا ہے اور

ابھی راحت پر خوش ہولینا شئے کی تکمیل کی خوشی سے کوئی تعلق نہیں رکھتا بلکہ ایک مستقل خوشی ہے جو نفس شئے کے آغاز و انجام سے کوئی تعلق نہیں رکھتی۔ اسلئے یہود کی خوشی درحقیقت تخلیق عالم کی تکمیل پر نہ ہوئی بلکہ اسے بنا کر فارغ ہو جانے پر ہوئی جو بنانے والے کی راحت کی خوشی ہے۔ اسلئے شئے پر خوشی کے دو ہی درجے نکلتے ہیں یا اس کا افتتاح یا اس کا اختتام یعنی یوم آغاز اور یوم تکمیل۔ اسلئے نصاریٰ اور مسلمین کی خوشی درحقیقت عالم کی خلقت پر ہوئی نہ کہ اس سے فراغت پر کہ وہ تخلیق سے زائد ایک شئے ہے۔ اس لئے اگر یہ خوشی عالم کی خلقت سے متعلق ہے اور بلاشبہ اس سے ہے تو معقول خوشی درحقیقت نصاریٰ و مسلمین ہی کی ثابت ہوتی ہے۔ لیکن پھر ان دونوں خوشیوں میں اگر غور کیا جائے تو مسلمانوں کی خوشی فطرت سے زیادہ قریب اور زیادہ مطابق ہے۔ کیونکہ کسی شئے کے آغاز پر خوشی ضرور ہوتی ہے۔ مگر اسوقت خود شئے کا وجود نہیں ہوتا یا کامل نہیں ہوتا اس لئے یہ خوشی اگر ہوتی ہے تو شئے کے ارادہ پر ہوتی ہے نہ کہ خود شئے پر کہ وہ ابھی ہے ہی نہیں ہاں شئی پر خوشی وہی ہوگی جو شئے کے موجود ہو جانے پر ہوگی اور شئے کا موجود کہلانا اس کی تکمیل پر ممکن ہے نہ کہ قبل از تکمیل۔ اسلئے مکمل خوشی اور اقرب الی الفطرت خوشی مسلمانوں کی خوشی ثابت ہوتی ہے جنہوں نے اس دن کو عید منایا جو تخلیق عالم کی تکمیل کا دن ہے یعنی یوم جمعہ۔ یہی وجہ معلوم ہوتی ہے کہ یوم جمعہ کو عید منانا اور خوشی کے ساتھ یوم عبادت ٹھہرانا منشاء خداوندی بھی تھا کیونکہ حدیث صریح میں فرمایا گیا ہے کہ یوم جمعہ کے بارہ میں یہود و نصاریٰ اور مسلمانوں کا منجانب اللہ امتحان لیا گیا کہ ہر ایک قوم ہفتہ میں ایک دن یوم عبادت مقرر کرے جو اس کی روحانی خوشی کا دن ہو۔ یہود نے یوم السبت (شنبہ) مقرر کیا اور کہا کہ وہ یوم الراحت ہے۔ نصاریٰ نے یوم الاحد (یکشنبہ) مقرر کیا اور کہا کہ وہ یوم الافتتاح ہے اور مسلمانوں نے یوم جمعہ مقرر کیا اور کہا کہ وہ یوم التکمیل ہے اور تکمیل ہی پر خوشی منائی جاتی ہے۔ جبکہ وہ اپنے منافع دکھلانے کے قابل ہو جائے اسلئے شریعت اسلام میں عید الفطر کو خوشی کا دن رکھا گیا کہ روزوں کی تکمیل کی حد آخر ہے۔ عید الاضحیٰ خوشی کا دن رکھا گیا کہ مناسک حج کی تکمیل کی حد آخر ہے۔ ٹھیک اسی طرح یوم جمعہ کو یوم عید رکھا گیا کہ تخلیق عالم کی حد آخر کا دن تھا۔ اس سے واضح ہو گیا کہ مسلمانوں کا جمعہ کو بوجہ یوم تکمیل ہونے کے عید منانا

مذاقِ شریعت کے مطابق تھا چنانچہ اسے فوراً ہی شریعت نے قبول کر لیا اور شریعت بنا دیا
بہر حال جہاں اس سے ہر قوم میں ایک ایک دن یوم عید ثابت ہوا، وہیں ان کے یہاں ایام کی
تعداد کا سات دن ہونا بھی ثابت ہوا اور واضح ہو گیا کہ زمانہ کی اصل مدت فی الحقیقت سات ہی
دن ہے، جس پر دنیا کی بڑی بڑی قوموں کا اجماع ہے، پھر یہ ساتواں دن یعنی یوم استوآ یا یوم الفراغ
بھی عالم ہی سے متعلق ہے، کیونکہ یہ استواء علی العرش تدبیر و تصرف کے لئے تھا، جس سے
عالم کی بقا ہے، اسلئے چھ دن اگر عالم کے حدوث کی تکمیل کے لئے تھے تو ساتواں دن عالم کی
بقاء کی تدابیر کے لئے تھا، اسلئے ساتواں دن بھی عالم کی تخلیق ہی سے متعلق تھا نہ کہ یوم الراحۃ
تھا، جیسا کہ یہود کہتے ہیں کہ پس قطع نظر اس سے کہ راحت کے شائبوں سے حق تعالیٰ منزہ اور
مقدس ہے، راحت طلبی واقعی کے بھی خلاف ہے یہ ساتواں دن اگر فراغ تھا تو تخلیق عالم
سے فراغ کا تھا نہ کہ عالم سے فراغ کا، اندریں صورت جب عالم کی کل مدت سات دن ہوئی اور
یہی مدت تخلیق عالم پر صرف ہوئی تو اس کے یہ معنی ہوتے ہیں کہ کل کا کل زمانہ تخلیق عالم پر صرف
کر دیا گیا، اسلئے اگر ہم مجموعۂ عالم کی کل عمر ہی سات دن رکھیں اور اسی مدت کو پورا زمانہ کہیں تو بعید
از قیاس نہیں ہو سکتا، فرق اتنا ہے کہ تخلیق عالم پر یہ سات دن بلا تکرار کے گزرے، جس سے تخلیق
کی مدت محدود رہی اور بقاء عالم پر یہی سات دن تکرار کے ساتھ گزر رہے ہیں، جس سے عالم کی
عمر دراز ہو گئی ہے اور خدا ہی جانتا ہے کہ اور کتنی دراز ہو گی، یہ بحث الگ ہے، جس سے ہمارے
موضوع کا کوئی تعلق نہیں کہ اس عالم کا ایک دن ہمارے اس عالم کے ہزار برس کے برابر ہے،
اور وہ ایک دن اس سورج کی گردش سے نہیں بنتا بلکہ کسی اور گردش سے وجود پذیر ہوتا ہے۔ لیکن
اس سے ہمارے اس دعوے میں کوئی فرق نہیں پڑتا کہ زمانہ کی کل مدت ایک ہفتہ ہے جو سات دن
کا ہوتا ہے، خواہ دن بڑا ہو یا چھوٹا، بہر حال حاصل مدعا یہ نکلا کہ مادی رات دن مادی سورج بناتا ہے
اور اس کے طلوع و غروب سے زمانہ بنتا ہے جس کے کل سات دن اور سات راتیں ہیں۔

ٹھیک اسی طرح آفتاب نبوت نے اپنے روحانی طلوع و غروب سے جو زمانہ بنایا وہ بھی سات
دن اور سات راتوں کا ہے، یہی سات دن اور سات راتیں لوٹ لوٹ کر اسلام اور اس کے کاموں پر
آتی رہتی ہیں جس سے اس کی عمر دراز ہوتی رہتی ہے اور یہ سات دن اساسی اور بنیادی ہیں جس سے اسلام

کا کوئی نہ کوئی عظیم حادثہ اور فطری انقلاب متعلق ہے گویا ان ایام سے ایسے فطری حوادث اور واقعات متعلق ہیں جو اصولی طور پر دنیا میں لوٹ لوٹ کر آتے رہیں گے اور دنیا کے مہم امور کی تشکیل کرتے رہیں گے۔ ایسلئے یہ شرعی ایام کا ہفتہ نوعی طور پر کسی ایک قرن کے ساتھ مخصوص نہیں، بلکہ تکرار کے ساتھ اسلام کے ہر ہر قرن پر آتا رہے گا۔ سو اسے یوں سمجھو کہ آفتاب نبوت نے جب سے پہلا طلوع کیا جس کو ہم جسمانی طلوع کہتے ہیں یعنی آپ کی ولادت باسعادت ہوئی تو اس سے اسلام کا پہلا دن بنا جسے ہم یوم ولادت کہیں گے، پھر اس نے روحانی حیثیت سے طلوع کیا، (جبکہ آپکو نبوت ملی) تو اسلام کا دوسرا دن بنا جسے ہم یوم البعثت کہیں گے، پھر اس نے روحانی پھیلاؤ کی حیثیت سے طلوع کیا جبکہ آپ نے قوم کو جمع کر کے پیغام سنایا اور اپنی نبوت کا اعلان کیا، تو یہ اسلام کا تیسرا دن بنا جسے ہم یوم الدعوت کہیں گے، پھر آفتاب نبوت نے استوار اور تمکین کی حیثیت سے طلوع کیا جس سے اس کی روشنی جاؤ کے ساتھ دلوں پر پڑ سکے (جبکہ آپ نے مکہ کو چھوڑ کر مدینہ کو مستقر بنایا) تو اس سے اسلام کا چوتھا دن بنا جسے ہم یوم الہجرت کہیں گے، پھر اس نے تشدد و مدافعت کی تیز روشنی کے ساتھ طلوع کیا، (جبکہ آپ کو قتال اور جنگ کی اجازت دی گئی) تو اس سے اسلام کا پانچواں دن بنا جسے ہم یوم القوت کہیں گے پھر اس نے غلبہ واقتدار کی جہت سے طلوع کیا، (جبکہ مکہ اور دوسرے لفظوں میں عرب آپ کے دست مبارک پر فتح ہوا) تو اس سے اسلام کا چھٹا دن بنا جسے ہم یوم الشوکت کہیں گے پھر اسکی تکمیل مقصد اور اختتام کار کی حیثیت سے طلوع کیا (جبکہ آپ پر یہ آیت کریمہ الیوم اکملت لکم دینکم نازل ہوئی) تو اس سے اسلام کا ساتواں دن بنا جسے ہم یوم الاکمال کہیں گے اور اسی کا نام یوم الوداع اور یوم الآخر بھی رکھا جاسکتا ہے، پس جس طرح مادی آفتاب نے سات دن بنائے، یوم السبت، یوم الاحد، یوم الاثنین، یوم الثلثا، یوم الاربعاء، یوم الخمیس یوم الجمعۃ ÷ جو دنیا کی پوری عمر میں کر وہی لوٹ لوٹ کر آتے رہتے ہیں اور دنیا اور اس کے حوادث کی عمر دراز ہوتی رہتی ہیں، ایسے ہی آفتاب روحانی نے بھی سات ہی دن بنائے یوم الولادۃ، یوم البعثت، یوم الدعوۃ، یوم الھجرۃ، یوم القوت، یوم الشوکۃ، یوم الاکمال ÷ یہی سات دن اسلام اور اسلامی مہمات پر لوٹ لوٹ کر آتے رہتے ہیں، جن سے اسلام کی عمر دراز ہوتی رہتی ہے اور اس کی تاریخ بنتی رہتی ہے گویا تاریخ اپنے

کو دوہراتی رہتی ہے اور عالم کے حوادث باہم متشابہ اور ایک دوسرے سے ملتے جلتے رنگ میں ہویدا ہوتے رہتے ہیں گو ہر دَور میں رنگ ان کا جدا جدا ہو۔

یہاں سوال ہوگا کہ یوم ولادت لوٹ کر کہاں آتا ہے۔ ایسے ہی یوم بعثت اور یوم فتح مکہ یوم اکمال وغیرہ تو وہ ایام ہیں جو دورِ نبوت کے ساتھ مخصوص ہیں یہ بعد کے قرون میں کیسے لوٹ سکتے ہیں کہ ان کا تکرار تسلیم کیا جائے؟

جواباً عرض ہے کہ بلاشبہ یہ ایام اپنی خصوصیات کے لحاظ سے دورِ نبوت کے ساتھ مخصوص ہیں لیکن اگر ان کی عمومی روح کو دیکھا جائے تو یہ ایام معیار کی حیثیت رکھتے ہیں اور اس حیثیت سے ہر دَور میں آتے اور آتے رہیں گے۔ کیونکہ جسمانی ولادت شریفہ کی روح مرکزی شخصیت کا تعین ہے جس سے اصلاح کا کام لیا جائے۔ روحانی ولادت (بعثت) کی روح نصب العین کا تعین ہے جسے عالم میں چلایا جائے۔ دعوت کی روح نصب العین کا اعلان ہے جس سے عالم کی اصلاح متعلق ہو۔ ہجرت کی روح مستقر اور فتنہ سے دُور مرکزی مقام کا تعین ہے جس سے نصب العین دلوں تک پہونچ سکے۔ قوت کی روح نصب العین کو طاقت ور بنانا ہے تاکہ دل اسکے سامنے جھک سکیں شوکت کی روح غلبہ واقتدار ہے جس سے نصب العین کی ضد مغلوب ومقہور ہو جائے۔ اکمال کی روح نصب العین کی تکمیل ہے جس سے کسی کو گریز کا موقع باقی نہ رہے اگر ان سات ایام کی مذکورہ ارواح اور اصول حیثیت کو پیش نظر رکھا جائے تو واضح ہوگا کہ یہ ایام دورِ نبوت کے ساتھ مخصوص نہیں ہیں بلکہ بطفیل نبوت ہر قرن میں ہر اہم اور اجتماعی نصب العین کے لئے ان ہی اصول کی اور بالفاظ دیگر انہی ایام کی ضرورت ناگزیر ہے۔ اگر کسی انحطاط کے دور میں خود پورے اسلام یا اس کے کسی دینی یا سیاسی شعبہ کو کسی تحریک کی صورت میں اٹھایا جائے گویا کوئی مجدد تجدید کے لئے کھڑا ہو تو لسے انہی سات مراحل سے گزرنا پڑے گا۔ مرکزی شخصیت کا تعین، نصب العین کا تعین، نصب العین کی اشاعت، نصب العین کے لئے مرکزی مقام کا تعین، نصب العین کے لئے وسائل قوت کی فراہمی نصب العین کے لئے حصول غلبہ واقتدار نصب العین کی علمی اور عملی تکمیل اور جبکہ یہی سات باتیں ان سات ایام کی اصولی روح ہیں تو نتیجہ یہ ہے کہ ہر نصب العین کو ان سات دنوں سے گزرنا پڑیگا۔ دوسرے الفاظ میں شلاً تجدد و احیائے دین کے لئے کوئی

مقدس شخصیت کھڑی ہو، وہ کام کو ابتدائی خاکہ سے شروع کرے۔ پھر اس کی معنویت سمجھائے، پھر اس سے دینی انقلاب رونما ہو، پھر اس پہ دل ٹھیریں اور مطمئن ہوں، پھر اسکا غلبہ ہو، اور آخر کار مقصد کی تکمیل ہو کر مجدد کا کام ختم ہو جائے۔ اس صورت سے ایک مجدد کو بہر حال انہی بعثت شرعی سے گذرنا پڑا۔ گویا وہ ایک دن پیدا ہوا۔ ایک دن نمایاں ہوا، ایک دن اس نے دعوت دی، ایک دن مستقر بنایا۔ ایک دن وسائل قوت مقصد فراہم کئے۔ ایک دن غلبہ حاصل کیا، اور ایک دن مقصد مکمل کر کے قوم کے ہاتھ میں دیدیا تو وہی سات دن ولادت بعثت دعوت ہجرت قوت فتح اور اکمال اس پر سے گذر گئے۔ پس اس کے معنی اس کے سوا اور کیا ہیں کہ یہ ایام اپنی اصولی اور کلی حیثیت سے دورِ نبوت کے ساتھ مخصوص نہیں بلکہ ہر دور میں جب بھی کسی نصب العین کو تحریک کی صورت میں لایا جائے گا اور رجال کار کھڑے ہوں گے تو انہیں انہی سات دنوں سے گزرنا پڑے گا۔ اور یہی سات مرحلے کسی اصولی مہم کے آغاز و انجام اور ارتقاء کے لئے ضروری ہوں گے۔ اس لئے حاصل مدعا یہ نکل آیا کہ آفتاب نبوت نے بھی مادی آفتاب کی طرح اپنا زمانہ خود بنایا اور وہ بھی سات ہی دن کا ایک ہفتہ ہے۔ جو قیامت تک لوٹ کر آتا رہے گا جس سے اسلام اور اس کے کلی اور جزوی مقاصد کی تبلیغ و تحریک ان ایام سے گزرتی رہے گی اور اسلام کی عمر دراز ہوتی رہے گی، ورنہ اس کی اصلی عمر وہی سات دن ہیں جنہیں ہفتۂ نبوت کہنا چاہیئے۔

آفتاب نبوّت کی مقدّس راتیں

ہاں پھر جیسے مادی آفتاب میں دنوں کے ساتھ راتوں کا آنا بھی حکمت و مصلحت تھا چنانچہ اس کے طلوع سے دن بنتے تھے اور غروب سے راتیں اور اس لئے طلوع و غروب کی منزلیں رکھی گئیں، ایسے ہی آفتاب نبوت کے بنائے ہوئے ہفتہ میں بھی دنوں کے ساتھ راتوں کا وجود عین حکمت و مصلحت تھا اور اس لئے یہاں بھی طلوع و غروب رکھا گیا تاکہ طلوع سے شرعی دن بنیں اور اس کے نگاہوں سے اوجھل ہو جانے پر شرعی راتیں نمایاں ہوں، پس جیسے بتصریح حدیث نبوی، مادی آفتاب غروب ہو کر عرش کے نیچے سجدہ کرتا ہے اور آنے والے دن کے لئے

طلوع کی اجازت چاہتا ہے، اُسے اجازت ملتی ہے ــــــــــــــــــــــــــــــ ور وہ
اس اذن و اجازت کی روشنی اور طاقت سے طلوع ہو کر عالم کو منور کر دیتا ہے۔ اسی طرح آفتاب نبوت بھی بارگاہِ خداوندی میں پہنچکر رکوع و سجود، قیام و تشہد اور ذکر و فکر کے ذریعہ رب العرش سے کمالات ظاہر و باطن کا نور لمحہ بلمحہ ترقیات کے ساتھ حاصل کرتا ہے اور اجازت چاہتا ہے کہ طلوع ہو کر دن بنائے اور آنیوالے دن میں حاصل کردہ نور سے عالم کو منور کرے۔ پس وہاں بھی غروب کے وقت عرش کے سامنے حاضری اور عرش کے مالک سے اجازت خواہی ہوتی ہے اور یہاں بھی غروب کے وقت عرش کے سامنے حاضری اور رب العرش سے آئندہ کی رفتار اور گفتار کے بارہ میں اذن طلبی کی جاتی ہے فرق اگر ہے تو یہ کہ مادی سورج غروب کے وقت زمین کے نیچے جاتا ہے اور شاید عرش عظیم کے نچلے حصہ کے سامنے ہو کر سجدہ عبودیت بجا لاتا ہے اور یہ روحانی سورج غروب کے وقت زمین ہی نہیں آسمانوں سے بھی بالا ہو کر عروج کرتا ہے اور عرش کے اوپر والے حصہ کے سامنے رب العرش کے آگے جھکتا ہے۔ یعنی آپ کی روحانیت کو عروج ہوتا ہے اور وہ مخلوق سے منقطع ہو کر خالق میں محو اور مستغرق ہو جاتی ہے۔ مادی آفتاب کا عروج زمین کے دائرہ میں ہے اور روحانی آفتاب کا عروج آسمانوں کے دائرہ سے اُوپر لامکان میں ہے۔ مادی سورج میں مادیات کی طرف آنا عروج اور عرشیات کی طرف جانا نزول ہے اور یہاں روحانیت کی طرف بڑھنا عروج اور مخلوقات کی طرف آنا نزول ہے۔ یعنی اپنے بلند و بالا مرتبہ سے فروتر ہو کر مخلوق میں ملنا اور اس کی اصلاح کرنا نیچے اترنا ہے اوپر چڑھنا نہیں ہے۔ بہر حال یہ غروب اور راتیں بنانا بھی نبوت کی مختلف شانوں کے لحاظ سے ضروری تھا پس نبوت کے ایام آفتاب نبوت کی افادی شانوں کا ظہور ہیں جن میں وہ کائنات کو علم کی روشنی اور اخلاق کی گرمی پہنچاتا ہے اور نبوت کی راتیں آفتاب نبوت کی استفادی شانوں کا ظہور ہے جن میں علم و اخلاق کی روشنی و گرمی حق تعالیٰ سے حاصل کر کے اس کے اُونچے درجات خود طے کرتا ہے تاکہ افقِ انسانیت پر طلوع کر کے ساری کائنات کو علم و اخلاق سے چمکا دے۔

مگر جیسے مادی آفتاب کے غروب سے سات راتیں بنتی ہیں ایسے ہی رُوحانی آفتاب نے بھی نگاہوں سے اوجھل ہو کر یا غیبت کے مقام پر پہنچکر ہفتہ نبوت کی سات ہی راتیں بنائیں جو

انفرادی ترقیات کے لئے ضروری تھیں، پس آفتاب نبوت کا ایک غروب تو دنیا سے رخصت ہو کر پردہ کر لینا ہے۔ وہ آخری اور انتہائی غروب ہے اور ایک جزوی غروب ہے جو حیات ناسوتی میں پیش آتا ہے سو اس کی حقیقت اس عالم سے غیبت یا عالم بالا کی طرف کمال توجہ ہے۔ جس کے معنی اس عالم سے جزوی طور پر پردہ کر لینا ہے اور جیسے ہفتہ زمانہ کی ابتدا رات سے ہوتی ہے اور دن اسی میں سے کھینچ کر نکال لیا جاتا ہے۔ ایسے ہی ہفتہ نبوت کے زمانہ کی ابتدا بھی رات ہی سے ہوتی ہے۔ جس میں سے دن سر نکال کر اپنا روشن چہرہ دکھلاتا ہے چنانچہ آفتاب نبوت کے ابتدائی طلوع (بعثت) سے پہلے جو رات آئی وہ ذات نبوی کی پیغمبرانہ استعداد کی پہلی رات تھی، جو چند راتوں کا مجموعہ ہے۔ جس میں کثرت عبادت آپ کا جذبہ تھا۔ یتحنث اللیالی ذوات العدد (آپ کئی راتوں میں عبادت میں منہمک اور مستغرق ہوئے) اور انہی سے آخر کار وہ سچے خوابوں کی رات آئی جس میں نبوت کی ابتدا سچے خوابوں سے ہوئی۔ اور جو اب بھی آپ دیکھتے وہ صبح کے پو پھٹنے کی طرح واقعہ بنکر سامنے آجاتا۔ اسے لیلۃ البدایہ کہنا چاہیئے کیونکہ اسی کے لئے حدیث اول ما بدیٔ بہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم الرویا الصادقۃ (رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت کی ابتداء سچے خوابوں سے ہوئی ہے) میں بدایۃ اور اولیت کا کلمہ استعمال کیا گیا ہے جس سے بدایۃ کا لفظ لیا گیا۔ اس رات کے بعد آفتاب نبوت طلوع ہوگیا اور شریعت کا پہلا دن نکلا۔

اسکے بعد آفتاب ہو کر عالم غیب کی طرف بڑھا تو وہ رات آئی جس میں آفتاب نبوت میں اس مشاہدہ کا نور بھر اگیا کہ وحی الٰہی کا مجموعہ لوح محفوظ سے آسمان دنیا پر لایا جارہا ہے۔ اسکے جلو میں ملائکہ کی مقدس جماعتیں نازل ہو رہی ہیں اور عالم غیب کی برکتیں سمٹ سمٹ کر قلب مبارک پر اتر رہی ہیں، اسی رات کا نام لیلۃ القدر ہے۔

پھر آفتاب نبوت نے ایک اور غروب کیا تو وہ رات آئی جس میں ایک اور مشاہدہ کا نور آفتاب نبوت میں بھر اگیا اور وہ یہ کہ حوادث عالم کی حدود اور مقداریں متعین ہو رہی ہیں، عمریں رزق اور مخلوق کے تقدیری حصے مشخص کئے جارہے ہیں اور دفتر قضاء و قدر میں مادی اور روحانی نظاموں کے خاکے بن بن کر ملاء اعلیٰ میں پہونچ رہے ہیں، اس رات کا نام لیلۃ البراۃ ہے۔

پھر آفتاب نبوت کا ایک اور غروب ہوا اور وہ رات آئی جس میں اجتماعی امور کی عظیم استعداد کا نور آپ میں بھر اگیا اور اس کی مرکزیت کی قوتوں کا مشاہدہ قلب صافی میں ڈالا گیا تاکہ حج کے دنوں میں اس اجتماعیت کبریٰ کا ظہور ہو۔ اس رات کا نام لیلۃ العرفۃ ہے۔

پھر یہ روحانی سورج ایک دفعہ اور غروب ہو کر عالم غیب میں پہنچا تو وہ رات آئی جس میں ان ساری روحانی قوتوں کی تجدید اور بار بار کی تقویت سے ان کو قوی تر ہوتے رہنے کی طاقت عطا کی گئی اس رات کا نام لیلۃ الجمعۃ ہے۔

پھر آفتاب نبوت نے ایک اور غروب کیا جس میں ان تمام عطا کردہ روحانی اور مادی نظاموں کے مخالف فتنوں کے مشاہدہ کی قوت عطا کی گئی تاکہ نظام کے منافی امور کے دفاع کی قوت ذہن میں قائم ہو۔ اس رات کا نام لیلۃ الفتن ہے۔ جس کے بارے میں حدیث میں اشارہ کیا گیا۔ ماذا انزل اللیۃ من الفتن ایقظوا صواحب الحجر رب کاسیۃ فی الدنیا عاریۃ فی الاخرۃ الخ آج کی رات کتنے فتن نازل ہوتے نظر آرہے ہیں اے حجروں کے رہنے والیوں (ازواج مطہرات) جاگو اور اطاعت و عبادت میں لگو۔ لباس و زینت کی نمائشوں میں مت الجھو دنیا میں بہت سی پہننے اوڑھنے والیاں آخرت میں ننگی ہوں گی۔

پھر آفتاب جہانتاب نبوت نے ایک اور غروب کیا اور وہ رات آئی جس میں اس آفتاب کی گردشوں کے تمام عروجی مقامات دکھلا کر بالآخر نور مطلق کے عالم میں مستغرق ہونیکا شرف دیا گیا جس میں نور نبوت اپنی انتہائی شدت و قوت پر پہنچ گیا اور نورانیت کا وہ مقام رفیع سامنے لے آیا گیا جس تک اگلوں اور پچھلوں میں سے کسی ستارے کی پہونچ نہ ہو سکی تھی اور خصوصیت سے آپ کو عبدیت کے مقامات طے کرا کر عبداللہ کا رفیع المنزلت خطاب بھی عطا کر دیا گیا اور آخر کار ہر قسم کی روحانی، اخلاقی اور سیاسی نظاموں کا وہ خاکہ دکھلا دیا گیا جس کے مطابق زمین پر اس آفتاب نبوت کی روشنی میں ایک نظام صالح برپا کرانا منظور تھا۔ اسی رات کا نام لیلۃ الاسراء اور لیلۃ المعراج ہے۔ اسے ہم لیلۃ النہایۃ بھی کہہ سکتے ہیں جس میں قربات نبوت کو انتہا تک پہنچا دیا گیا۔ یہ ساتوں راتیں نبوت کے ساتوں دنوں کی ساتھ لازم ملزوم ہیں اور جس طرح ایام نبوت لوٹ لوٹ کر ہر دور میں آتے اور آتے رہتے ہیں ایسے ہی یہ راتیں بھی ہفتۂ نبوت کی تکمیل کے لئے مکرر

کرآتی رہنی ناگزیر ہیں کیونکہ یہ راتیں گو اپنی سطح کے لحاظ سے دورِ نبوت کے ساتھ مخصوص نظر آتی ہیں لیکن اپنی اصولی روح اور عمومی مفاد کے لحاظ سے وہ اسلام کے ہر دَور اور ہر دَور کے ہر مفاد کے لیے عام ہیں کیونکہ لیلۃ البدایۃ کی روح ذہنی استعداد کی تکمیل ہے۔ لیلۃ القدر کی رُوح ذہنی استعداد کا انبساط اور رگ وپے میں اس کا اتر جانا ہے۔ لیلۃ البرأۃ کی روح حوادث عالم کے اندازوں سے ذہنی ہم آہنگی ہے۔ لیلۃ العرفۃ کی روح ان حوادث کی اجتماعی شانوں کی ذہن نشینی ہے۔ لیلۃ الجمعہ کی روح ان ذہنی قوتوں کی تجدید ہے۔ لیلۃ الفتن کی روح اثنائے راہ کے فتنوں اور موانع کے دفعیہ اور سدِ باب کے طریقوں کو ذہن آشنا بنانا ہے اور لیلۃ المعراج کی روح تقرب الی اللہ کے انتہائی مقامات سے روحانی اور ذہنی شیفتگی اور توجہ الی الخلق کے مقامات سے قلبی وابستگی کی تکمیل ہے۔ ظاہر ہے کہ ہر زعیم و قائد اور ہر مصلح و مناد کو اپنی قائدانہ زندگی اور اپنی ذہنی پختگی کیلئے ان ساتوں مرحلوں سے گزرنا طبعی ہے۔ جس کے بغیر چارۂ کار نہیں کہ وہ اولاً اپنی ذہنی قوتوں کو سمیٹے تاکہ جو اصولی خاکہ دنیا کے سامنے لائے۔ وہ منضبط اور مرتب ہو اور اس کی تاثیر مضبوط ہو۔ جو صحیح ترتیب ہی سے مکمل ہوتی ہے۔ پھر ان میں ذہنی انبساط پیدا کرے جس سے تفصیلی پروگرام بنے۔ پھر دنیا کے واقعات کو سامنے لائے تاکہ نفسیات کے مطابق کام آگے بڑھے۔ پھر اجتماعی رنگ کو سمجھے کہ صحیح معاشرہ بنا سکے۔ پھر ہمہ وقت اپنی ذہنی قوتوں کو بار بار تازہ بتازہ بناتا رہے کہ اس کے عمل میں عزم و ثبات پیدا ہو۔ پھر اپنی فروگذاشتوں پر کڑی نظر رکھے۔ تاکہ مخاطبوں کو حرف گیری کا موقع نہ ملے اور کام میں اٹکاؤ پیدا نہ ہو۔ پھر اپنی ذہنی قوتوں کی تکمیل کی طرف بھی ہمہ تن متوجہ رہے کہ دوسروں کے بنانے میں خود اپنے اندر کسی بگاڑ کا اندیشہ نہ رہے اور جبکہ یہ حقیقتیں ہی ان سات راتوں کی روح ہیں۔ جن سے کسی مصلح و مناد کو چارۂ کار نہیں تو اُسکا قدرتی نتیجہ یہی نکلتا ہے کہ یہ سات راتیں ہر مصلح ہر مبلغ ہر قائد اور ہر لیڈر پر فطرۃً گذرنی ضروری ہیں ورنہ کارِ اصلاح پورا نہیں ہو سکتا۔ پس شرعی دنوں کی طرح یہ شرعی راتیں بھی لوٹ لوٹ کر قیامت تک آتی رہیں گی اور ہفتۂ نبوت اپنے دن رات سمیت حرکت اور تکرار میں رہے گا۔ جس سے واضح ہو گیا کہ جس طرح مادی آفتاب نے اپنی گردش سے ایک ہفتہ بنایا۔ جو پورے عالم کی عمر تھا جسے ہفتہ دنیا کہنا چاہیئے۔ اسی طرح آفتابِ روحانی نے بھی اپنی تشریعی نقل و حرکت سے ایک ہفتہ بنایا۔ جو

پورے اسلام کی عمر تھا جسے ہفتۂ نبوت یا اس کی اندرونی عمومیت کی جہت سے اُسے ہفتۂ اسلام کہنا چاہیئے ہفتۂ دنیا کے تکرار سے دنیا کی عمر دراز ہوتی ہے اور اس ہفتۂ اسلام کے تکرار سے اسلام کی عمر لمبی ہوتی ہے۔ اِس سے معاشی زندگی مکمل ہوتی ہے اور اُس سے معادی زندگی کی تکمیل ہوتی ہے۔

نظام زمانی

ہاں پھر جبکہ آفتاب نبوت کے بنائے یہ ایام انہی مادی ایام پر منطبق ہیں یہ نہیں کہ آفتاب نبوت نے کوئی زمانہ اس زمانہ سے الگ کسی اور عالم میں بنایا ہے۔ بلکہ انہی ایام کا رخ پھیر کر انہیں مادی سے روحانی کر دیا ہے اور جہاں بھی آفتاب نبوت کی نسبت ان ایام اور ان کی راتوں میں لگتی گئی ہے۔ وہی مقدس اور مقبول ہوتے گئے ہیں۔ نیز جن جن اوقات کو آفتاب نبوت نے اپنے روشن اعمال و وظائف کا ظرف بنا لیا ہے۔ وہی پاک اور مطہر ہوتے چلے گئے ہیں۔ اسلئے یہ ہفتۂ نبوت تو ایک کل زمانہ ہے جو پورے مادی زمانہ پر حاوی ہے یعنی جیسے مادی آفتاب کا بنایا ہوا کل زمانہ ہے۔ جس میں وقت کی لاکھوں کروڑوں ساعتیں آئی ہوئی ہیں۔ ایسے ہی آفتاب نبوت کا یہ بنایا ہوا اسلام کا ہفتہ کل زمانہ ہے۔ جس میں کروڑوں ایمانی دن اور مقبول ساعتیں، لاکھوں ایام اور ہزار ہا مہینے اور سال شامل ہیں جس سے واضح ہوا کہ مادی آفتاب کی طرح روحانی آفتاب کا بھی ایک نظام ہے کہ اس ہفتۂ اسلام میں اپنے اپنے محل اور موقع پر ضمنی رات اور دن آتے رہتے ہیں۔ مہینے اور سال شروع اور ختم ہوتے رہتے ہیں، ساعتیں اور دقیقے اپنی اپنی جگہ وضع ہوتے رہتے ہیں۔ اور اس طرح کل زمانہ ہی نہیں، بلکہ اس کے ضمن میں جزوی اوقات بھی اس نظام کے تحت مقدس ہوتے گئے ہیں اور انجام کار آفتاب نبوت نے اس مادی آفتاب کے پورے ہی زمانہ پر قبضہ کر کے اُسے اپنے نظام میں لے لیا ہے۔ مثلاً کہیں تو آفتاب نبوت نے اپنے وظائف کے لئے نظام شمسی کو اپنایا ہے جو بلاواسطہ مادی آفتاب کا قائم کیا ہوا نظام ہے اور کہیں نظام قمری کو اختیار کیا ہے جو بالواسطہ مادی آفتاب کا برپا کیا ہوا نظام ہے۔ مثلاً لیل و نہار میں یعنی رات و دن کی عبادتوں میں جن میں گھنٹے اور منٹ صرف ہوتے ہیں۔ آفتاب نبوت نے نظام شمسی کو معتبر قرار دیا گویا سورج کے حسی نظام میں اپنا روحانی اور معنوی نظام داخل کر کے اُسے

اپنا لیا ہے۔ جیسے نمازوں کے اوقات کا حساب آفتاب کی نقل و حرکت سے متعلق ہے بعض نمازوں کے اوقات اس کے طلوع و غروب سے متعلق ہیں۔ جیسے فجر و مغرب۔ بعض کا تعلق اس کی مقدار حرکت سے ہے۔ جیسے ظہر و عصر بعض کا تعلق اس کے آثار سے ہے۔ جیسے عشاء کہ غروب شفق سے اس کا وقت آتا ہے یا اسی طرح صبح و شام کے اذکار نظام شمسی سے ہی متعلق ہیں جیسے تسبیحات صبح و شام کہ یہ اوقات ذکر و نماز کا وقت ہو جانے سے مقدس بن گئے ہیں اور زمانہ کا ایک بڑا حصہ آفتاب روحانی کے نظام میں داخل ہوگیا۔

اِدھر اسی نظام کے تحت ماہ و سال کی عبادتوں میں نظام قمری کا اعتبار کیا ہے جو بالواسطہ سورج ہی کا نظام ہے کیونکہ چاند میں سورج ہی کا نور کام کرتا ہے۔ چنانچہ حج کے مہینوں کا تعین یعنی شوال، ذی قعدہ اور عشرۂ ذی الحجہ (تقریباً ڈھائی ماہ) وجوب زکوٰۃ کے لئے بارہ ماہ روزوں کے ایام کا ایک ماہ یا چلہ کشی مثلاً اربعین موسوی کا سوا ماہ یا مدت ایلا کے چار ماہ یا عدت طلاق کے تین حیض گویا تین ماہ یا عدت وفات زوج کے چار ماہ دس دن لیکر آفتاب نبوت نے زمانہ کے ایک اور عظیم حصہ کو گھیر لیا ہے۔

پھر اسی نظام روحانی کے ماتحت مخصوص عبادتوں کے مخصوص ایام جیسے اخیر عشرۂ رمضان کی دس راتیں یا اول عشرۂ ذی الحجہ کے دس دن یا دوسرے عشرۂ ذی الحجہ کے ابتدائی تین دن جنہیں ایام تشریق کہتے ہیں یا ہر ہفتہ کے پیر اور جمعرات کا دن جن میں بنی آدم کے اعمال اوپر چڑھائے جاتے ہیں یا ایام جمعہ کہ انہیں نظام قمری سے لیکر نظام روحانی میں شامل کر لیا گیا اور زمانہ کے ایک اور حصہ پر آفتاب نبوت کا قبضہ اور نظام قائم ہوگیا۔

پھر اسی روحانی نظام کے ماتحت وقت کی بہت سی ساعتیں اور گھڑیاں ادھر لے لی گئیں۔ جیسے ساعت شب قدر ساعت جمعہ اور ہر رات دن میں ایک ساعت جس میں قبولیت دعا کا وعدہ دیا گیا ہے یا نمازوں کی جماعت کھڑے ہونے کی گھڑی یا جہاد شروع کرنے اور یلغار کر کے بڑھنے کی ساعت یا دو مسلمانوں کے محبت سے ملنے اور مصافحہ کرنے کی ساعت یا تہجد میں اٹھنے اور نماز پڑھنے کی ساعت جن میں حق تعالیٰ نے اپنی خوشی اور بعض ساعتوں میں اپنی ہنسی کی خبر دی ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ مہینے اور ایام اور گھنٹے اور بعض ساعتیں محض اسلئے مقدس بن گئے کہ

وہ مختلف عبادتوں کیلئے بطور ظرف کے لئے گئے ہیں اور اسطرح زمانہ کے ایک اور بڑے حصہ پر آفتابِ نبوت کا نظام قائم ہو گیا اور یہ اوقات اس کے اوقات کہلائے۔ گویا مادی چاند سورج کے نظام کی ساتھ ساتھ ایک مستقل اور متوازی نظام آفتابِ روحانی کا بھی اس میں سمو دیا گیا ہے۔

پھر اسی روحانی نظامِ اوقات کے تحت آفتابِ روحانی نے بعض ایسے مقبول اوقات کی بھی اطلاع دی ہے۔ جو کسی ایک مقررہ ساعت میں نہیں آتے اور متعین بھی نہیں ہیں۔ مگر ہر ساعت میں ان کے آنے کا احتمال بتلا کر ایک حد تک پورے ہی زمانہ کو مقدس بنا دیا ہے جیسا کہ حدیثِ نبوی میں ارشاد فرمایا گیا کہ

الاان لربکم فی ایام دھرکم نفحات الا فتعرضوا لھا: — آگاہ ہو کہ تمہارے ان رات دن کے اوقات میں تمہارے پروردگار کی طرف سے مقبولیت کی کچھ ہوائیں چلتی ہیں۔ دیکھو ان کی جستجو میں لگے رہو اور انہیں ڈھونڈھتی رہو۔ (ایسا نہ ہو کہ تمہاری غفلت سے وہ مقبول گھڑیاں نکل جائیں اور تم محروم کے محروم رہ جاؤ)۔

اس حدیث نے زمانہ کی ہر ہر ساعت میں عبادت کے سبب تقدس اور مقبولیت کا احتمال پیدا کر کے گویا سارے زمانہ ہی کو روحانی نظام کے تحت میں لے لیا اور مقدس بنا دیا ہے اور ظاہر ہے کہ عبادت آفتابِ نبوت سے کشش کا ثمرہ ہے۔ اسلئے یہ پورا زمانہ عبادت کا ظرف ہو جانے کیوجہ سے آفتابِ نبوت کا بنایا ہوا زمانہ کہلائیگا اور اسکا ہو جائیگا بلکہ عملی طور پر دیکھا جائے تو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا ہر ہر لحظہ اور ہر ہر منٹ ذکر و طاعت میں مصروف رہتا تھا یعنی آپ نے اپنی سیرت پاک سے کل زمانہ کو عملاً مقدس بنا کر دکھا دیا۔ چنانچہ ارشادِ حدیث ہے کہ

کان یذکر اللہ علی کل احیانہ — آپ ہر لحہ اللہ کے ذکر میں مشغول رہتے تھے۔

اور فرمایا۔

کان دائم الفکرۃ حزیناً — آپ تمام اوقات متفکر اور غمگین سے رہتے تھے (خوف خداوندی اور فکر آخرت میں)

بہر حال زمانہ کے یہ وہ حصے ہیں جو شریعت نے خود اپنے انتخاب اور اپنے اختیار سے اپنے نظام میں مل کر اپنے لئے خاص کر لئے، خواہ تعین کے ساتھ یا بلا تعین عمومی احتمال کے ساتھ لیکن اسی کے ساتھ وقت کے وہ طویل و عریض حصے جو شریعت نے تخصیص کے ساتھ خود منتخب نہیں کئے۔ نہ تعیین خاص سے نہ احتمال عمومی سے بلکہ ان میں بنی آدم کو اختیار دے دیا ہے کہ وہ خود اپنے اختیار سے انہیں عبادت و طاعت کے لئے بطور ظرف کے منتخب کر سکتے ہیں تو اس کے یہ معنی ہیں کہ ان اوقات میں بھی روحانی نظام میں شامل ہو جانے اور مقدس بن جانے کی صلاحیت ہے مگر وہ عباد صالحین کے انتخاب و اعمال سے ظاہر ہوتی ہے بشرطیکہ وہ ان مقدس وظائف سے انہیں معمور کر لیں۔ اس میں نوافل، تلاوت، اذکار، جہاد، ہجرت نیز اخلاقی قدروں کا استعمال اور ساری ہی اختیاری طاعات آجاتی ہیں جنہیں انسان ان غیر مقررہ اوقات میں باذنِ خداوندی اپنے اختیار سے خود بھی مقدس اور مقبول بنا سکتا ہے اور اس طرح زمانہ کا ایک اور بڑا حصہ نظامِ روحانی کے تحت میں آجاتا ہے اور اس طرح تقریباً کل زمانہ بالفعل اور بالقوت عباداتی افعال کا ظرف بن جانے کی وجہ سے مقدس اور آفتابِ روحانی کے نظام میں شامل ہو جانے کی وجہ سے پاک اور مقبول ہو جاتا ہے۔ جس میں کچھ عبادتیں بامر شریعت انجام دی جاتی ہیں اور کچھ باذن شریعت بندہ اپنی مرضی سے انجام دیتا ہے۔ اسلئے زمانہ کی ہر ہر ساعت ظرف عبادت بن جانے کے سبب خواہ وہ بالقوت بنے یا بالفعل اور بانتخاب شرعی بنے یا بانتخاب عباد، مقدس بن کر آفتابِ نبوت کی ساعت ہو جاتی ہے۔

لیکن یہ ساری گفتگو عبادات میں تھی کہ وہ جس زمان و مکان میں واقع ہوتی ہیں، اس زمانہ اور مکان کو ظرف عبادت ہو جانے کی وجہ سے مقدس بنا دیتی ہیں، اور اسطرح وقت کا ایک عظیم حصہ آفتابِ روحانی کے نظام میں شامل ہو جاتا ہے لیکن انسان کے ساتھ ایک عبادت ہی تو نہیں، عبادات اور معاشرت کے افعال کا بھی ایک عظیم لشکر لگا ہوا ہے جیسے کھانا، پینا، سونا، جاگنا، آنا جانا، چلنا، پھرنا، پہننا، اوڑھنا، لینا، دینا، ملنا جلنا، ہنسنا، بولنا، رہن سہن، محبت، عداوت، دوستی، دشمنی، صلح جنگ، معیشت و معاشرت وغیرہ اور ان میں بھی انسانی زندگی کے وقت کا ایک بڑا حصہ صرف ہوتا ہے جو یقیناً عبادت میں مصروف نہیں ہوتا اور اسلئے بظاہر آفتاب نبوت کے اثرات سے محروم

رہ جانے کے سبب بدستور غیر مقدس رہ جاتا ہے۔ لیکن غور کیا جائے تو اس میں بھی آفتاب نبوت کے زمانہ کا وہی شرعی نظام سمایا ہوا ہے اور وہ اس طرح کہ گو یہ افعال فی نفسہ عبادت نہیں مگر اسلام نے انہیں بھی حسنِ نیت اخلاص اور اتباع سنت کے راستہ سے عبادت بنا دیا ہے۔ اسلئے جو شخص بھی شرعی نیت سے انہیں انجام دے گا۔ وہ عبادت بن جائیں گے اور زمانہ کے جس حصہ میں بطورِ عبادت واقع ہوں گے۔ اسی کو شکل شرعی اوقات کے مقدس اور مقبول بنا دیں گے۔ ظاہر ہے کہ اس کے بعد عمر کا کوئی حصہ ایسا باقی نہیں بچتا کہ وہ اس روحانی نظام سے باہر رہ جائے اور آفتاب نبوت کے تعلق سے بے نیاز یا محروم رہے۔ حاصل یہ نکلا کہ جس طرح مادی آفتاب کا نظام تنویر وضوفشانی پورے زمانہ پر حاوی ہے۔ اسلئے آفتابِ نبوت کا نظامِ روحانی بھی پورے زمانہ پر چھایا ہوا ہے۔ وہاں مادی سورج کی تکوینی نقل وحرکت سے حسّی نور کا نظام بنتا ہے۔ اور یہاں روحانی سورج کی تشریعی نقل وحرکت سے معنوی نور کا نظام بنتا ہے اور جس طرح وہ نظام انسان کی پوری زندگی پر حاوی ہے اسی طرح یہ نظام بھی اس کی پوری زندگی پر چھایا ہوا ہے۔

آفتاب نبوت کے بنائے ہوئے زمانہ سے موسموں کا ظہور

پھر جیسے آفتاب کی چال سے دن اور رات بنتے ہیں ایسے ہی اس چال کی مختلف وضعوں اور ہیئتوں سے موسموں اور فصلوں کا ظہور بھی ہوتا ہے۔ وہ خطِ استواء سے ہٹ کر جنوب کی جانب کو ہو کر چلنے لگتا ہے تو سردی کی آمد ہوتی ہے اور فصلِ خریف آجاتی ہے اور اگر شمال کی طرف ہو کر محو رفتار ہوتا ہے تو گرمی آتی ہے۔ موسم بہار شروع ہوتا ہے اور فصلِ ربیع کی آمد ہو جاتی ہے پھر ان فصلوں اور موسموں کے اثرات کائنات اور کائناتی اشیاء کے مزاجوں اور نفوس پر پڑتے ہیں۔ موسمِ بہار میں مزاجوں میں ابھار اور قوتوں میں امنگ ہوتی ہے اور موسم خزاں میں طبائع میں سُستی نباتات وحیوان پر پژمردگی اور جمادو معدنیات میں یبوست وخشکی کا ظہور ہوتا ہے۔ پھر انہی مختلف فصلوں کے تقاضوں سے مختلف پھل پھول غلّے میوے اور مختلف جڑی بوٹی پیدا ہوتی ہے۔ جن کی تاثیرات جانداروں کے مزاجوں میں نمایاں ہوتی ہیں جس سے تمام موالید اور پیدا شدہ چیزوں میں آفتابِ مادی کی تاثیرات نمایاں ہیں یعنی وہ مکان اور زمان ہی میں مؤثر نہیں بلکہ اعیان میں بھی مؤثر ہے اور ہر زمانی اور مکانی شے بلکہ اس کے اندرون تک میں بھی اس کی تاثیر پہنچی ہوئی ہے خواہ وہ جماد ہو یا

نباتے، حیوان ہو یا انسان۔

پھر موسموں کے تقاضے سے جب فضا آسمانی سے بارشیں اترتی ہیں تو زمین کی طرح سمندر اور اس کی مخلوقات میں بھی زندگی آتی ہے۔ ابر نیساں برستا ہے تو سمندری سیپ بیچ موتی پیدا ہوتے ہیں، اسی سے لعل بدخشانی کی نمود ہوتی ہے، اسی معدنیات میں ہیرے اور نیلم پیدا ہوتے ہیں جس سے مادی آفتاب کی تاثیر جو فضا اور زمین کے نیچے اس کے جوف تک میں نمایاں ہے غرض آسمان کے نیچے ہوا اور فضا، زمین کی سطح، جوف زمین، سمندر کی سطح اور اس کی گہرائیوں میں آفتابی تاثیرات اپنا کام کرتی رہتی ہیں، جس سے عالم کی مصالح برقرار ہیں اور جہانوں کے کارخانے چل رہے ہیں۔

ٹھیک اسی طرح اس آفتاب روحانی کی شرعی چال سے جیسے رُوحانی زمانہ، رُوحانی دن رات اور روحانی ہفتے بنتے ہیں۔ ایسے ہی اس سے روحانی فصلوں اور موسموں کا بھی شرعی نظام کے تحت ظہور ہوتا ہے اور وہ مواسم اور فصول نمایاں ہوتے ہیں، جن سے مختلف معادی اور اُخروی امور کا تعلق ہے۔ نبی کا قرن پاک یعنی خیرالقرون، مجددوں کی تجدید دین کے زمانے اصلحاء و اتقیاء کے غلبہ صلاح و رشد کے اوقات روحانی ایام میں موسم بہار کا درجہ رکھتے ہیں، قلوب میں انبساط ہوتا ہے تخم سعادت کے نشو و نما پانے کی گھڑیاں نمایاں ہوتی ہیں اور ہر قلب میں شجرۂ ایمان کے اُگ آنے اور برگ و بار لانے کی قریبی استعداد پیدا ہو جاتی ہے۔ ہر کس و ناکس اپنے ضمیر میں ایک خیر محسوس کرتا ہے اور ایمان و عمل صالح خود بخود سعید قلوب میں اُبھر آتے ہیں، گویا جھوٹ کو بھی اگر خیر کا تخم دل میں گڑ جائے تو وہ بیج کونپل لے آتا ہے اور تھوڑے ہی عرصہ میں تناور تناور درخت بن جاتا ہے، ہاں جب ان زمانوں سے دوری ہوتی ہے تو وہی اس روحانیت کی موسم خزاں ہوتی ہے۔ جس میں دل کملائے ہوئے ہوتے ہیں، دین کے لحاظ سے سرد مہری پیدا ہو جاتی ہے۔ علمی اور عملی قویٰ مضمحل اور سُست پڑ جاتے ہیں، فتنوں کا ظہور ہوتا ہے اور امانت گھٹ جاتی ہے۔ اخلاق فاضلہ گم ہو جاتے ہیں اور اخلاق رذیلہ کی گرم بازاری ہو جاتی ہے۔ کفر و بغاوت ابھرتی ہے، سرکشی اور بے حیائی نمایاں رہتی ہے۔ غرض کسی رات دن میں

سیروا فیھا لیالی وایاما آمنین ؏ اس زمین میں راتوں اور دنوں مامون ہو کر چلو پھرو۔

کا ظہور ہوتا ہے جو دورِ امانت ہوتا ہے اور کسی زمانہ میں۔

فی یوم نحس مستمر اور (ایسے دن میں جو ہمیشہ نحس ہوگا)

فی ایام نحسات اور منحوس دنوں میں

کا ظہور ہوتا ہے جو دورِ فتن ہوتا ہے۔ پہلا موسم روحانی بہار کا ہے اور یہ دوسرا روحانی خزاں کا۔

پس اگر مادی آفتاب سردی کا موسم لاتا ہے۔ جس میں فصلِ ربیع کی آمد ہوتی ہے اور وہ پھل پھول کا زمانہ ہے تو یہی شرعی فصلِ ربیع کا بھی وقت ہوتا ہے جسے آفتابِ نبوت اپنے روحانی تصرف سے برپا کرتا ہے۔ جس میں روحانی پھل پھول اُگتے ہیں۔ یعنی سردی کی رات لمبی رات ہوتی ہے تو تہجد اور قیام لیل نیند کے متوالوں کیلئے بھی آسان ہو جاتا ہے اسی لئے حدیث نبوی میں ارشاد فرمایا گیا کہ

الشتاء ربیع المؤمن سردی کا موسم مومن کیلئے فصلِ ربیع کا زمانہ ہے۔

یا اسی لئے زمانہ نبوی کو خیر القرون فرمایا گیا۔ جس میں نورِ نبوت اور نورِ صحابیت چمک کر خیر و شر کا راستہ واضح کر دیتا ہے اور زمانہ تابعین کو خیر کہا گیا مگر دوسرے درجہ میں گویا یہ سب موسم بہار کے اعلیٰ و ادنیٰ حصے ہیں جن میں خیر اور روحانیت دنیا پر غالب ہوئی۔ بعد کے قرون خزاں کے ہوئے تو مجددوں کو مثل ابرِ باراں کے بھیجا جاتا ہے۔ جس سے دلوں کی مردہ زمین پھر زندہ اور سری بھری ہو جاتی ہے۔ پھر جیسے مادیات میں ہر موسم کا پھل پھول الگ الگ ہوتا ہے۔ کسی موسم میں آم کسی میں سیب، و سنترہ اور کسی میں انگور و انار اور خرما وغیرہا۔ ایسے ہی ان روحانی فصلوں کے گل و گلزار اور پھل پھول بھی الگ الگ ہیں۔ کسی موسم میں آفتابِ نبوت کی تاثیر سے شرعی پھل پھول اُگتے ہیں۔ کسی مجدد کے دور میں قرآنی تجلیات دیانات کے رنگ میں ہوتی ہے۔ کسی دور میں سیاسی رنگ میں جلوہ گر ہوتی ہیں۔ کسی دور میں عمل کی فراوانی ہوتی ہے اور کسی دور میں علم و استدلال اور حجت و برہان کی افزائش ہوتی ہے۔ کسی دور میں رنگ تجدید صوفیانہ ہوتا ہے اور کسی میں متکلمانہ کسی دور میں املاء حدیث کا دور دورہ ہوتا ہے اور کسی میں فقہ و تفقہ کی گرم بازاری غرض مختلف زمانوں میں مختلف روحانی فصلیں آتی ہیں اور اپنے مناسب حال پھل پھول اور برگ و بار لاتی ہیں اور یہ سب کچھ آفتابِ نبوت ہی کی مخفی تاثیرات و تصرفات کا ثمرہ ہوتا ہے۔ جیسا کہ مادی موسموں میں مادی آفتاب

ہی کی مختلف تاثیرات نمایاں ہوتی ہیں۔ غرض آفتاب نبوت نے جس ساعت پر اور اس کی جس وضع اور فصل پر اپنا نورانی سایہ ڈال دیا یا وہی ساعت مقدس ہوگئی اور اس طرح آفتاب نبوت کا مستقل روحانی نظام ان رات دن کے سارے دوروں اور گردشوں پر پڑا ہوا ہے جس سے اس کی تاثیرات کی ہمہ گیری اور عموم فیضان واضح ہو جاتا ہے۔

نام زد ایام

پھر ظاہر ہے کہ مادی آفتاب کے بنائے ہوئے یہ دن اور رات جبکہ ظرف ہیں، جن میں مختلف کاروبار اور مہمات امور بھی واقع ہوتے ہیں، جن میں بہت سے ایسے تاریخی بھی ہوتے ہیں جو عام دنوں کے لحاظ سے امتیازی شان اور شہرت عامہ رکھتے ہیں یعنی مادی لوگ جب انہیں اپنے کسی اہم اور اجتماعی کام کا ظرف ٹھہرا لیتے ہیں تو یہ ایام اہم شخصیتوں یا ان کے اہم کردار وعمل کی طرف منسوب ہوکر انہی کے نام زد ہو جاتے ہیں، انہی کے دن کہلاتے ہیں اور ان دنوں کو اجتماعی طور پر بطور عید کے منایا جاتا ہے۔ جیسے مقتدایان مذاہب کی پیدائش یا وفات، یا ان کے کسی تاریخی کارنامہ کے ایام کو انہی حوادث کی طرف منسوب کرکے لوگ انہیں بطور "ڈے" کے مناتے ہیں اور یہ ایام تاریخی طور پر انہی شخصیتوں کے ایام کہلانے لگتے ہیں، جیسے ہندوؤں میں "کرشن ڈے" یا مسلمانوں میں "حسین ڈے" یا عیسائیوں میں "یوم مسیح" بڑا دن یا سیاسیوں میں "گاندھی ڈے" یا "تلک ڈے" وغیرہ یا جیسے سیاسی جماعتوں کی آزادی کی جدوجہد کے کامیاب ہونے کے دنوں کو "یوم آزادی" کہکر بطور جشن کے مناتے ہیں، یا یوم جمہوریت کا نام دے کر دستوری حکومت کا جشن منائے ہیں یا سیاسی کشمکش کے زمانہ میں رضاکاروں کی مظلومانہ موت پر "یوم شہداء" کے نام سے دن منایا جاتا ہے۔ کسی بادشاہ کے تخت نشین ہونے کے دن کو "یوم جشن" یا سال کے پہلے دن کو یوم سالگرہ کہہ کر منایا جاتا ہے اور اکثر اس ملک کا تاریخی سن بھی بطور یادگار اسی دن سے شروع کیا جاتا ہے یا سلاطین و امراء کی عمر کے پہلے دن کو ہر سال "یوم سالگرہ" کہہ کر بطور جشن کے منایا جاتا ہے۔ غرض دن بنانا تو آفتاب کا کام ہے۔ مگر کسی اہم اور عظیم کام یا شخصیت کے انتساب کی وجہ سے اُسے مادیت پسند لوگ اپنا لیتے ہیں اور اپنے کام سے موسوم کرکے

سال بہ سال اُسے شہرت دیتے رہتے ہیں۔

لیکن حقیقت پر غور کیا جائے تو کسی عمل کے لئے دن کی آئینی تخصیص اور انتساب کے ساتھ اُسے یومِ اجتماع قرار دینا اصل حق نبوت اور آفتاب نبوت کا ہے کہ یہ تخصیص فی الحقیقت دین ہی کے دائرہ کے لئے وضع ہوئی ہے۔ مادی دنیا نے اس کی نقالی یا سرقہ کر کے حکومتوں یا حکومتی کاموں یا حکومتی شخصیتوں کے لئے اسکا استعمال شروع کر دیا حالانکہ یہ تخصیص دینی کاموں یا دینی شخصیتوں میں بھی دین کی اجازت کے بغیر جائز نہ تھی چہ جائیکہ دنیوی کاموں اور شخصیتوں کیلئے یہ شرعی طریق عمل سرقہ کیا جائے۔ یہ سرقہ اگر دینی وضع کے اموریں برنگ دین کیا جائے اور اسے بطور رسم و رواج استعمال کیا جائے اور اس رنگ سے ان ایام کو دینی باور کرایا جائے تو یہ اسلئے مذموم ہوگا کہ یہ ایک شرعی حق میں تصرف اور مصرف کی تبدیلی ہے اور اگر خالص دنیوی قسم کے امور میں استعمال کیا جائے تو یہ دینی ایام کے حقوق میں مداخلت ہوگی جو یقیناً بے جا ہے۔

ہاں اگر ان ایام کو آفتاب نبوت اجتماعی حیثیت دے کر کسی شرعی مہم کے لئے بطور یادگار اپنے نظام میں لے آئے تو نار حق ہوگا۔ جیسے رمضان کے تیس دن کے روزوں کے بعد یکم شوال کو "یوم الفطر" کا نام دے کر بطور ڈے کے منایا جانا تجویز کیا اور اُسے نماز کی عبادت سے معمور کر دیا گیا یا جیسے موسم حج میں مناسک کے ذیل میں ابراہیمی قربانی کے یاد کے طور پر دسویں ذی الحجہ کو "یوم النحر" کہہ کر بطور ڈے کے رکھا گیا اور اُسے نماز اور قربانی کی عبادت سے معمور کر دیا گیا تاکہ اداء شکر کی علامت ہو یا جیسے موسیٰ علیہ السلام کے یوم نجات یا یوم آزادی کو جو محرم کے عشرۂ اولیٰ کا آخری دن تھا۔ یوم عاشوراً کہکر بطور یوم خاص کے رکھا گیا اور اُسے ابتداءً فرض روزہ سے اور بعد میں نفل روزہ کی عبادت سے معمور کیا گیا تاکہ اس خوشی کی یاد دنیا میں ہمیشہ ہمیشہ تازہ رہے یا جیسے حج جیسی عظیم اجتماعی عبادت کے یوم افتتاح کو "یوم الترویہ" کہہ کر ایک امتیازی شان دیدی گئی تاکہ اس عبادت کے افتتاح کی اہمیت وعظمت قیامت تک نمایاں ہوتی رہے۔ وغیرہ وغیرہ۔ پس یہ وہ ایام اللہ ہیں جن کی تذکیر

ذَكِّرْهُمْ بِاَيّٰمِ اللّٰهِ   اور یاد دلائے ایام اللہ کو

کی روشنی میں خاص طور پر کیجاتی ہے۔ پس مذکور ایام الدنیا کی تذکیر اہل دنیا ڈے منا کر کرتے ہیں اور ان ایام اللہ کی تذکیر اہل اللہ ڈے منا کر کرتے ہیں۔ مگر ڈے معیّن کرنا اور منانا حقیقتاً حق شریعت

کا ہے۔ اہل دنیا نے نظام دین کے متوازی دنیوی نظام بنا کر ڈے متعین کر کے مداخلت فی الدین کا ثبوت دیا ہے۔ جیسا کہ اہل دین کے جاہل طبقہ نے دین اور اہل دین کے نام سے از خود ڈے متعین کر کے ان کے منانے کی عیدیں منالیں۔ جیسے گیارھویں کا دن، دسویں کا دن، تیجہ کا دن، برسی کا دن یا فلاں بزرگ کا دن، صدیق ڈے، فاروق ڈے وغیرہ متعین کر کے دین کے رنگ میں مداخلت فی الدین کی ہے اور یہ چیز پہلے کی بہ نسبت زیادہ قبیح ہے کہ دین میں التباس اور تلبیس پیدا کرتی ہے۔

بہر حال مادی آفتاب کی طرح روحانی آفتاب نے اپنا زمانہ خود بنایا، لیل و نہار خود وضع کئے ماہ و سال خود تیار کئے، موسم اور فصول خود بنائے۔ ان میں نسبتیں خود ڈالیں اور اس طرح پورے زمانہ کے مادی نظام کے دوش بدوش اپنا ہمہ گیر روحانی نظام قائم کر دیا جس سے اس کا فیضان عام مکان سے لے کر زمان تک اور زمان کے سال سے لے کر ماہ و ہفتہ و ساعت تک سب پر منظم طریق پر چھایا ہوا ہے جو آفتاب نبوت کی عالمگیر وسعتوں اور عمومیت فیضان کی کھلی دلیل ہے۔ اور یہ عمومیت مادی آفتاب کی ان عرض کردہ شباہتوں سے جب پایۂ ثبوت کو پہنچی تو بلاشبہ سراج منیر کی دلالت کے نیچے آ کر اس آیت کا مصداق ہو گئی۔ فللّٰہ الحمد والمنۃ۔

آفتاب نبوت اور اجتماعیت کبریٰ

مزید غور کرو تو آفتاب نبوت کا یہ طلوع و غروب جس سے نبوت کے رات دن بنے صورتاً طلوع و غروب ہے۔ ورنہ درحقیقت عروج و نزول ہے جس کی محض صورت طلوع و غروب کی ہے۔ پس آفتاب نبوت نے اگر اس عالم شہود سے عالم غیب کی طرف رُخ کیا جسے ہم نے غروب سے تعبیر کیا تھا تو وہ حقیقی غروب نہیں بلکہ عروج تھا مقاماتِ قرب کی طرف اور اگر اس نے عالم غیب سے پھر عالم شاہد کا رُخ کیا جسے ہم نے طلوع کہا تھا تو وہ درحقیقت طلوع نہیں بلکہ نزول تھا خلق خدا کی طرف تاکہ وہ غیبی نور سے فیضیاب ہو اسلئے یہ طلوع و غروب حقیقی نہیں بلکہ بمعنی عروج و نزول ہے۔ حقیقی طلوع ایک ہی ہے اور وہ آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی دنیا میں تشریف آوری ہے اور حقیقی غروب بھی ایک ہی ہے اور وہ آپ کی عالم بالا کی طرف تشریف

بری ہے۔ اسلئے یہ سمجھ لینا چاہئے کہ آفتاب نبوت کے طلوع سے جو دن نکلا وہ ۶۳ برس کا ایک ہی دن تھا جس میں یہ عروج و نزول ہوتا رہا اور اس سلئے حقیقی رات اگر ہے تو وہ ولادت و بعثت سے قبل کا زمانہ ہے جس میں نجوم نبوت لاکھوں کی تعداد میں چمکتے رہے اور وہ آدم علیہ السلام سے لیکر زمانہ ولادت نبوی تک کا زمانہ ہے جو تقریباً سات ہزار برس ہوتا ہے گویا سات ہزار برس کی ایک روحانی لمبی رات عالم پر گذری جس کے بعد دن نکلا اور وہ دن ۶۳ سال کا تھا اس دن کے اگر سات حصے کئے جائیں تو نو نو برس کے سات حصے ہوتے ہیں جس کے یہ معنی ہونگے کہ خاتم نبوت کے ۹ برس پچھلی نبوتوں کے ایک ہزار برس کی برابر ہوتے ہیں، ان نبوتوں نے ایک ایک ہزار برس کے دوروں میں جو کام انجام دیئے وہ خاتم النبیین نے ۹ برس میں انجام دیدیئے ولادت شریفہ سے بعثت تک چالیس سالہ مدت گو نبوت کی مدت نہیں کہلاتی مگر مبادی نبوت اور نبی کی پاک فطرت کے ظہور کی مدت ضرور ہے جسے متعلقات نبوت ہی میں سے سمجھنا چاہیئے۔

بہر حال صبح صادق کے بعد طلوع آفتاب کا سب سے بڑا فیض روزِ روشن کا وجود ہے جو صرف آفتاب کے ساتھ مخصوص ہے اور اس میں کوئی ستارہ بلکہ سارے ستارے مل کر بھی اسکے سہیم و شریک نہیں، ظاہر ہے اس صورت میں جو دن کی خصوصیات ہیں، وہ بھی آفتاب ہی کی ساتھ مخصوص ہو سکتی ہیں نہ کہ ستاروں کے ساتھ اگر ہوں گی تو رات کی خصوصیات ہو سکتی ہیں نہ کہ دن کی، سو رات کی خصوصیات یہ ہیں کہ لوگ جسمانی حیثیت سے آرام کرتے ہیں، عام کاروبار اور اجتماعی امور جیسے تمدنی معاملات، لین دین، میل جول، عمومی معاشرت، نظام ملت دفتری اور سیاسی مہمات قومی معاہدات، بین الاقوامی معاملات، جنگ و جہاد، ملکی فتوحات ملتوی رہتی ہیں، معاملات کے سلسلہ میں زیادہ سے زیادہ اہل و عیال کے واجبی حقوق، عزیز و اقارب یا اور آگے بڑھکر پڑوسیوں کے حقوق کچھ ادا کئے جاتے ہیں اور اُسے ہی بہت کچھ سمجھا جاتا ہے، ہاں روحانی لوگ روحانی طور پر اگر خدا پرستی میں لگتے ہیں تو انفرادی طور پر خلوت گزینی کے ساتھ فرائض عبودیت ادا کرتے ہیں، ورنہ اجتماعی عبادتوں کا محل عادۃً اور عامۃً رات نہیں ہوتی، اسی سلئے قرآن حکیم نے دن کو معاشاً فرمایا اور رات کو سکناً بتایا، دن کاروباری اور میل جول کی زندگی کا وقت ہے اور رات سکون اور یکسوئی کا وقت ہے۔ بالفاظ دیگر دن اجتماعیت کا زمانہ ہے اور رات انفرادیت اور انقطاعیت کا

ٹھیک اسی طرح آفتاب نبوت کے طلوع سے قبل جبکہ لمبی روحانی رات تھی، مذاہب عالم پر نظر ڈالنے سے اندازہ ہوتا ہے کہ ان میں انفرادیت، بلکہ انقطاعیت کا رنگ غالب تھا۔ تنہا تنہا عبادت کرنا اصل تھا۔ دین میں کوئی اجتماعی زندگی نہ تھی، کوئی اجتماعی ڈھنگ نہ تھا۔ مخلوق سے الگ تھلگ رہ کر ہی خالق کی یاد ممکن سمجھی گئی تھی۔ گوشہ گیری رہبانیت خلوت گزینی عبادت کی اصل تھی، لوگ پہاڑوں کی چوٹیوں، لق و دق بیابانوں اور دریاؤں کے کناروں پر پہنچ کر ریاضتوں میں مشغول رہنا ہی روحانیت جانتے تھے۔ انہیں بسلسلہ تکمیل روحانیت دنیا کے شہری اور ملکی معاملات سے کوئی تعلق نہ ہوتا تھا۔ مذہب کے معنی ہی صرف بندہ اور خدا کے درمیانی رابطہ کے تھے۔ ملک الگ اور دین الگ تھا۔ ہر ایک دائرہ کے رجال کار الگ الگ تھے جو گویا قومی تجزیہ کے طور پر مخصوص ہو جاتے تھے۔ مخلوق رسی اور میل جول کے رشتے منافی روحانیت سمجھے جاتے تھے۔ کسی مذہب میں نکاح اور عورت سے انتفاع خلاف روحانیت تھا تو روحانی ترقی کی پہلی سیڑھی ترک نکاح تھا۔ کسی مذہب میں شہری زندگی منافی روحانیت تھی، اسلئے گھر بار زمین جائیداد اور تعلقات سب کچھ چھوڑ کر جنگلوں اور پہاڑوں میں جا بیٹھنا ہی سب سے بڑی عبادت تھی۔ کسی مذہب میں کھانے پینے پہننے اوڑھنے کی نعمتوں سے مستفید ہونا خلاف روحانیت تھا۔ اسلئے لذائذ ترک کر کے جنگل کے پتوں اور بناسپتی پر گذر بسر کرنا، لباس کے بجائے لنگوٹی کی ایک دھجی باندھ لینا یا کھانے کمانے میں بھیک پر گذر کر لینا ہی سب سے بڑا زہد و تقویٰ اور تواضع و انکساری کی روح سمجھا گیا تھا۔ بالفاظ دیگر تعذیب روحانی کے بجائے تعذیب جسمانی مذہب تھی۔ اسلئے خودکشی کر لینا، اپنے کو پہاڑوں سے گرا کر ہلاک کر لینا، دریاؤں میں ڈوب کر مر جانا، آگ چاروں طرف جلا کر بیچ میں اپنے کو تپانا اور کباب بنانا، کانٹوں اور کیلوں پر بیٹھ کر بدن کو چھید ڈالنا ہی دینی ریاضت سمجھی جاتی تھی، جس کا حاصل تعذیب جسمانی کے ساتھ ہی مخلوق سے انقطاع اور اپنے کو سارے بشری تقاضوں سے خالی کر لینا نکلتا ہے کیونکہ یہ دور روحانی رات کا تھا اور رات میں انفرادیت ہی کا دور دورہ ہوتا ہے نہ کہ اجتماعیت کا، یکسوئی ہی کا غلبہ ہوتا ہے نہ کہ ذات البینی معاملات کا، باقی اس سے انبیاء وقت یا شرائع الٰہیہ پر کوئی حرف نہیں آسکتا۔ یہ سب کچھ تنگیاں اور دینی احکام میں انقطاعیت اور انفرادیت اس وقت کی جبلتوں کا تقاضا تھا۔ نفسانی قوتیں جتنی قوی ہوتی ہیں، اتنا ہی شدید میلان دنیا اور لذائذ

دنیا کی طرف ہوتا ہے اور اس سے اٹھانے کے لئے اتنا ہی سخت مجاہدہ اور ریاضت اُنسے کرایا جاتا ہے کہ اس کے بغیر ایسے قوی نفوس روحانیت کی طرف نہیں آسکتے۔ امم سابقہ اپنی نفسانی قوتوں کے لحاظ سے اس قدر شدید اور ان کی جبلتیں اور طبیعتیں اس درجہ دنیا کے جاہ و مال کی الفت میں غرق تھیں کہ اگر کسی حد تک بھی انہیں دنیوی شوکت و دولت اور لذات دنیا میں ڈھیل دی جاتی تو ان کے منحرف نفوس دین کو یکسر خیرباد کہہ کر دنیائے محض ہی پر آگر رُکتے اور کبھی بھی انہیں دین حق سے لگاؤ نہ ہوتا۔ پس ان کا دین کسی طرح بھی بغیر اس کلی یکسوئی اور انقطاع لذات کے تھم نہیں سکتا تھا۔ دوسرے لفظوں میں اس وقت کا دین دنیا کے تمدن کے دوش بدوش نہیں چل سکتا تھا اور اس وقت کی دنیا کا کوئی ایک طبقہ بھی دین اور دنیا دونوں کا جامع نہیں ہو سکتا تھا۔ دین کا حامل وہی طبقہ ہوتا تھا جو دنیا سے کلی انقطاع کر کے رہبانیت کے ساتھ گوشہ گیری اختیار کرے۔ اسلئے دین کو دنیوی شوکت سے الگ کر کے ملوکیت ایک طبقہ کو دیدی جاتی تھی اور روحانیت کا حامل دوسرا طبقہ بنتا تھا جو دنیا سے بالکل الگ تھلگ گر جاؤں، زاویوں، صومعوں اور مندروں میں محبوس رہتا تھا۔ اُسے ان زاویوں سے باہر نکلتے ہی خطرہ تھا کہ شیاطین اس کا دین اچک لیں گے اور ان کے تمدن اور سامانوں کے قریب پہنچکر اپنے دین کو کسی طرح بھی نہ سنبھال سکیگا۔ پس نفوس کی کمزور روحانیت اور قوی ترین نفسانیت اس انفرادیت اور انقطاعیت کا سبب ہوتی تھی نہ کہ معاذ اللہ انبیاء کی قوت روحانی کی کمی یا دین کا نقص۔ اسلئے جتنا بھی ان کی طبیعتیں طبعاً دین برداشت کر سکتی تھیں، اتنا دین ان کے لئے اتارا جاتا تھا۔ جس میں جامعیت نہ ہوتی تھی کہ طبائع ہی جامع نہ تھیں جو جامع دین کا تحمل کر سکتیں۔

لیکن جوں ہی آفتاب نبوت نے طلوع کیا اور روحانیت کا دن نکل آیا تو قدرتی طور پر انفرادیتیں ختم ہو کر اجتماعیتوں میں تبدیل ہونے لگیں کیونکہ اجتماعی دین میں طبعاً یکسوئی کا وقت ہوتا ہی نہیں بلکہ جلوتوں اور اجتماعی کاموں کا وقت ہوتا ہے۔ اسلئے جب آفتاب نبوت کا نور چمکا تو طبیعتیں جماعتی دین اور اجتماعی روحانیت کی طرف مائل ہونے لگیں اور اپنی خاموش پکار سے ایک ایسا دین مانگنے لگیں جس میں دین کے ساتھ دنیا سے انقطاع نہ ہو۔ دیانت کے ساتھ سیاست اور نظم ملت بھی جمع شدہ ہو اور انفرادیت کے ساتھ اجتماعیت بھی مخلوط ہو کیونکہ دنیا کی آخری امت ظاہر ہو چکی تھی، جو

پچھلی اقوام و امم کے تجربات علمی طور پر سامنے رکھتی تھی ابتدائی قوتوں کی افراط کے ردِعمل کا قدرتی تقاضا تھا کہ آخری قوم مزاج میں افراط و تفریط کے بجائے اعتدال رکھتی ہو، نہ اس کے نفسانی قویٰ ایسے ہیجان میں آئے ہوئے ہوں کہ وہ دنیوی لذات کے ساتھ دین اور روحانیت کے تصور ہی سے بھاگنے لگے اور نہ ایسی متقشف اور زاہد تنگ نظر ہو کہ دنیا اور اس کی لذات کے مادے ہی اس میں سے ختم ہو چکے ہوں بلکہ اس میں قوائے نفسانی اور قوائے روحانی کا ایک ایسا معتدل امتزاج تھا کہ وہ دین کے ساتھ دنیوی شوکت کو اور دنیوی شوکت کے ساتھ روحانیت کو جمع کرنے کی اہل ہو چکی تھی، وہ تخت سلطنت پر بیٹھ کر درویش بھی رہ سکتی تھی، جیسے خلفاء راشدین اور صلحاء سلاطین نے کی اور وہ درویشی کی گلیم اوڑھ کر ملت کی تنظیم بھی کر سکتی تھی جیسا کہ انہوں نے کر کے دکھلائی اسلئے ملک و دین توام کر دئے گئے اور ایک ایسی جامع اور کامل نبوت بھیجی گئی جو جلال و جمال، مہر و قہر دیانت و سیاست کی بیک آن حامل تھی اور اس کامل امتزاج دین و دنیا کے سبب انہیں استخلاف فی الارض کا منصب عطا کیا گیا نہ انہیں کورا ملک بلا دین کو دیا گیا اور نہ کورا دین بلا شوکت کے دیا گیا چنانچہ دین بے شوکت کے بارہ میں اعلان ہوا کہ

لا رھبانیۃ فی الاسلام — اسلام میں گوشہ گیری اور انقطاعیت نہیں

لذات لباس و طعام کے بارہ میں بتلایا گیا کہ وہ دین کے ساتھ جمع ہو سکتی ہیں۔

قل من حرم زینۃ اللہ التی اخرج لعبادہ والطیبات من الرزق ۔ — آپ ضرور کہئے کہ اللہ کی زینت اور پاک رزق کو کس نے حرام کیا جسے اللہ نے بندوں کے لئے پیدا فرمایا ہے۔

بتلایا گیا کہ گھر گرہستی ہونا دین و روحانیت کے منافی نہیں بلکہ معین دین ہے۔

النکاح سنتی فمن رغب عن سنتی فلیس منی ۔ — نکاح میری سنت ہے جس نے میری سنت سے اعراض کیا، وہ میری جماعت سے نہیں ہے۔

گھر بار رکھنا اور زمین جائیداد کا حاصل کر لینا دین کی ضد نہیں ہے جو اس کے ساتھ جمع نہ ہو سکے۔

واللہ جعل لکم من بیوتکم — اور اللہ نے تمہارے گھروں کو تمہارے لئے

سکنا ؛ وجہ سکون بنایا ہے۔

اور آخر کار صاف اعلان کر دیا گیا کہ آج کے دن دین اور ملک جمع کر دئے گئے۔ جیسے دو جُڑواں بچے پیدائشی طور پر جڑے ہوئے پیدا ہوتے ہیں کہ انہیں کوئی جدا نہیں کر سکتا اور کر دیا جائے تو دونوں ضائع ہو جائیں۔

الملك والدين توامان	ملک اور دین جوڑواں بچے ہیں اللہ تعالے
اللہ امرنی بھن الجماعۃ	نے مجھے ان چیزوں کا حکم فرمایا۔ جماعت
والسمع والطاعۃ والھجرۃ	سمع و طاعت ہجرت اور جہاد کا
والجھاد (تفسیر ابن کثیر)	؛
پھرامام جنۃ ومن لم یعرف	امام ڈھال ہے۔ جس نے امام وقت کو
امام زمانہ فقد مات میتۃ	نہیں پہچانا۔ اس نے موت جاہلیت کی
جاھلیۃ۔ الجھاد ماض الی	پائی۔ جہاد قیامت تک جاری رہنے والا
یوم القیمۃ ؛	ہے۔

پھر عبادات بھی جماعتی رکھی گئیں۔ نماز باجماعت ہوئی۔ جس کے لئے امام ضروری ہے۔ حج باجماعت ہوا۔ جس کے لئے امام ضروری ہے۔ زکوٰۃ کا نظم جماعتی ہوا۔ جس کے لئے امام یا اس کے قائم مقام کا وجود ضروری ہے۔ سفر جماعتی ہوا۔ جس کے لئے امیر کا انتخاب ضرور ہوا۔ تدبیر منزل جماعتی ہوئی۔ جس کیلئے امیر خانہ کی ضرورت ہوئی۔

کلکم راع وکلکم مسئول عن	تم میں کا ہر ایک نگہبان ہے اور اپنے ماتحتوں
رعیتہ ؛	کے بارے میں اس سے سوال کیا جائے گا۔

دنیا داری اور دینداری کی تفریق اٹھ گئی اور بتلا دیا گیا کہ ہر دنیا دار اپنی پوری دنیا سمیت۔ دیندار ہو سکتا ہے اور ہر طبیعی اپنے تمام امور طبیعہ کو نیت و اتباع کے رشتہ سے باندھ کر شرعی بن سکتا ہے۔ یعنی امور طبیعہ کو امور شرعیہ بنا دیا گیا ہے۔ کھانا کھانے، بیوی کے پاس جانے، پڑ کر سونے اور قضائے حاجت کرنے کو موجب اجر بتایا گیا۔ جبکہ وہ طریق سنت پر ہو۔ عیادت مریض، بیمار پُرسی مشایعت جنازہ، میت کو غسل دینا، تعزیت اموات، تجہیز و تکفین کی شرکت عبادت قرار پائی۔ ہوی کی

خدمت، عیال کی تربیت، غلاموں کی خبر گیری، یتیموں پر شفقت، مظلوموں کی حمایت، سرکشوں کو دبانا، قاتلوں سے قصاص، چوروں کو سزا، شراب خوروں کی تعزیر، جوئے بازوں کی پاداش، مفسدوں سے جنگ، عبادت و دین قرار پائی، تجارت، صنعت و حرفت، ملازمت دیانت کا جزو بن گئی بین الاقوامیت، بین الاوطانیت، عالمی قومیت، عالمی تنظیم یعنی خلافت روس دین بن گئے، امارات شورائیت، عسکریت، اصولِ دین ہوئے۔ بھیک مانگ کر انفرادیت کو قائم رکھنے کی کوشش مذموم قرار پائی۔ یدِ علیا یدِ سفلیٰ سے بہتر قرار دیا گیا۔ ہر وہ چیز عبادت اور قرابت و طاعت بتائی گئی جس میں ایک کو دوسرے سے سہارا لگے۔ قول سے ہو یا عمل سے۔ اخلاق سے ہو یا اشارے سے اور اعلان کر دیا گیا کہ

واللہ فی عون العبد ما کان العبد فی عون اخیہ ؛	اللہ تعالےٰ اس وقت تک اپنے بندے کی مدد کرتا ہے جب تک بندہ اپنے بھائی کی مدد کرتا رہتا ہے۔

البتہ ان سب چیزوں کی شرعی حدود قائم کی گئیں اور بتایا گیا کہ اسلام فطری قوتوں کو پامال کرنے کے لئے نہیں آیا بلکہ ٹھکانے لگانے کے لئے آیا ہے۔ اس لئے وہ ہر قوت سے کام لیگا شہوت ہو کہ غضب سبعیت ہو یا ملکیت سب سے مل کر ہی انسانیت بنتی ہے اسلئے ان کا بقا انسانیت کا بقا ہے جبکہ وہ بتلائی ہوئی حدود اور مقرر کردہ نظام کے اندر اندر رہے۔ پس اس ملی و اجتماعی نظام کے سبب اس دین کی شکل بادشاہت کی سی ہو گئی اور تمام لوازمِ حکومت اسکے اندر شامل ہو گئے جس کی وجہ اس کے سوا دوسری نہ تھی کہ یہ نور آفتابِ نبوت کا نور تھا اور جیسے آفتاب آخری سیارہ ہے جس کے بعد کسی ستارے کی نورانیت نہیں چلتی اس لئے اس کا نور اور دین بھی آخری دین تھا جسے قیامت تک باقی رہنا تھا اور دوامی بقا انفرادیت کے ساتھ نہیں ہو سکتی کیونکہ افراد سب گذشتنی اور فنی ہوتے ہیں اگر یہ دین انفرادی ہوتا تو افراد کے گذرنے سے ختم ہو جاتا۔ جیسا کہ پچھلے ادیان انفرادی تھے جو افراد کے گذرنے سے گزر گئے اور ہر پچھلے دین کے گزر جانے پر نیا دین آیا۔ اس لئے ان میں سے کسی دین کو بھی بقا و دوام حاصل نہ ہوئی۔ لیکن یہ دین جب کہ آخری دین تھا تو اسے اجتماعی رکھا گیا۔ جو افراد سے نہیں، اصول اور جماعت سے برپا ہوا۔ سنت اور جماعت اس میں اصل ہوئے

نہ کہ محض افراد اسلئے افراد گذر گئے، مگر جماعتی نظام اور اصول قائم رہے۔ جو افراد کے ختم ہونے سے ختم نہیں ہو سکتے۔ اس لئے دین باقی رہا اور تا قیام قیامت باقی رہیگا۔ بہرحال اس سے واضح ہے کہ جیسے مادی رات کی خصوصیت انفرادیت اور انقطاعیت ہوتی ہے اور دن کی اجتماعیت اور کاروباری میل جول، ایسے ہی روحانی رات کی خصوصیات بھی دینی انفرادیتیں اور رہبانیتیں تھیں اور جب آفتاب نبوت کے طلوع ہونے پر دن نکل آیا تو وہ انقطاعیتیں خود بخود ختم ہو کر اجتماعی زندگی کا دَور دورہ اچانک سامنے آگیا۔ جو دن کی روشنی ہی میں سامنے آسکتا تھا جس میں دین و ملک نے بیک وقت جمع ہو کر جماعتی تنظیم اور اجتماعی نظام کی صورت نمایاں کر دی اور اسلئے اسلام کا نظام اجتماعی دنیا کے لئے انقلاب آفرین دَور ثابت ہوا۔ جس نے ذہنیتوں میں ایک عظیم انقلاب بپا کر دیا۔

جامع انقلاب

چنانچہ آفتاب سے جہاں روشنی وگرمی کے فیوض عالم کو پہنچتے ہیں اور ایک نہج پر ہزاروں ہزار سال سے یکساں پہونچتے آرہے ہیں، جن میں کوئی تغیر نہیں آتا۔ وہیں آفتاب میں تغیر آفرینی اور انقلاب انگیزی کی شان بھی پائی جاتی ہے۔ جس سے وہ اشیاء کی ماہیتیں اور حقیقتیں تک بدل ڈالتا ہے گویا سارے سیاروں میں وہ ایک انقلابی سیارہ ہے جو ماہیتوں کو تبدیل کر دیتا ہے اور دنیا پر اس کے اثرات انقلابی رنگ میں پڑتے ہیں کہ مثلاً ستارے اگر جڑی بوٹیوں میں رس اور پھل میں گودا پیدا کرتے ہیں تو یہ ایک مثبت اثر ہے۔ جو خالی ظرف میں بھر جاتا ہے کوئی چیز بدلتی نہیں لیکن سورج انہیں پگھلا کر یا خشک کر کے معدوم بھی کر دیتا ہے۔ جس سے شے شے ہی نہیں رہتی۔ چاند بلاشبہ سمندروں کو تہ و بالا ضرور کر دیتا ہے۔ مگر اس سے سمندر کی صرف ہیئت بدل جاتی ہے۔ ماہیت نہیں بدلتی لیکن سورج اس کی کیفیات اور خواص تک کو بدل ڈالتا ہے اس کڑوے سمندر کو گرما کر مانسون بنا دیتا ہے۔ جس سے کڑوا پانی میٹھا ہو جاتا ہے۔ سمندر سفلی ہے۔ مگر اُسے آفتاب گرما کر اور اس سے مانسون اٹھا کر اس کے ایک حصہ کو علوی کر دیتا ہے کہ وہ آسمانوں کی طرف چڑھ جائے اور عالم میں شیریں پانی بن کر برس پڑے۔ سمندر سیال ہے۔ مگر سورج اُسے مانسون بنا کر بادلوں

کی شکل دے دیتا ہے اور دن کو رات، یہی سورج ہواؤں پر اثر ڈالتا ہے تو نسیم کو صرصر اور ہوائے سرد کو ہوائے گرم بنا دیتا ہے۔ غرض تر کو خشک، خشک کو تر، خام کو پختہ اور پختہ کو خام، بہاؤ کو ٹھیراؤ اور ٹھیراؤ کو بہاؤ۔ سکون کو حرکت اور حرکت کو سکون۔ مُردنی کو زندگی اور زندگی کو مردنی سے بدل دینا اور شے کے اندرون کو منقلب کر دینا بلاشبہ انقلاب ماہیت ہے جو سورج ہی کا کام ہے جس میں کوئی ستارہ اس کا ہم پلہ نہیں۔

ٹھیک اسی طرح نجوم ہدایت انبیاء علیہم السلام نے اقوام عالم کی اصلاح فرمائی اور اُن کے پاکیزہ اثرات سے دنیا نے اللہ کا راستہ دیکھا لیکن صرف اس انداز سے کہ ان کی جبلتیں اپنی جگہ باقی رہیں انہیں کچھ مغلوب یا مستور کر کے دین کی رسوم انہیں اڑھا دی گئیں یعنی شاق شاق ریاضتوں ترک دنیا، ترک لذائذ اور ترک آسائش و راحت سے اس جبلت کو دبائے رکھا تو وہ کسی حد تک دین پر لگے رہے۔ اگر وہ اس دین پر رہتے ہوئے ذرا بھی اپنی رہبانیت کو ترک کر دیتے تو اسی وقت اُن سے دینی جذبات رخصت ہو جاتے۔ بالکل اس طرح جیسے دشمن کو کسی مکان میں بند کر کے اس سے بچاؤ اختیار کر لیا جائے اور نفس سے اس فرصت میں کچھ روحانی کام لے لیا جائے۔ لیکن اس کا ردِ عمل قدرتی طور پر یہی ہو سکتا ہے کہ اگر ذرا بھی قید خانہ کا قفل کھل جائے اور وہ جبلت نفسانی اور طبعی مزاج ابھر کر روحانی مزاج کو پھر درہم برہم کر ڈالے۔ لیکن آفتاب نبوت نے تکمیل انسانیت کے لئے نفسانیت کو بند یا محبوس کرنے کے بجائے اُسے بدستور قوی رکھا اور بند بھی نہیں کیا مگر اسے اپنا لیا اور اس سے روحانیت کی خدمت لی اور ان طبعی تقاضوں کو پامال کرنے کے بجائے انہیں شرعی بنا دیا اور ٹھکانے لگا دیا کہ وہ خود روحانیت کے خادم بن گئے۔ اب وہی شہوت، بجائے اس کے کہ خصی ہو کر اُسے پامال کیا جاتا، عقل و شرع کے سامنے اُسے جھکا دیا گیا اور اس کے تمام طبعی افعال کو صحت نیت اور ثواب طریق سے شرعی بنا دیا گیا یعنی وسیلہ دین بنا کر انہیں طبعی سے شرعی کر دیا۔ اس لئے ایک مومن کا سونا جاگنا، چلنا پھرنا، کھانا پینا، دوستی و دشمنی، معیشت و معاشرت، مباشرت و مجامعت جبکہ بقصد دین اور بطرز سنت نبوی ہو دین ہو جاتا ہے اور معاشرت کے یہ تمام گوشے دین کے شعبے بن جاتے ہیں۔ گویا اس تشریعی انقلاب سے عادت عبادت اور دنیا دین بن جاتی ہے پس آفتاب نبوت کی پیش کردہ

روشنی اور عملی پروگرام نے ان سب طبعی تقاضوں کی ماہیتوں کو بدل کر انہیں شرعی و دینی بنا دیا اور ایک عظیم دینی انقلاب بپا کر دیا۔ اس لئے ایک مومن کو آج شہوت و غضب، حرص و ہوس، بخل و طمع، حقد و حسد، محبت عداوت وغیرہا کو مٹانے یا بند کرنے کی ضرورت نہیں بلکہ بطرز مذکور ٹھکانے لگا دینے اور اپنا لینے کی ضرورت ہے تو وہی قوائے طبعیہ جو فساد کی طرف لے جاتے ہیں صلاح و رشد کی راہ چل پڑیں گے۔ اس لئے کہا جا سکتا ہے۔ آج کے دور میں رہبانیت بدن سے ہٹ کر قلب میں آگئی یعنی نیت و خیال اور قوت فکریہ کو اسلام کا رہبان بنا دیا کہ وہ غیر اللہ کی طرف متوجہ ہونے کی بجائے صرف اللہ کی طرف جھک جائے اور جب ان قویٰ ہی کا رُخ اللہ کی طرف ہوگا تو ان سے صادر شدہ افعال بھی قدرتی طور پر اللہ ہی کے لئے ہو جائیں گے۔ خواہ بظاہر دنیوی نظر آئیں۔ پس اور مسلکوں کی رُو سے انسان معطل ہو تو خدا تک پہنچے اور اسلام کی رو سے انسان انسان رہ کر خدا تک پہنچے گا۔ یہی وجہ ہے کہ ایک فعل ایک جہت سے حرام ہوتا ہے اور اس پروگرام کے تحت دوسری جہت میں حلال بلکہ عین طاعت و عبادت بن جاتا ہے۔ اکڑ کر چلنا حرام تھا۔ جبکہ مقصد رضا نفس تھا۔ ولا تمش فی الارض مرحاً ۝ (زمین پر اکڑ کر مت چلو) لیکن وہی فعل طواف بیت اللہ میں حلال بن کر عبادت ہوگیا۔ جبکہ مقصد اعلاء کلمۃ اللہ اور رضاء حق ہوگیا۔ وہی حرص حرام تھی جبکہ مفادِ دنیوی کے لئے تھی اور وہی حرص حلال ہو کر موجب ثواب بن گئی جبکہ مفاد آخرت کے لئے استعمال میں آنے لگی۔ وہی لوٹ مار حرام ہے جبکہ نفس کی خاطر اور بمقابلۂ مقبولان الٰہی ہو اور وہی لوٹ مار حلال ہے۔ جبکہ جہاد میں دشمنان خدا کے مقابلہ میں ہو۔ وہی جھوٹ حرام ہے جبکہ فتنہ انگیزی کے لئے ہو اور وہی جھوٹ حلال بلکہ باعث اجر ہے جبکہ دفع فتنہ اور اصلاح ذات البین کے لئے ہو۔ پس آفتاب نبوت نے ترفع، حرص غارت گری، لوٹ مار وغیرہا جیسے طبعی جذبات کو بھی دل کے کسی کونہ میں بند رکھ کر تالا نہیں لگایا۔ کیونکہ تالا کھلنے پر اندیشہ تھا کہ وہ باہر نکلتے اور مزید قوت کے ساتھ نفس کو از سر نو فاسد کر ڈالتے بلکہ اُن کے رخ کو بدل کر بجائے نفس کی خدمت گذاری کے رب العزت کی خدمت گذاری پر لگا دیا تاکہ وہ بندش اور آزادی میں ہمہ وقت عظمت حق کی راہ پر چلتے رہیں اور اپنی اپنی جگہ قائم رہ کر انسانیت کی صحیح خدمت انجام دیں پس نبوت کے اور ستاروں نے ذہنوں میں جذبات اور انسان کے نفس کو

قید و بند سے جکڑ کر نفس کو ان سے الگ کیا تاکہ نفس ان کے پھندے میں نہ پھنس سکے. اگرچہ وہ ان کے متعلقہ کاموں سے معطل بھی ہو جائے اور آفتاب نبوت نے ان قویٰ کو آزادی دے کر خود ان سے کام لیا اور اس طرح ان سے متعلقہ تمام کاموں کو عبادت بنا دیا جس سے ذہنوں اور ذہنی قویٰ میں انقلاب عظیم بپا کر دیا. تر کو خشک اور سفل کو علوی بنا دیا. طبیعت کو جو سفلی تھی، اسے علوی روحانیت میں تبدیل کر دیا. دنیا کو جو ناپاک تھی، پاک دین بنا دیا. ناسوتی زندگی کو جو خسارہ ہی خسارہ تھی، ملکوتی اور لاہوتی زندگی بنا دیا. جو کمال محض ہے. غرض بشر کو بشر رکھ کر ملکوتی صفات و افعال سے آراستہ کیا. بشر کو بشریت سے نکال کر ملک نہیں بنایا کہ وہ بشریت کی ترقی ہوتی بلکہ بشریت کا انعدام ہوتا جو کمال نہیں. صرف ایک جزوی خوبی یا ایک نوع کی فنی مہارت ہے.

خلاصہ یہ ہے کہ اسلام کنارہ کشی، گوشہ گیری اور خلوتی بن جانے کا نام نہیں، بلکہ جلوتوں کے ہجوم میں رہ کر ہر قوت کو سلائے ہوئے مصرف میں صرف کرنے اور اس کے واجبی حقوق ادا کرنے کا نام ہے اور یہی وہ آفتاب نبوت کا انقلابی کارنامہ ہے. جو سابقین سے انجام نہیں پایا اور اسی کا نام اکمال دین ہے. جس کے لئے ختم نبوت کا انتخاب کیا گیا تھا. پس سابق نجوم ہدایت نے ان طبعی جذبات کو پامال کر کے یا انہیں محبوس کر کے شرعی راہوں پر لگایا اور آفتاب نبوت نے انہیں باقی رکھ کر انہی سے انسانی دین کو ترقی کرائی اور عین دنیا کو دین بنا دیا. اسلئے آج حتی ترک دنیا کی ضرورت نہ رہی، بلکہ دنیا کو خادم دین کی حیثیت سے باقی رکھ کر اسی کو ترقیات دینی کا راستہ بنا دینے کی ضرورت ہے. قدیم مذاہب شہری زندگی چھڑا کر خدا رسی تک لاتے تھے اور اسلام شہر بسا کر خدا تک پہنچاتا ہے اور نجوم ہدایت نے وسائل تمدن، وسائل معاش، ازدواج و اولاد اور گھر بار اور تمام وجوہ معاشرت چھڑا کر یا جنگلوں میں بٹھا کر جمال خداوندی دکھلایا اور آفتاب نبوت نے اس تمدن، شہری آبادکاری اور تزوّج و توالد ہی کو آئینہ جمال حق بنا دیا جس کو سامنے رکھ کر ہی حق نظر آئے.

اسی طرح اور نجوم ہدایت کی روشنی ہر لڑائی بھڑائی ملک گیری اور چڑھائی سے الگ تھلگ کر کے خدا کا چہرہ دکھلاتی ہے اور آفتاب نبوت اعلاء کلمۃ اللہ کی جنگ ہی کو افضل ترین عبادت بنا کر اس کے ذریعہ مشاہدۂ حق کراتا ہے. غرض وہاں ترک دنیا حتی ہے اور یہاں ترک دنیا عقلی

اور معنوی ہے۔ وہاں نفس امارہ کی ہمتیں برسرِ کار نہیں آسکتیں جبکہ دشمن کے سامنے جانیکا اصول سامنے رکھا گیا ہے اور یہاں نفس کی اندرونی ہمت و قوت اپنا پورا کام کرتی ہے جبکہ دشمن کے سامنے ڈٹ جانے اور اسے رام کر لینے کی پالیسی سامنے رکھ دی گئی ہے۔ غرض آفتاب نبوت نے رہبانیت کو عوامیت سے خلوت کو جلوت سے اور انقطاعیت کو اجتماعیت سے تبدیل کر کے پوری دنیا کا دھارا بدل دیا ہے۔ پس آج کی دنیا میں جبکہ ساری دنیا کی قومیں ایک پلیٹ فارم پر آگئی ہیں اور اجتماعیت و اشتراکیت کے جذبات برسرِ کار آچکے ہیں، آیا وہ ترک لذات گوشہ گیری اور رہبانیت کا اصول جذبات کو اپیل کر سکتا ہے یا مادیات کو ساتھ لیکر دینی راہیں قطع کرنے کا اصول دلوں میں جاگزیں ہو سکتا ہے۔ ظاہر ہے کہ دلوں کی آواز دوسری ہی ہو سکتی ہے۔ اس لئے کہ اجتماعیت کبریٰ کا اصول ہی وہ فطری راہ ہوگا جس سے کوئی فردِ بشر انکار کی جرأت نہیں کر سکتا۔ اسی جامعیت اسلام کی طرف انبیائے سابقین نے بھی واضح اشارے فرمائے ہیں، چنانچہ موسیٰ علیہ السلام کا ارشاد فیض بنیاد اس بارہ میں صاف ہے۔

کیا قویٰ انسانی کو پامال کر دیا جانا امر معقول ہوگا کہ نہ انسان میں شہوت باقی رہے۔ نہ غضب نہ حرص رہے نہ جذبات وحیات بالفاظ دیگر نہ انسان رہے نہ اس کی انسانیت دنیا میں فعل وعمل کی گرم بازاری رہے۔ اگر قویٰ ہی نہ رہیں تو عمل کیسے سرزد ہو اور عمل نہ رہے تو قوائے انفس و آفاق کے خواص و آثار کیسے نمایاں ہوں یا پھر ان قویٰ کو قائم رکھ کر انہیں اعتدال کے ساتھ ان کے صحیح مصرف میں صرف کیا جانا اور انسان کو مع اس کی انسانیت کے باقی رکھنا امر معقول ہوگا جس سے دنیا میں تخلیق الٰہی کے نئے نئے عجائبات نمایاں ہوں اور دنیا کی انفسی اور آفاقی مکنون طاقتیں کھل کھل کر سامنے آتی رہیں جس سے انسان کی خلافتِ کبریٰ کا ظہور ہو۔ ظاہر ہے کہ عقلمند دنیا اس دوسری ہی صورت کو پسند کر سکتی ہے۔ کیونکہ قویٰ بشری کے پامال ہو جانے کے یہ معنی ہیں کہ دنیا میں بشر ہی باقی نہ رہے اور جب نوع بشری ہی باقی نہ رہے گی تو یہ مذہب آخر خطاب کسے کرے گا لیکن اگر انسان کا بقا ضروری ہے تاکہ مذہب کا خطاب صحیح ہو اور انسان کی بقا کے معنی اس کی طبعی اور خلقی قوتوں کا بقا ہے تو انسان کی انسانیت کے معنی یہی ہوں گے کہ اسکی قوتوں کا کسی صحیح ڈھنگ سے ظہور ہو تاکہ کامل انسانیت کا نقشہ کامل روحانیت پر ٹھیک

مطابق آ جائے اور ان قوتوں کو ٹھکانے لگا کر ایک کامل الخلقت انسان کو اس کی کامل مادی قوتوں کے ہجوم میں کامل الروح انسان بنا دیا جائے۔ اس لئے یقیناً آج کی دنیا اسی آخری اصول کی تصدیق کرے گی گو پہلے اصول کو جھٹلائے بھی نہیں، جب کہ وہ بطور معالجہ اپنے وقت پر کسی دَور میں کار آمد بھی رہا ہے۔ لیکن پھر بھی اس اصول کو محدود سمجھنے پر بھی مجبور ہو گی۔ جس کے لئے بقار دوام نہیں ہو سکتی۔

اس انقلاب کا ثبوت توراۃ و انجیل سے

توراۃ کی کتاب استثنا کے باب ۳۳ میں ہے کہ:۔

”خدا سینا سے آیا، ساعیر سے طلوع ہوا، اور فاران سے چمکا۔ دس ہزار قدوسیوں کے ساتھ آیا اور اس کے داہنے ہاتھ میں ایک آتشیں شریعت ان کے لئے تھی۔“

ظاہر ہے کہ خدا کے سینا سے آنے کے معنی نبوت موسوی اور شریعت توراۃ کا ظہور ہے، ساعیر سے طلوع ہونے کے معنی نبوت عیسوی اور شریعت انجیل کا ظہور ہے اور فاران سے چمکنے کے معنی نبوتِ محمدی اور شریعت قرآن کا ظہور ہے۔ جس کے جلوے بالآخر سارے عالم پر پڑے۔ دس ہزار قدوسیوں کے ساتھ جلوہ گر ہونا فتح مکہ کی طرف اشارہ ہے۔ جس میں حضرت خاتم الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ دس ہزار مقدس صحابہ کا لشکر تھا، چنانچہ سیرت ابن ہشام تاریخ طبری البدایہ والنہایہ، تاریخ کامل ابن اثیر، زاد المعاد، تاریخ ابن خلدون وغیرہ کا فاتحین مکہ کے اس عدد پر اتفاق ہے۔ آتشیں شریعت کے معنی دین کے ساتھ سیاسی قوت اور اجتماعیت کے جمع ہونے کے ہیں، چنانچہ اس شریعت میں حدود و قصاص تعزیرات و کفارات و جہاد و قتال اور خلافت و امارت جزوِ دین کی حیثیت سے آئی اور الملک والدین توامان (ملک اور یہ دین دو جوڑواں بچے ہیں، جنہیں ایک دوسرے سے جدا نہیں کیا جا سکتا) کا ظہور ہوا۔

یہ جامعیت یقیناً اُن ادیان میں نہ تھی جو سینا اور ساعیر سے چمکے تھے۔

چنانچہ دین مسیح کے بارے میں تو خود مسیح ہی نے اعلان فرما دیا تھا کہ میری بادشاہت دنیا کی نہیں۔ اگر میری بادشاہت ہوتی تو میرے خادم لڑتے تاکہ میں یہودیوں کے حوالہ نہ کیا جاتا۔ ....

(انجیل یوحنا باب ۱۸/۳۶)

جس سے دین کے بارہ میں جہاد و ملک کی صاف نفی ہے۔

اسی طرح حدود و تعزیرات کے بارہ میں حضرت مسیحؑ نے صاف اعلان فرمایا۔

"تم سن چکے ہو کہ کہا گیا تھا کہ آنکھ کے بدلہ میں آنکھ اور دانت کے بدلہ میں دانت، لیکن میں تم سے یہ کہتا ہوں کہ شریر کا مقابلہ نہ کرنا بلکہ جو کوئی تیرے داہنے گال پر طمانچہ مارے تو دوسرا گال بھی اس کی طرف پھیر دے۔"

(انجیل متی باب ۵/۳۸)

جس سے حدود و تعزیرات کی صاف نفی واضح ہے۔

اسی طرح معاملات اور ثالثیوں اور عدالتی امور کے بارے میں ارشاد مسیحی ہے

"پھر بھیڑ میں سے ایک نے اس سے کہا۔ اے استاد میرے بھائی سے کہہ کہ میراث کا حصہ مجھے دے ... اس نے (مسیح نے) اس سے کہا میاں کس نے مجھے تمہارا منصف یا بانٹنے والا مقرر کیا۔

(انجیل لوقا باب ۱۲)

جس سے ثالثی عدالتی فیصلہ اور حکم ہونے کے منصوبوں کی نفی صاف مذکور ہے۔

ادھر شریعت موسوی میں سیاست تو تھی مگر دین کے ساتھ مخلوط ہو کر نہیں بلکہ اسے دنیوی شے قرار دے کر ملوکیت کا دائرہ نبوت کے دائرہ سے الگ رکھا گیا تھا۔ انبیاء کا کام ہدایت دینا اور ملوک کا کام اسے جاری و نافذ کرنا تھا۔ خود سیاست میں دیانت یا دیانت میں سیاست گھلی ہوئی تھی کہ دونوں کا ملکر ایک رنگ ہوتا اور مجموعہ کو دین پکارا جاتا۔ اسی کو انجیل نے باقی رکھا کہ پوپ کا حصہ

پورکیو دواور بادشاہ کاحصہ بادشاہ کوالیے یہ شرائع فقط اسرائیلی مزاج کے مطابق تھیں جنہیں ایک ہی رہبانیت پسند طبقہ قبول کرسکتا تھا۔ ترقی پسند قومیں تنظیم ملت اور عالمیت مزاج اقوام کے درد کا ان میں کوئی سامان نہ تھا۔

اس انقلاب عمومی کا ثبوت قرآن سے

لیکن اسلام نے شریعت کو جامعیت کا رنگ دیکر ایک ہمہ گیر روشنی کی بنیاد ڈالی۔ جس میں دین وملک اور دیانت وسیاست مخلوط کر کے پیش کی گئی اور ایک بین الاقوامی دین پیش کیا جس کی روشنی بین الاقوامی اور ہمہ گیر تھی۔ اسلئے یہ دین بھی ہمہ گیر ہوا، اور اس کی سیاست وخلافت بھی ہمہ گیر ہوئی۔ دین کی ہمہ گیری کے بارہ میں ارشاد حق ہے کہ

ھوالذی ارسل رسولہٗ	وہ (اللہ رب العزت) وہ ذات ہے جس نے
بالھدیٰ ودین الحق لیظھرہٗ	اپنے رسول کو ہدایت و دین حق دے کر بھیجا تاکہ
علی الدین کلہٖ	دنیا کے تمام دینوں پر اُسے غالب کرے

اور دین کی سیاست وخلافت کی ہمہ گیری کے بارہ میں ارشاد نبوی ہے کہ

ان اللہ زوی لی الارض مشارقھا	اللہ نے زمین کی مشرق و مغرب میرے سامنے
ومغاربھا وسیبلغ ملک امتی	کردی (جسے میں نے دیکھا) اور عنقریب میری
مازوی لی منھا۔	امت کا ملک وہاں تک پہنچے گا جہاں تک میری
	نگاہوں نے دیکھا (یعنی مشرق سے مغرب تک)

چنانچہ اس روایت ومشاہدہ کی تفصیل اس حدیث میں فرمادی گئی کہ غزوۂ خندق میں جب ایک بڑی چٹان خندق کھودتے ہوئے نکلی اور حضرت سلمان فارسی اور دوسرے صحابہ اُسکو توڑنے سے عاجز آگئے تو حضور کو اطلاع دی تو آپ نے تشریف لاکر اس پر کدال سے ایک ایسی شدید ضرب لگائی کہ اس کا ایک بڑا حصہ ٹوٹ گیا پھر دوسری ضرب لگائی تو دوسرا حصہ ٹوٹا اور تیسری ضرب میں اُسے چکنا چور کردیا۔ ان تینوں ضربوں کی چوٹ میں ہر دفعہ ایک عظیم نور اور چاندنا ہوا ہوگیا تو آپ نے فرمایا کہ پہلی ضرب کی روشنی میں مجھے حیرہ کے محلات اور مدائن کسرے (ایران) دکھلائے اور حضرت

جبرائیل نے مجھ سے فرمایا کہ آپ کی اُمت ان پر غالب آئے گی۔ دوسری ضرب کی روشنی میں مجھے روم کے سرخ محلات نظر پڑے اور حضرت جبرائیل نے فرمایا کہ آپ کی امت ان پر غالب آئے گی۔ اور تیسری ضرب کی روشنی میں مجھے صنعاء (اور یمن کا علاقہ) دکھلایا گیا اور حضرت جبرائیل نے فرمایا کہ آپ کی اُمت اس پر غالب آئے گی۔

اس دَور میں دنیا دو طاقتوں میں بٹی ہوئی تھی، روم اور فارس، باقی ساری سلطنتیں ان ہی دو کے زیر اثر تھیں اسلام نے انہیں مغلوب کر کے اسوقت کی ساری دنیا پر اپنے مقتدرانہ اثرات قائم کئے اور نبوت کی پیشگوئی کا ایک بڑا حصہ پورا ہو کر دنیا کے سامنے آگیا اور آج کی دنیا تین بلاکوں میں بٹی ہوئی ہے امریکہ، روس اور عرب ممالک اور موجودہ دنیا کا نقشہ صاف بتلا رہا ہے کہ آج کے دو عظیم بلاکوں امریکہ اور روس کے لئے یہ ممالک بانگ بنے ہوئے ہیں۔ ایسلئے یہ دونوں بلاک عرب طاقتوں کی چاپلوسی یا ان کے نرے کے درپے ہیں۔ مگر یہ تیسرا بلاک طاقت پکڑتا جارہا ہے اور بالآخر ان دو بلاکوں پر غالب ہو کر پوری دنیا پر چھا جائیگا چنانچہ ظہور مہدی کی حدیثوں میں یہی خبر دی گئی ہے کہ مہدی کے ہاتھ پر مشرق و مغرب کی طاقتیں ٹوٹیں گی اور ان کی حکومت قائم ہوگی اور ظاہر ہے کہ مہدی کا ظہور مکہ سے ہوگا اور شام کو وہ اپنا مستقر بنا کر وہیں طاقت جمع کریں گے جن سے روم و فارس نبرد آزما ہوں گے اور شکست کھا کر اسلام کی ایک ہی قومیت میں مدغم ہوجائیں گے۔ فیکون الدین کلہ للہ اور لیظھرہٗ علی الدین کلہٖ ۔ کا ظہور ہو جائے گا۔ جس کی تفصیلات کا یہ موقعہ نہیں اور ہم نے کسی دوسری جگہ اس کی تفصیلات واضح بھی کر دی ہیں۔

غرض آسمان نبوت کے تمام نجوم ہدایت مل کر رات کو دن نہیں بنا سکے۔ یہ کام صرف آفتاب نبوت ہی کا تھا کہ اس نے طلوع ہوتے ہی پوری دنیا کو اپنی روشنی سے جگمگا دیا اور اس کی عالمگیر روشنی عالم کے کونہ کونہ میں پھیلی اور پھیل کر رہے گی کیونکہ اس میں دیانت وسیاست ملک اور دین شوکت اور فردی تکمیل فرد و قوم تنظیم ملت اور نظام عالم طبیعت وعقل سب کچھ وحی کے نیچے جمع کر کے مجموعہ کے مزاج سے دین کی بنیاد استوار کی گئی ہے۔ اس لئے وہ عالم کے ہر طبقہ اور ہر مزاج کے لئے قابل قبول بن گیا جو ہمہ گیری کی ابتدائی شان ہے

مومن کا ایمانی وجود اور اسکی ذات

اسکا راز یہ ہے کہ جس طرح آفتاب کون و مکاں کو روشن اور گرم کر دیتا ہے مگر حقیقتاً روشن اور گرم صرف آفتاب ہی ہوتا ہے اس کے سوا دوسری اشیاء عارضی طور پر روشن اور گرم ہو جاتی ہیں اور نظریوں آنے لگتا ہے کہ یہ اشیاء روشن ہیں مگر بنگاہ حقیقت روشنی اور گرمی ایک آفتاب ہی میں ہوتی ہے جب وہ کسی چیز کو لگ جاتی ہے تو لگے رہنے کی حد تک وہ چیز بھی روشن اور گرم محسوس ہونے لگتی ہے۔ روز روشن میں در و دیوار کو ہم روشن اور گرم کہتے ہیں لیکن حقیقتاً دیوار روشن نہیں ہوتی۔ دھوپ روشن ہوتی ہے مگر وہ دیوار سے لگی ہوئی ہے۔ اسلئے دیوار بھی روشن نظر آرہی ہے۔ اگر مغرب کے وقت آفتاب اپنی دھوپ کو سمیٹ کر لیجائے تو یہی دیوار جب بھی ہوگی مگر تاریک رہ جائے گی۔ اس سے واضح ہے کہ روشنی دیوار میں روشنی خود دیوار کی دھوپ کی ہے اور روشن ہی ہے۔ فی الحقیقت دھوپ نہ کہ دیوار اس کا کام اتنا ہی ہے کہ دھوپ سے لگی رہے اور کنکشن صحیح رکھے۔

ٹھیک اسی طرح آفتاب نبوت کے طلوع ہو جانے کے بعد ایمان کی روشنی اور گرمی در حقیقت صرف خاتم الانبیاءؐ کی ہے۔ وہی اصل مومن ہیں۔ وہی اصل میں منور ہیں۔ ہم اور تم مومن کہلاتے ہیں اور صرف اس وجہ سے کہ اس آفتاب ایمان کی ایمانی دھوپ ہم پر پڑی ہوئی ہے تو ہم مومن کہلانے لگے۔ ورنہ حقیقتاً مومن صرف نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم ہیں۔ البتہ جب تک ہمارا کنکشن آپ سے صحیح ہے۔ اتباع و پیروی موجود ہے۔ ذہنی بھی اور خارجی بھی۔ ہم بھی مومن کہلائے جائیں گے۔ ورنہ یہ ایمان جو ہم میں نظر آتا ہے۔ محض پرتو ہے ایمان محمدی کا مستقل ایمان نہیں اگر عیاذاً باللہ دامن اتباع چھوٹ جائے اور آفتاب نبوت ہم سے کنارہ کر لے تو پھر بھی ہماری ذات تو باقی رہے گی مگر ایمان باقی نہ رہے گا یعنی آدمی کہلائیں گے۔ مومن نہیں کہلائیں گے۔ پس ہمارے مومن ہونے کے معنی یہ نکلے کہ ہم آفتاب نبوت کی ایمانی دھوپ اپنے اوپر اور اپنے اندر لئے ہوئے ہیں۔

اس کے معنی یہ ہوئے کہ مومن ہونے کی حیثیت سے ہم خود اپنے سے اتنے قریب

نہیں جتنے حضور اکرمؐ ہم سے قریب ہیں، کیونکہ جب ہم مومن ہونے کی حیثیت سے اپنے کو پہچنوائیں گے تو اس کے سوا کیا کہیں گے کہ میں نبی کا غلام اور امتی ہوں یعنی شخصیت مقدسہ کی طرف اپنی نسبت کر دیں گے یہ نہیں کہینگے کہ میں موحد ہوں میں آخرت کا ماننے والا ہوں میں خدا کو ماننے والا ہوں، کیونکہ یہ سب دعوی غیر مسلم بھی کر سکتے ہیں، ہاں غیر مسلم یہ دعوی نہیں کر سکتے کہ ہم مطیعان محمدی ہیں، یہ صرف مسلم ہی کر سکتا ہے۔ جس سے واضح ہے کہ مسلم و غیر مسلم میں امتیاز اتباع محمدی و عدم اتباع محمدی سے ہے اور جبکہ ہماری حقیقت ہی یہ نکلی کہ ہم محمدی مطیع ہیں تو ہماری حقیقت میں پہلے حضور کا ذکر آیا ہے۔ پھر ہمارے نفس کا ذکر آیا ہے تو حضور ہم سے اتنے قریب نکلے کہ ہم خود بھی اپنے سے اتنے قریب نہیں۔ جیسا کہ دھوپ کے ٹکڑوں سے اگر کوئی پوچھے کہ تو کون ہے۔ تو وہ اس کے سوا کیا جواب دے سکتی ہے کہ آفتاب کا ایک پرتو کیونکہ اس سے الگ ہٹ کر دھوپ کا کوئی وجود ہی نہیں تو آفتاب دھوپ کے نفس سے اتنا قریب نکلا کہ خود دھوپ بھی اپنے نفس سے اتنی قریب نہیں ہے پس اسی طرح مومن سے اگر پوچھا جائے کہ تو کون ہے تو وہ اس کے سوا کچھ جواب نہ دے سکے گا کہ میں غلام محمدی ہوں گویا اس کے ایمانی وجود کے معنی ہی غلامی محمدی کے ہیں، پس مومن اپنے وجود میں خود اپنے سے اتنا نزدیک نہیں کہ اس سے حضور اکرم نزدیک ہیں، اسی حقیقت کی طرف قرآن حکیم نے اشارہ فرمایا۔

النبی اولی بالمؤمنین	نبی مومنین کے ساتھ خود ان کے نفس سے
من انفسھم وازواجہ	بھی زیادہ تعلق رکھتے ہیں اور آپ کی بیویاں اُن
امھاتھم۔	کی مائیں ہیں۔

یہاں سے یہ شبہ بھی رفع ہو جاتا ہے۔ جو اس زمانہ کے بعض لوگ کیا کرتے ہیں کہ مسلم و غیر مسلم بحیثیت دین کے سب ایک ہیں۔ سب کا ایک ہی مقصد ایک ہی منتہا اور ایک ہی منزل مقصود ہے۔ راستوں کا فرق ہے اس فرق سے اقوام میں کوئی فرق نہیں پڑتا۔ سو واضح ہو گیا کہ بلاشبہ منزل مقصود اللہ تک پہنچنا ہے۔ لیکن یہ پہنچنا راستہ ہی کی استقامت سے ممکن ہے۔ راستہ اگر غلط ہے تو وصول بمنزل ناممکن ہے۔ پس مذاہب کا حق و باطل ابتداءً مقصد کے اعتبار سے نہیں دیکھا جائیگا۔ راستہ کے لحاظ سے دیکھا جائے گا۔ جس کا معیار اتباع نبوت ہو گا۔ کیونکہ راستہ نبی کی خبر کے بغیر متعین ہونا ناممکن ہے۔

خدا کا راستہ خدا ہی بتلا سکتا ہے اور خدا کا بتلانا پیغمبروں کے توسط سے ہے۔ ہر ایک انسان سے براہ راست خدا کلام نہیں فرماتا اسلئے راستہ کے تعین میں پیغمبر ہی کا اتباع ناگزیر ہوگا اور راستہ متعین ہوئے بغیر منزلِ مقصود تک پہونچنا ناممکن ہوگا۔ اسلئے وصول بہ منزل کیلئے پیروی نبوت لازمی ہو جاتی ہے اور جب مقصود اصلی منزل کے صحیح راستہ سے منزل تک پہونچنا ہے۔ منزل کا دعویٰ کرنا یا اس کا اعلان کرنا نہیں۔ اسلئے وہ اقوام جو مستند طریقہ پر نبوت کی پیروی نہیں کرتیں منزلِ مقصود کا محض دعویٰ کرتی ہیں نہ اس کا راستہ جانتی ہیں اور نہ منزل تک پہنچنے کا جذبہ رکھتی ہیں۔

آفتاب نبوت کی پیروی میں نجات کا انحصار

پس جیسے طلوع آفتاب کے بعد نور کا ملنا بجز آفتاب کے کسی ستارہ سے ممکن نہیں اور جو بھی طلوع ہونے کے بعد کسی ستارہ کے نور کا سہارا ڈھونڈے گا۔ وہ نور سے محروم رہے گا۔ ایسے ہی ظہور محمدی کے بعد جو بھی نجات کے سلسلہ میں کسی نجم نبوت کا سہارا ڈھونڈے گا، وہ یقیناً نجات سے محروم رہے گا۔ نجات نام دعوائے مقصد کا نہیں وصول مقصد کا ہے اور بغیر نبیٔ وقت کی پیروی اور اتباع سبیل کے ناممکن ہے۔ اسی لئے آج جب کہ آفتاب نبوت طلوع ہو چکا ہے۔ دنیا کی نجات آخرت اور فلاح دنیا صرف اسی آفتاب نبوت کی روشنی سے مستفید ہونے اور اسی کے نیچے آ کر کھڑا ہونے سے ممکن ہے۔ دن میں کسی اور ستارے کے نور کا سہارا ڈھونڈھنا نور سے محروم رہ جانا ہے۔ واللہ یقول الحق ویھدی السبیل ؓ

آفتاب نبوت اور خلافت

مگر ظاہر ہے کہ جب ظہور ختم نبوت بمنزلہ دن کے ہے کیونکہ وہی آفتاب نبوت کے طلوع کا زمانہ ہے تو اس سے خود بخود مفہوم ہوتا ہے کہ جیسے ہزاروں برس کی رات کے بعد آفتاب نبوت طلوع ہوا جس سے دن نکلا تو اس کا قدرتی تقاضا ہے کہ آفتاب نبوت کے غروب کے بعد دن چھپے اور رات آجائے۔ پس جیسے آفتاب نبوت کا طلوع ولادت شریفہ تھی ایسے ہی آفتاب نبوت کا غروب وفات شریف ہے جس سے آپ نے اس جہان سے پردہ فرمالیا ہے اور یہ سورج عالم غیب میں جا کر چھپ

گیا۔

سوال ہوتا ہے کہ آپ کے پردہ کر لینے سے کیا اسلام کی روشنی منقطع ہوگئی یا اس رات میں بھی روشنی کی کوئی صورت باقی رہی جس سے دنیا کا یہ اندھیرا اندھیرا نہ رہا، جواب یہ ہے کہ جس طرح مادی آفتاب غروب کے بعد بھی دنیا کو خالص اندھیرے میں نہیں چھوڑتا بلکہ ستارے اسکے خلفاء ہیں جو اسی سے نور لیتے ہیں اور دنیا کو دیتے ہیں ان میں کوئی چاند ہے جو آفتاب سے اشبہ اور اس کی صفات سے بہت قریب ہے۔ گویا اس کا خلیفۂ اعظم ہے جس کا نور آفتاب ہی کی طرح پھیلتا اور نورانی سایہ (چاندنی) لیکر آتا ہے جو دھوپ کے مشابہ ہے اور دوسرے کسی ستارے میں نہیں پائی جاتی جس کی وجہ سے چاندنی رات میں صرف چاند ہی کافی ہو جاتا ہے۔ دوسرے ستارے اس کے سامنے ماند رہتے ہیں البتہ اسکے غروب کے بعد چھوٹے بڑے مختلف ستارے مل کر کام کرتے ہیں، جن کا مجموعی نور رہنما ہوتا ہے اور رات میں بھی کام بند نہیں ہوتا۔ بالخصوص جبکہ مشینی دَور ہو تو مشینیں چلتی رہتی ہیں اور دن کا سا کام ہوتا رہتا ہے ٹھیک اسی طرح آفتاب نبوت کے غروب ہونے پر دنیا میں بلاشبہ اندھیرا چھا جاتا لیکن پھر بھی آفتاب نبوت کا نور منقطع نہیں ہوا اور اس نے غروب ہو کر بھی دنیا کو محض اندھیاری میں نہیں چھوڑ دیا۔ بلکہ صحابیت کے روشن ماہ پاروں اور ستاروں کو اپنا خلیفہ بناتے ہوئے پہلے ہی سے فرما دیا تھا کہ

اصحابی کالنجوم بایھم — میرے صحابہ ستاروں کی مانند ہیں جس کا بھی دامن

اقتدیتم اھتدیتم — سنبھال لوگے۔ ہدایت پا جاؤ گے۔

پس جیسے ستاروں کا نور خود اپنا نہیں ہوتا بلکہ آفتاب ہی کا نور ان میں کام کرتا ہے اور ہر ظرف کے مطابق اس نور کا رنگ اور خاصیت الگ الگ ہو جاتی ہے اسی طرح صحابہ ہیں، نور علم و اخلاق خود اپنا ذاتی نہ تھا بلکہ وہ آفتاب نبوت کے نور علم عرفان ہی کی جلوہ گری تھی، البتہ ان کے قلوب و دماغ کی ساخت اور ظرف کی خصوصیات کے مطابق اس نور کا ڈھلاؤ ان میں ہوا تو رنگ الگ ہو گئے مگر وہ سب رنگ آفتاب نبوت ہی کے تھے کسی میں شجاعت کا غلبہ ہوا۔ جیسے خالدؓ سیف اللہ کسی میں سخاوت کا غلبہ ہوا۔ جیسے عبدالرحمٰنؓ بن عوف کسی میں سیاست کا غلبہ ہوا۔ جیسے عمرؓ بن خطاب کسی میں زہد کا غلبہ ہوا۔ جیسے ابوذرؓ غفاری کسی میں دانش و عرفان کا غلبہ ہوا۔ جیسے حضرت علیؓ کسی میں تفقہ

کا غلبہ ہوا۔ جیسے ابن مسعودؓ کسی میں اجتہاد کا غلبہ ہوا۔ جیسے عبادلہ اربعہ۔ کسی میں ملوکیت عادلہ کی شان آگئی، جیسے امیر معاویہؓ اور کوئی جامع شئون نبوت ہوا جو آفتاب نبوت سے اشبہ تھا، جیسے صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کہ وہ بمنزلۂ چاند کے ہیں، جو آفتاب نبوت کے بلا واسطہ خلیفہ اور ظل نبوت ہیں جو غلبہ رحمت میں رحمۃ للعالمین کے اشبہ اور نمونۂ نبوت ہیں۔ اس چاند کا نورانی سایہ سورج ہی کے نورانی سایہ کے مشابہ دنیا میں پھیلا۔ جیسے چاندنی دھوپ کی طرح پھیل جاتی ہے۔ فرق صرف رنگ اور کیفیت اور قوت و ضعف کا ہے۔ دوسرے صحابہ بھی بحیثیت مجموعی خلفاء ہیں، جو بڑے چھوٹے ستاروں کی مانند ہیں اور سب کے سب نجوم ہدایت ہیں گو ان سے چاندنی اس طرح نہیں پھیلتی جس طرح چاند سے پھیلتی ہے۔ پس نبوت تو ختم ہو گئی، مگر خلافت اس کے قائم مقام ہو گئی، جو نور نبوت ہی سے مستفید تھی مگر روشنی اور تاثیر میں تفاوت اور فرق مراتب ناگزیر تھا۔ تاہم دنیا سے آفتاب نبوت کا نور کم نہیں ہوا، بلکہ ہزاروں ستاروں کے پردوں سے چھن چھن کر ضو فشانی کرتا رہا اور کرتا رہے گا۔ یہ رات ضرور آئی مگر روشن رات تھی، جیسے لیلھا کنہارھا (اس کی رات بھی دن کی مانند ہے) کا مصداق کہنا چاہیے۔ اسی لئے اسلامی عمل اس روشنی میں بدستور جاری رہا اور رہے گا۔ ہاں پھر یہ رات بھی غیر معمولی طور پر لمبی ہے۔ نیز یہ سینکڑوں برس کی رات ہو گی جو یوم قیامت سے پہلے ختم نہیں ہو گی۔ البتہ جب آفتاب نبوت ہی محشر میں طلوع کرے گا۔ تب ہی دن نکلے گا جسے یوم قیامت اور صبح قیامت کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ یہ دن دنیا کی ان دونوں راتوں اور دن سے کہیں زیادہ بڑا ہو گا جس میں ساری دنیا کی زندگی پوری کی پوری دہرا دی جائے گی، تا کہ اولین و آخرین پر آفتاب نبوت کا فیضان عام جو ازل سے ہوتا آ رہا تھا سب کی آنکھوں کے سامنے آ جائے چنانچہ اس دن ایک ہی جھنڈا بنام (لواء الحمد) ہو گا جس کے تلے سب انبیاء و امم جمع ہونگے ایک ہی شفاعت کبریٰ ہو گی۔ جس کے سایۂ عاطفت میں تمام امتیں آجائیں گی ایک ہی دست مبارک ہو گا جو جنت کا قفل کھولے گا اور سب نجات یافتہ اقوام کو داخلۂ جنت کا راستہ ملے گا۔ جیسے ازل میں بھی یہی ایک زبان تھی جس کے ازل میں عہد الست کے وقت بلیٰ پکارنے سے سب کی زبانوں پر بلیٰ کا نعرہ بلند ہوا۔ پھر ایک ہی ذات تھی جس نے بلیٰ کہہ کر اپنے عشق و محبت خداوندی کا ثبوت سب سے پہلے دیا اور اسی کی پیروی سب نے کی۔ گویا آپ ہی نے تعلیم توحید کے ساتھ قلوب کو عشق و محبت الٰہی کی گرمی سے گرمایا اور سب سے پہلے

عشقی اخلاق سے خلق اللہ کی تربیت کی یا مخلوق کے اندر عشق الٰہی کی دبی ہوئی آگ کو سلگایا اور ابھار دیا پھر دنیا میں ایک ہی ذات کا علمی معجزہ (قرآن) تھا جو پچھلوں کی کتابوں میں روح بن کر دوڑتا رہا۔

وانہ لفی زبر الاولین اور اسی قرآن کی روح پچھلوں کی کتابوں میں بھی تھی۔ اور اگلوں کے دلوں میں نور ہو کر چمکا پس ایک ہی آفتابِ نبوت کی ضیا باری تھی جو ازل اور ابد میں نمایاں ہوتی رہی اور اور اولین و آخرین کو روشنی دکھاتی رہی جسے قیامت کے دن جمع شدہ اولین و آخرین کے سامنے علیٰ رؤس الاشہاد کھولدیا جائیگا۔ پس وہ دن بھی آفتابِ نبوت کے طلوع ہونے سے نمایاں ہوگا جس میں یہ ساری حقائق روشن کر دی جائیں گی۔

انحصارِ نجات

بہر حال کسی بھی پہلو سے دیکھا جائے یہ نمایاں ہے کہ جس طرح مادی جہانوں میں رہ کر مادی آفتاب سے چارہ کار نہیں۔ ایسے ہی روحانی عالموں میں بس کر روحانی آفتاب (آفتابِ نبوت) سے چارہ کار نہیں ہوسکتا۔ دن ہو یا رات واسطہ بلا واسطہ روشنی اسی کی کام کرتی ہے۔ اسلئے یہ ماننا پڑے گا کہ جیسے مادی عالم میں مادی آفتاب کے سایہ کے نیچے آئے بغیر مادی ظلمتوں اور ظلمانی آفات سے نجات ممکن نہیں ایسے ہی روحانی جہانوں میں آفتابِ نبوت کے دامن تلے آئے بغیر معنوی ظلمات و آفات، جہل و ظلم، شبہات و شہوات اور فتنۂ علم و عمل سے نجات ممکن نہیں، یعنی آفتاب نبوت کے دَور دورہ کے بعد اسکو چھوڑ کر کوئی دوسری روشنی اور ہدایت کارآمد نہیں ہوسکتی، نجات کا انحصار صرف اسی کی لائی ہوئی روشنی میں منحصر ہے۔

گو پچھلے مذاہب اور انبیائے سابقین کی تعلیمات اپنے اپنے وقت میں سچی اور حق تھیں لیکن خاتم النبیین کے دورہ کے بعد اب ان میں نجات ڈھونڈھنا ایسا ہی ہے۔ جیسا کہ آفتاب طلوع ہو جانے کے بعد کوئی روپوش شدہ ستاروں کو ڈھونڈھنے اور ان کی روشنی میں راہ چلنے یا راہ پانے کا منصوبہ باندھنے لگے تو اول تو آفتاب کی تیز روشنی میں اسے کوئی ستارہ دکھائی ہی نہیں دے گا چہ جائیکہ اس کی روشنی دستیاب ہو، اور اگر بالفرض آنکھوں نے گھور گھار کر آسمان کا کوئی ستارہ ڈھونڈھ ہی نکالا تو آفتاب کے ہمسر گر نور میں اسکی گم شدہ روشنی سامنے نہیں آسکے گی کہ وہ اس میں راستہ طے کرے

اور اگر بالفرض وہ اپنے خیال سے کسی حد تک اس میں بھی کامیاب ہو جائے تو پھر بھی وہ راستہ آفتاب ہی کی روشنی میں طے کریگا کہ اس گم شدہ ستارہ کی روشنی میں تو اسے خیالی راہ پیمائی کہیں گے کیونکہ اس جزوی روشنی کا تشخص اور الگ ہو کر نظر آنا سورج کی کلی روشنی میں ممکن ہی نہیں اسلئے روشنی حاصل کرنے کا راستہ بجز آفتاب کے سامنے حاضر ہونے، دوسرا نہیں ہو سکتا اور اس سے الگ رہ کر نجات ممکن نہیں اسی سلئے قرآن حکیم نے علی الاعلان دین کی قبولیت عنداللہ کا انحصار صرف آفتاب نبوت ہی کی روشنی میں (جس کا نام اسلام ہے) منحصر بتلایا ہے۔ فرمایا،

ومن یبتغ غیر الاسلام دینًا فلن یقبل منہ وھو فی الاٰخرۃ من الخٰسرین ﴿۸۵﴾

اور جو بھی اسلام آجانے کے بعد اسلام کے سوا کوئی دین ڈھونڈے گا تو وہ اس سے قبول نہیں کیا جاوے گا، اور وہ آخرت میں گھاٹے والوں میں سے ہوگا۔

یہاں پہنچکر سوال یہ ہو سکتا ہے کہ ایک طرف تو قرآن نے نجات کو صرف اسلام میں منحصر کر دیا ہے اور دوسری طرف اسی کا یہ اعلان بھی ہے کہ یہ سب مذاہب اپنے اپنے وقت میں سچ اور برحق تھے، جن کی سچائی پر آج بھی ایمان لانا اتنا ہی ضروری ہے، جتنا کہ مذہب اسلام پر ضروری ہے تو پھر ان پر عمل کرنے اور انہیں دستور زندگی بنانے سے کیوں روکا جاتا ہے۔ درحالیکہ وہ مسلمہ طریق پر حق تھے اور اب بھی ان میں سے کلیتہً حق نکل جانے کا اعلان نہیں کیا جا رہا ہے غور کیا جائے تو اشکال کا حل بھی اسی آفتاب کی تمثیل میں موجود ہے اور وہ اس طرح کہ اسلام میں نجات کا انحصار مذاہب سابقہ کے بطلان یا ناحق ہونے کی بنا پر نہیں، بلکہ ان کے منسوخ کر دیئے جانے کی بنا پر ہے اور نسخ کے معنی ابطال کے نہیں بلکہ انتہا، مدت کے ہیں، یعنی اس سابقہ شریعت کی مدت ہی اتنی تھی اور وہ اتنے ہی وقت کے لئے آئی تھی آخر خود قرآن و حدیث میں بھی تو نسخ موجود ہے اور آیتوں یا روایتوں نے بعض آیات و روایات کو منسوخ قرار دیا ہے۔ نہ اس لئے کہ وہ معاذاللہ غلط یا باطل تھیں، بلکہ اسلئے کہ ان کے حکم یا تلاوت کا وقت ہی اتنا تھا، وہ وقت گزر گیا تو ان کا عمل بھی ختم ہو گیا۔ اسی طرح سابقہ شریعتوں کا مقررہ وقت اور دورہ پورا ہو جانے کے بعد ان کا حکم اور عمل بھی ختم ہو گیا۔ نئے وقت نے نئے حالات اور نئے ذہن پیدا کر

دیئے جو نئے احکام کے متقاضی تھے۔ اسلئے سابقہ ہدائیتیں باوجود حق ہونے کے اب کارآمد نہ رہیں تو ان کی قانونی حیثیت ختم کر دی گئی اور نئے احکام لے آئے گئے پس ان کی دستوری حیثیت کو ختم کر دیا جانا ان کے غلط ہونے کی بنا پر نہیں بلکہ وقتِ مقررہ ختم ہو جانے اور موافق حال نہ رہنے کی بنا پر ہے۔

یہ ایسا ہی جیسا کہ ایک حاذق طبیب اپنے مریض میں مادہ کا ہیجان محسوس کر کے اولاً دس بیس دن اسے منضج پلائے پھر اسے ترک کرا کر نو دنوں میں تین مسہل پلائے اور پھر انہیں بھی ترک کرا کر نو دن تبرید کا نسخہ استعمال کرائے اور پھر اسے بھی ترک کرا کر ایک مہینہ مقویات کھلائے اور پھر انہیں بھی چھڑا کر روزمرہ کی غذا پر لگا دے جو عادۃً ہر صحت مند انسان بارہ مہینہ کھاتا ہے تو کیا یہ کہا جائے گا کہ دس بیس دن میں منضج کا چھڑا دینا اور نو دن کے بعد مسہل کے نسخہ کا ترک کرا دینا اور پھر نو دن کے بعد تبرید ترک کرا دینا اور آخر کار مقویات کے نسخوں کو بھی منسوخ کر دینا ان سب نسخوں کے غلط ہونے کی بنا پر تھا اور گویا طبیب نے اپنی دانست میں غلطی کی تھی جس سے وہ نادم ہوتا رہا اور ان غلط نسخوں کو چھڑاتا رہا؟ نہیں بلکہ یہ کہا جائے گا کہ طبیب نے اپنے اپنے وقت پر تمام نسخے صحیح استعمال کرائے لیکن ہر نسخہ ایک مقررہ وقت کیلئے تھا اور وقت کی تحدید اس لئے تھی کہ اس مریض کی طبیعت کی تبدیلیاں اور صحت کی طرف اس کے رُخ کے مائل ہوتے رہنے کے یہ اوقات طبعی تھے۔ جیسے جیسے وقت گزرتے رہنے پر مریض کی طبیعت بدلتی رہی اور متبادل نسخے اس کی صحت کی استعداد کو تدریجاً آگے بڑھاتے رہے ایسے ایسے سابقہ نسخے منسوخ ہوتے رہے اور اسکی جگہ نئے نسخے لیتے رہے اور جب ان متبادل نسخوں سے اصل صحت حاصل ہو گئی تو سارے نسخے مریض کے حق میں ختم کر کے اصل غذا پر اس کا قرار و استقرار عمل میں آگیا پس یہاں نسخوں کے غلط یا باطل ہونے کا کوئی سوال پیدا نہیں ہوتا۔

ٹھیک اسی طرح عالم بشریت دنیا کے تغیرات سے ایک مریض نفس کی مانند ہے اور انبیاء علیہم السلام اسکے معالج ہیں کسی روحانی طبیب نے اسے روحانی منضج پلایا تاکہ اخلاق ردیہ کا مادہ پک کر قابلِ اخراج ہو جائے۔ کسی نے مسہل دیا کہ مادہ اخراج ہو جائے۔ کسی نے تبرید کا نسخہ دیا کہ مسہل سے پیدا شدہ گرمی خارج ہو جائے۔ کسی نے مقویات دیئے کہ روح میں قوت

آجائے اور کسی نے اصل فطری غذاؤں سے علاج کیا کہ بقار حیات بھی ہو اور دفع مرض بھی ہو جاتے پھر اس عالم بشریت کے اعضا مختلف اقوام ہیں اور ہر قوم کا مرض جدا گانہ ہے۔ جیسے ہر عضو کی بیماری اس کے ہی مناسب حال الگ الگ ہوتی ہے اور جیسے ہر مرض کے ماہر ڈاکٹر جُدا جُدا ہوتے ہیں، جو خاص اسی عضو کا علاج کرتے ہیں، اسی طرح دنیا میں یہ اطبائے روحانی (انبیاء علیہم السلام) مختلف اقوام اور مختلف خطوں میں تشریف لائے اور اسی قوم کے مخصوص امراض کے لئے مخصوص قسم کے نسخے ساتھ لائے۔ جن سے قومیں حسب استعمال دوا شفا پاتی رہیں، جو در حقیقت اس عالم بشریت کی صحت تھی اس لئے عالم بشریت ان اطبائے روحانی کے مختلف المزاج نسخے استعمال کر کر کے صحت مندی کی طرف بڑھتا رہا اور جو نسخہ اپنی تاثیر دکھلا کر ان اعضا بشریت کو صحت کی طرف بڑھاتا رہا کہ اگلا نسخہ اگلا عمل کرے تو وہ سابقہ نسخہ نیا نسخہ آنے کے بعد ختم ہوتا رہا اور نیا اس کی جگہ سنبھالتا رہا۔ پس نیا نسخہ چونکہ اپنا عمل اس استعداد پر کرتا تھا جو پہلا نسخہ پیدا کر چکتا تھا اس لئے پہلے نسخہ کو غلط نہیں کہا جا سکتا۔ بلکہ وہ اپنے وقت میں لیلئے ضروری اور صحیح اور مناسب وقت تھا کہ اس کی کارفرمائی کے بغیر نئے نسخہ کی کارفرمائی ظاہر ہی نہیں ہو سکتی تھی اس لئے ان سابقہ نسخوں کی منسوخی کے معنے ان کے باطل ہونے کے نہ ہوں گے بلکہ موقت ہونے کے ہوں گے جس کا ختم ہو جانا خاتمہ وقت پر ضروری اور لوازم علاج بدن سے تھا جو اس کے صحیح اور جزو طب ہونے کی دلیل ہے نہ کہ باطل و خارج از طب ہونے کی پس یہ نہیں کہا جائے گا کہ سابقہ نسخہ کی تبدیلی میں طبیب کو ندامت کے ساتھ رجوع کرنا پڑا اور اس نے اپنی غلطی محسوس کر کے نسخہ بدلا۔ بلکہ یہ کہا جائے گا کہ [illegible] کے ذہن میں پہلے ہی سے اس نسخہ کا وقت آنا ہی تھا جب سابقہ دوا اپنا کام کر چکی اور اس سے صحت کا ایک خاص درجہ آپہنچا جو مقصود تھا تو [illegible] نے اُسے چھڑا دیا کہ اب اسکا استعمال مریض کے موجودہ مزاج کے لئے مضر تھا یہی صورت شرائع سابقہ اور شرائع مابعد کی بھی تھی کہ حکیم مطلق کے علم ازلی میں ان سابقہ مذاہب کے شرعی نسخوں کی نفع رسانی کا مقررہ وقت پورا ہوتے رہنے پر اصولِ طب کو بدستور باقی رکھ کر یہ شرعی نسخے بدلے جاتے رہے جبکہ وہ آنیوالی دنیا کے مزاج اور اسکی ترقی پذیر ذہنیت کے حسب حال نہ رہے تھے۔ اسلئے فسخ شرائع کے معنی تغلیظ شرائع یا ابطال مذاہب کے نہ ہوں گے۔ بلکہ انتہائے مدت کے ہوں گے جو تبدیل

ذہنیت کے معیار سے ہوتی رہی ہے۔ ۱

خود اسلام میں بھی کتنی ہی شرائع اپنے ابتدائی اوقات میں اس رنگ کی نہ تھیں جس پر وہ آخر کار آ کر رکیں اور ٹھہر گئیں۔ مثلاً ابتداء اسلام میں نماز میں نقل و حرکت سلام و کلام اور رُخ کا ہیر پھیر اور تخاطب و مکالمہ سب جائز تھا لیکن جیسے جیسے ذہنیت تربیت یافتہ ہو کر ترقی یافتہ ہوتی رہی اور اس حد پر آگئی کہ نماز کی شائستگیوں کو اٹھا سکے۔ ویسے یہ سب آزادیاں بتدریج منسوخ ہوتی گئیں اور وہ ترقی یافتہ ہیئتہ آخر کار آ کر پائیدار اور برقرار ہو گئی جو ازل سے شارع حقیقی کی نگاہ میں متعین تھی تو کیا یہ کہا جائے گا کہ نماز کی یہ ابتدائی صورتیں معاذ اللہ باطل تھیں؟ نہیں ورنہ ان کا اجراء و نفاذ ان پر اجر و ثواب کا وعدہ اور ان کے حق میں قبولیت عند اللہ کا وعدہ کیوں ہوتا؟ بلکہ یہ کہا جائے گا کہ اس وقت کی قوم اور ابتدائی ذہنیت کے لئے وہ کافی ضرور تھیں مگر خود ناتمام تھیں کہ فی الحقیقت ذہن ہی نئی قوم کا ابتداء میں ناتمام تھا۔ جتنا جتنا نئی قوم کا مزاج اور ذہن اسلامی رنگ کے لحاظ سے شائستہ سنجیدہ اور پختہ ہوتا گیا۔ اتنی اتنی وہ آخری اور مطلوب ہیئتیں آ آ کر قائم ہوتی گئیں جو پہلے سے علم الٰہی میں طے شدہ تھیں۔

اس حقیقت کو واضح تر کرنے کے لئے یہ مثال کافی ہوگی کہ ایک نوزائیدہ بچہ کے لئے قدرت نے ماں کے دودھ کی غذا تجویز کی۔ جب وہ دو برس کا ہو گیا اور کچے دانت نکل آئے تو شیر خواری منسوخ کر کے ہلکی غذائیں رکھیں جو بچہ ہضم کر سکے۔ جب پکے دانت نکل آئے اور ثقیل و سخت غذائیں ہضم کرنے کی قوت اسے ملگئی تو یہ بھی منسوخ ہو کر آخر کار وہی غذائیں آگئیں اور باقی رہ گئیں جو عادتاً سارے انسان استعمال کرتے ہیں تو کیا یہ کہا جائے گا کہ معاذ اللہ نوزائیدہ بچہ کے لئے شیرخواری تجویز کرنے میں قدرت نے غلطی کی تھی جسے دو برس کے بعد منسوخ کرنا پڑا یا پانچ سالہ بچہ کے حق میں ہلکی پھلکی نرم غذاؤں کی منسوخی اسلئے عمل میں آئی کہ وہ غلط تھیں؟ نہیں بلکہ اس لئے کہ بچہ کے حالات کے لحاظ سے یہ منسوخ شدہ غذائیں اتنے ہی اتنے اوقات کے لئے رکھی گئی تھیں۔ جب وہ وقت اور حال گزر گیا اور بچہ کی ابتدائی حالت تبدیل ہو کر قوت حدِ کمال پر آگئی تو وہ غذائیں بھی گزر گئیں اور وہی کامل غذائیں آگئیں جو ایک پختہ انسان کے لئے ہوتی ہیں اور مرتے دم تک رہتی ہیں۔ آپ اسی طرح عالمِ بشریت کو بھی سمجھ لیں کہ اس پر بھی ایک دورِ طفلی کا گزرا ہے۔ جو آدم و نوح علیہما السلام کے درمیان کا

زمانہ ہے۔ اس لئے اس وقت کی تعلیم وعبادت بھی مختصر اور ہلکی پھلکی تھی تعلیم کے درجہ میں صرف اشیاء کے نام سکھلا دیئے گئے جو آدم علیہ السلام کو تعلیم کئے گئے تھے

اور عبادت کے درجہ میں فقط ایک وقت کی نماز اور وہ بھی صرف بصورت سجدہ بتلادی گئی۔ جیسے بچوں کو ابتداء میں چیزوں کے نام ہی بتلائے جاتے ہیں کہ یہ آسمان ہے۔ یہ زمین یہ روٹی ہے اور یہ پانی وغیرہا اور عبادت کے سلسلہ میں کسی ایک آدھ وقت بھی بچہ کو اگر مسجد میں لے آتے ہیں تو اس کے حق میں اُسے ہی بڑی عبادت سمجھتے ہیں اور بطور حوصلہ افزائی کے کہا کرتے ہیں کہ ماشاءاللہ بچہ بڑا نمازی ہوگیا ہے۔ مگر جیسے جیسے یہ عالم بشریت جوانی اور قوت کی طرف بڑھتا رہا اور اس کے ذہنی اور دماغی قویٰ قوی ہوتے گئے۔ ویسے منضبط شریعتیں اترتی رہیں اور اصول کی بقاء کے ساتھ احکام اور عملی پروگرام میں حسب مزاج بشریت تبدیل ہوتی گئی اس لئے نہیں کہا جاسکتا کہ پہلے احکام غلط تھے۔ اس لئے وہ بدل دیئے گئے۔ جیسے یہ نہیں کہا جاسکتا کہ بچہ کی ابتدائی تعلیم غلط تھی۔ اسلئے اسے منسوخ کر کے انتہائی تعلیم لائی گئی یا مثلاً بچہ ابتداء میں تتلائی ہوئی زبان سے بولتا ہے اور جوں جوں عمر آتی جاتی ہے۔ زبان صاف ہوتی جاتی ہے۔ یہاں تک کہ پھر یہی تتلا بچہ زمانہ کا زبردست فصیح وبلیغ اور قادر الکلام خطیب بن جاتا ہے اس لئے نہیں کہا جاسکتا کہ تتلاپن بچہ کے حق میں غلط تھا۔ اس لئے قدرت نے اُسے زبان کی صفائی بخشی۔ بلکہ یہ کہا جائیگا کہ تتلاپن نوعمر بچہ کی ابتدائی ساخت کا قدرتی تقاضا تھا اور صاف کلامی پختہ عمر کی زبان اور اس کے قویٰ کی ترقی کا قدرتی نتیجہ ہے جو اپنے اپنے وقت ضروری اور موزوں تھا۔ اسی طرح شریعتوں کا ابتدائی دور اپنی ذات اور اپنی تعبیر کے لحاظ سے ابتدائی حالت میں تھا کہ عالم بشریت ہی ابتدائی حالت میں تھا۔ جیسے جیسے عالم بشریت تکمیل قویٰ کی طرف بڑھتا رہا۔ اسی طرح اس کی شریعتیں اور شریعتوں کی تعبیریں بھی کامل ومکمل ہوتی گئیں اب اگر اس ترقی پذیر رفتار سے اس کی شریعت اور اس کی تعبیر اپنی کسی ایسی آخری حد پر آجائے کہ اسکے بعد ترقی ممکن نہ ہو جس سے پچھلی شریعتیں اور تعبیریں متروک اور منسوخ ہو جائیں تو یہ تنسیخ یا تبدیل معاذاللہ کسی احساس غلطی کا نتیجہ نہیں ہوگا۔ بلکہ حالت کی ترقی پذیر رفتار کا قدرتی تقاضا شمار ہوگا۔ پس دین اگر اول سے آخر تک ایک ہی رہے۔ لیکن اس کے نشو ونما کے لحاظ سے اس کے شرعی لباس بدلتے رہیں۔ یہاں تک کہ جب نشو ونما مکمل ہو جائے تو لباس کی پیمائش

ایک حد پر آ کر رک جائے تو اس میں کیا قباحت اور کیا عقلی پیچیدگی ہے کہ اُسے ماننا خلافِ عقل یا خلافِ طبع سمجھا جائے آخر ایک نو پید بچہ کا پیدائش کے وقت لباس بالشت بھر سے زیادہ نہیں ہوتا لیکن جیسے جیسے بچہ بڑھتا رہتا ہے، سابقہ لباس منسوخ ہو کر نئی نئی پیمائش کا لباس آتا رہتا ہے۔ یہاں تک کہ پچیس تیس برس کی عمر میں جب اس کا نشو و نما مکمل ہو جاتا ہے تو لباس کی پیمائش بھی ایک خاص حد پر آ کر رک جاتی ہے اور وہ آخری پیمائش بالآخر عمر بھر قائم رہتی ہے تو جس طرح یہ تبدیلی کسی غلطی کی بنا پر نہیں ہوتی بلکہ تبدیلی احوال و عوارض کی بنا پر ہوتی ہے۔ ایسے ہی دین کے شرعی لباس یعنی شرائع کی تبدیلی بھی دین کے قد و قامت کے لحاظ سے ہوتی رہی ہے۔ معاذ اللہ کسی غلطی کی بنا پر نہیں ہوتی اور جیسا کہ تدریجی ترقی اور پیاپے تبدیلی کے بعد اختتام نشو و نما پر آخری پیمائش قائم و دائم ہو جاتی ہے جس میں پھر تبدیلی نہیں ہوتی۔ پس دین کی تکمیل کے بعد قدرتاً یہ تبدیلی بند ہو کر آخری پائیدار حالت آ جانی قدرتی ہے جو پھر تبدیل نہیں ہو سکتی۔

اس سے صاف واضح ہے کہ شریعتوں کی تبدیلی دنیا کی اقوام کی ذہنیتوں کے تفاوت سے ہوئی اور اسوقت تک ہوتی رہی جب تک کہ انسانی معاشرہ کا مجموعی مزاج حد کمال پر نہیں آ گیا۔ ذہن اور مزاج کی تکمیل ہوتے ہی قدرتی بات تھی کہ دین بھی کامل کر دیا جائے۔ شریعت بھی ناقابلِ تبدیل بھیجدی جائے۔ قوانین احکام اور پروگرام بھی ناقابلِ تنسیخ اتار دیئے جائیں۔ سو وہی آخری اور قائم و دائم دین اور آخری شریعت اور آخری آئین و قانون خاتم النبیین کا دین و آئین ہے۔ جس کے بعد نہ نیا دین آئے گا نہ دین میں کمی بیشی ہوگی۔ اس کے بعد بھی سابقہ منسوخ شدہ شرائع میں نجات تلاش کرنا ایسا ہی ہوگا۔ جیسا کہ کوئی تبرید کے نسخہ کے بعد لوٹ کر پھر منفج کے ابتدائی نسخہ میں شفا و صحت تلاش کرنے لگے یا کامل الغذاء انسان اپنی بقا کے لئے لوٹ کر پھر ماں کا دودھ پینے لگے ایک چھ فٹ کا انسان بدن کی راحت و زینت کے لئے لوٹ کر پھر وہی اپنی پیدائش کے وقت کا بالشت بھر کا کرتہ پہننے کی کوشش کرنے لگے یا ایک فاضل اور منتہی طالب علم پھر سے لوٹ کر صرف و نحو کی ابتدائی کتابوں سے علم کی تلاش میں لگ جائیں یا ایک قادر الکلام خطیب پھر سے لوٹ کر بچپن کی تتلائی ہوئی زبان بولنے میں فصاحت و بلاغت کا تخیل باندھنے لگے، تو جیسے ان لوگوں کو اس ترقیٔ معکوس کے تخیل پر احمق کہا جائے گا ایسے ہی دینِ کامل اور شریعت خاتم النبیینؐ کے دَور دَورہ کے

بعد ابتدائی شرائع میں نجات ڈھونڈھنے والے کو بھی اسی قسم کا کوئی خطاب دیا جا سکے گا۔

اگر آپ غور کریں تو یہ نسخ شرائع اور انحصار نجات کی حقیقت بھی اسی آفتاب کی تکمیل میں موجود ہے۔ کیونکہ آسمان پر کروڑوں ستارے یکے بعد دیگرے دنیا کو نور پہنچانے کے لئے طلوع ہوتے ہیں جس کا رنگ الگ ہوتا ہے اور تاثیر الگ جیسے جیسے بڑے ستارے آتے جاتے ہیں، چھوٹے ستاروں کا نور ان کے نور میں گم ہوتا رہتا ہے اور اب دنیا کی نگاہ صرف ان بڑے ستاروں پر لگ جاتی ہے اور انہی کی روشنی کو سامنے رکھ لیتی ہے۔ چھوٹے ستارے نہ آنکھوں میں آتے ہیں نہ ان کی روشنی ہی سامنے ہوتی ہے۔ پھر چاند نکلنے پر یہ بڑے ستارے بھی پھیکے بلکہ ایک حد تک بے نور سے نظر آنے لگتے ہیں اور ان کی روشنی راہ نما باقی نہیں رہتی، مگر آخر کار جب آفتاب نمایاں ہوتا ہے تو چاند بھی مونھ چھپا لیتا ہے اور پھر دنیا کی نگاہ کے سامنے ذات بھی اگر نمایاں ہوتی ہے تو سورج کی اور روشنی بھی دکھائی دیتی ہے تو صرف اسکی تیز تاثیر (حرارت) بھی محسوس ہوتی ہے تو صرف اسی کی گویا نگاہوں میں نہ اب کوئی ستارہ باقی رہتا ہے۔ نہ کسی کی روشنی اور تاثیر۔ ظاہر ہے کہ یہ ستاروں کا نمایاں ہو کر چھپا دیا جانا، معاذاللہ کسی غلطی کی بنا پر نہیں ہوتا کہ نعوذ باللہ قدرت نے ابتدائی ستاروں کی نمائش میں غلطی کی تھی جس سے آخر کار چاند اور پھر سورج کو لانا پڑا؟ نہیں بلکہ ابتدائے شب میں انسانی معاشرہ کے مزاج کا یہی تقاضا ہوتا ہے کہ اسے ہلکی اور ٹھنڈی ہی روشنی ملے تاکہ وہ معمولی کام کاج کر کے شب باش ہو جائے۔ لیکن آخر شب میں جب نیند بھر چکتی ہے اور دنیا کا مزاج تمدن و معاشرت کے بڑے سے بڑے کام انجام دینے کے لئے مستعد ہو جاتا ہے۔ جس کے لئے اسے تیز روشنی اور مزاج کے ابھار کے لئے قوی حرارت درکار ہوتی ہے تو اسی وقت خاتم الانوار کو چمکا دیا جاتا ہے جو پچھلے انوار کو منسوخ کر کے صرف اپنا نور پھیلا دیتا ہے۔ نہ اسلئے کہ پہلے انوار غلط تھے بلکہ اس لئے کہ ان کا وقت ہی اتنا تھا پس جتنے وقت پر وہ اور ان کی روشنی دنیا سے اوجھل کر دے گی، اتنا ہی ان کا وقت اور دورہ کار گذر رہی تھا، پھر بھی اگر کوئی سورج کی روشنی نمایاں ہو جانے کے بعد انہی ابتدائی شب کے ستاروں کی روشنی میں ظلمت سے نجات پانے کا متلاشی ہوگا، تو اسے کوئی بھی عقلمند انسان عقلمند کہنے کی جرأت نہ کرے گا۔ ٹھیک اسی طرح خاتم النبیین کی نبوت اور شریعت آ جانے کے بعد ابتدائی شریعتوں کے گذرے ہوئے

انوار میں نجات ڈھونڈھنا اور انہیں کو ابدالاباد تک باقی رکھنے کی آرزو باندھنا ایسا ہی ہوگا جیسا کہ کوئی طلوع آفتاب کے بعد بھی ہمیشہ ہمیشہ رات ہی کے باقی رہنے اور ستاروں ہی کے قائم رہنے کی خواہش رکھے۔ سو اگر یہ خلاف فطرت ہے تو وہ بھی خلاف فطرت ہے۔ اس لئے اصول کے طور پر متعین ہو گیا کہ دورۂ خاتم کے بعد ابتدائی اور درمیانی دوروں کے قوانین و معمولات نجات دہندہ نہیں بن سکتے۔ اب اگر باقی رہتا ہے تو صرف یہ کہ وہ آخری دور کون سا ہے اور کس کا ہے اور کون خاتم النبیین ہیں، جن کی آمد کے بعد قوانین سابقہ سب منسوخ ہو کر صرف انہی کے بتائے ہوئے قانون میں نجات کا انحصار ہو چکا ہے؟

سو ظاہر ہے کہ اس کا تعلق واقعات سے ہے اور واقعات کے ادراک کے لئے انسان کو دو ہی عظیم قوتیں دی گئی ہیں۔ ایک سمع کہ کسی مخبر صادق سے آدمی واقعہ کو سنکر یقین کرے اور دوسرے بصر کہ آثار و شواہد دیکھ دیکھ ذی اثر کا یقین کرے۔ جیسے دھوئیں کو دیکھ کر آگ کا اور دھوپ کو دیکھ کر سورج کے نکلنے کا یقین کیا جاتا ہے۔ سو جہاں تک خبر صادق کا تعلق ہے، کون نہیں جانتا کہ خاتمیت کا دعویٰ سوائے حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اور کسی نے نہیں کیا۔ آدم علیہ السلام تو اول النبیین ہیں، وہ خاتم ہونیکے دعویٰ کیسے فرما سکتے تھے۔ اولوالعزم پیغمبروں میں نوح علیہ السلام کا بھی یہ دعویٰ نہیں تھا کہ وہ خاتم النبیین ہیں اور کیسے ہوتا جبکہ فرمایا کہ وہ بھی ایک درجہ میں اول النبیین ہی تھے۔ جنہیں آدم ثانی کہا جاتا ہے کہ طوفان نوح کے بعد ساری دنیا کی نسل انہیں سے چلی اور وہی اول نبی تھے جنہوں نے عالم میں کفر کا مقابلہ کیا۔ سو ابتداء عالم بشریت میں اگر نبوت ختم کر کے مکمل کر دی جاتی تو یہ ایسا ہی ہوتا جیسے بچپن ہی میں کسی کو آخری حکمت کی تعلیم دی جانے لگی اور مبادی ترک کر دیئے جائیں جو سرتا سر خلاف فطرت ہے۔ پھر ابراہیم علیہ السلام نے بھی یہ دعویٰ نہیں کیا کہ وہ خاتم ہیں، بلکہ انہوں نے تو اور دعا یہ مانگی کہ اے اللہ میری اولاد میں ایسا اور ایسا عظیم الشان نبی پیدا فرما۔ موسیٰ علیہ السلام نے بھی خاتمیت کا دعویٰ نہیں کیا کہ انہوں نے تو آتشیں شریعت لانے والے اور دس ہزار قدسیوں کے ساتھ خدا کے پہلے گھر میں داخل ہونے والے پیغمبر کی خبر دی حتیٰ کہ اس کی امت تک میں سے ہونے کی تمنا کی۔ پھر عیسیٰ علیہ السلام نے بھی خاتمیت کا دعویٰ نہیں کیا بلکہ انہوں نے تو اپنے آنے کی بڑی غرض و غایت ہی اگلے عظیم پیغمبر کی آمد کی بشارت سنانا

ظاہر کی۔ہاں یہ دعویٰ اگر کیا تو حضرت محمد رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے کیا اور فرمایا کہ میں ہی قصرِ نبوت کی آخری اینٹ ہوں۔ میں ہی وہ ہوں کہ جس کے بعد کوئی نبی آنے والا نہیں۔ میں ہی وہ ہوں کہ جس پر دین کی تکمیل ہوگئی اور میں ہی وہ ہوں کہ اگر آج موسیٰ بھی زندہ ہوتے تو میرے اتباع کے بغیر انہیں بھی چارۂ کار نہ تھا۔ پھر ان کے خدا نے بھی انہیں ہی خاتم النبیین فرمایا اور کسی کو نہیں فرمایا۔ نام لیکر فرمایا کہ

ماکان محمّد ابا احد من رجالکم ولکن رسول اللہ وخاتم النبیین؁ — محمّد تمہارے مردوں میں سے کسی کے باپ نہیں تھے لیکن وہ اللہ کے رسول اور خاتم النبیین تھے۔

اس لئے بجی اور مستند نقل وخبر کی روشنی میں یہ دعویٰ ثابت ہو جاتا ہے کہ خاتم النبیین حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم ہی ہیں اور ان ہی کا یہ دَور آخری دَور ہے۔ جس کے بعد کسی شریعت ونبوت کا کوئی اور دَور آنے والا نہیں۔

نقل وروایت کے بعد اب سوال عقل وروایت کا رہ جاتا ہے کہ کیا عقل اور واقعات بھی اس کی تائید کرتے ہیں کہ یہ نبی وہی آخری نبی اور یہ شریعت وہی آخری شریعت ہے؛ حالانکہ بظاہر ایسا نظر نہیں آتا کیونکہ سابق میں شریعتوں کی تبدیلی وتنسیخ کا اصول انسانی ذہن کی تبدیلی اور اس کا تدریجی ارتقاء قرار دیا گیا ہے تو کیا یہی صورت آج بھی نہیں ہے کہ انسانی ذہن تبدیلیوں اور انقلابات کا محور بنا ہوا ہے بلکہ آج کی دنیا میں ذہنی تبدیلیاں شاید پہلے کی دنیا سے بھی کہیں زائد ہیں۔ روز روز نظریات تبدیل ہو رہے ہیں، اور انسانی مزاج بدلتا جا رہا ہے تو کیسے کہدیا جائے کہ انسانی ذہن کسی ایک حد پر آکر ٹھہر گیا ہے۔ جس کے بعد تبدیلی نہیں تو پھر سمجھ لیا جائے کہ یہ شریعت آخری شریعت ہے، جس کے بعد نئے ذہنوں کو اپیل کرنے والی کوئی شریعت آنیوالی نہیں؛

اس اشکال کو حل کرنے کے لئے اسی تبدیلیٔ ذہن کے اصول پر غور کیجئے۔ جس پر غور نہ کرنے سے اشکال پیدا ہوا ہے اور وہ یہ کہ دنیا میں مختلف شریعتوں کے آنے اور ایک ایک وقت میں کئی کئی نبوتیں اور کئی کئی شریعتیں رائج ہونے کی بنا درحقیقت دنیا کے مزاجوں کے تفاوت کی رعایت تھی تاکہ ان کے حسبِ حال اور مزاجوں کی مناسبت سے انہیں تربیت دیا جا سکے اور انہیں کے رنگ طبع

کے موافق انہیں خدا کی بندگی اور عبودیت کے لئے تیار کیا جا سکے۔ کیونکہ جب تک مربی اور سامان تربیت موافق مزاج اور حسب حال نہ ہو آدمی تربیت سے اثر نہیں لے سکتا۔ ظاہر ہے کہ اگر مزاجوں اور ذہنوں کے احوال کی رعایت کئے بغیر ایک ہی قانون ان سب کو لا کر دیا جاتا جبکہ ان کے مزاجوں میں مشرق و مغرب کے بعد کے ساتھ مشرق و مغرب ہی جیسا تفاوت قائم تھا تو وہ کبھی بھی اصلاح پذیر نہ ہو سکتے اگر قوم سخت مزاج ہے تو شرعی قانون میں بھی شدت اور سختی ہی کے رنگ کی ضرورت ہوگی، نرم قانون اس مزاج کی قوم کے لئے کبھی مفید نہیں ہو سکتا۔ نرم خو قوم ہے تو سہل اور ملائم احکام کی ضرورت پڑتی ہے۔ یہاں سختی قانون کارگر نہیں ہو سکتی، حکمت پسند قوم ہے تو قانونِ تربیت بھی حکیمانہ رنگ کا ہونا چاہیئے اور سادہ لوح قوم ہے تو قانون کی بھی سادگی ناگزیر ہے: بچوں کے لئے ابتدائی درجہ ہی کی تعلیم مفید ہوتی ہے۔ اگر انہیں حکمت کی اونچی باتیں ابتداء ہی میں بتائی جانے لگیں تو وہ کبھی بھی ان سے فائدہ نہیں اٹھا سکیں گے اور بڑوں کے لئے اونچی باتیں اور اونچی تعلیم ہی مؤثر ہو سکتی ہے اگر انہیں حروف ابجد سکھائے جانے لگیں تو وہ ہنس کر استاد کو بھی مضحکہ بنا دیں گے۔ اس لئے شریعتیں دنیا میں حسبِ مزاج اقوام لائی گئیں اور مربیان شرائع (انبیاء علیہم السلام) بھی مختلف قوموں کے حسب حال ہی تعلیم و تربیت کے مختلف پروگرام لیکر مبعوث ہوئے۔

جیسے ارشادِ حق ہے:۔

لکل جعلنا منکم شرعة و منهاجا ؕ	ہم نے تم میں سے ہر ایک (قوم) کے لئے ایک شریعت اور ایک راہ رکھی۔

جس سے شرائع کا اختلاف ثابت ہے۔ اسی کو حدیثِ نبوی میں بطور تشریح بیان اس انداز سے ظاہر فرمایا گیا کہ۔

نحن معاشر الانبیاء بنو العلات ابونا واحد وامهاتنا شتّٰی	ہم انبیاء کی جماعت علاتی بھائی ہیں، باپ ہمارا (یعنی دین) ایک ہے اور مائیں ہماری (یعنی شریعتیں) الگ الگ ہیں۔

اس لئے یہ مقدسین کرام انبیاء علیہم الصلاۃ والسلام ہر قوم میں الگ الگ اور ہر خطہ میں جُدا جُدا بھیجے گئے۔

وان من امة الا خلا فیھا نذیر ۚ — کوئی امت نہیں، جس میں کوئی ڈرانے والا نہ آیا ہو۔

ولکل قوم ھاد ۔ — ہر قوم میں ہادی آیا۔

ولکل امۃ رسول ۚ — ہر امت میں رسول آیا۔

نیز حسب رنگ اقوام رنگ بھی مختلف لیکر آئے۔

یہود تند خو تھے تو موسیٰ علیہ السلام جلالی پیغمبر دیئے گئے۔ نصاریٰ نرم خو تھے، تو عیسیٰ علیہ السلام جیسے جمالی پیغمبر دیئے گئے۔ سبا کی قوم بادشاہت پسند تھی تو سلیمان علیہ السلام جیسے شاہانہ رنگ کے پیغمبر دیئے گئے۔ نمرود کی قوم نجومی رنگ کی تھی تو ابراہیم علیہ السلام جیسے عارف ملکوت سموات پیغمبر عطا کئے گئے۔ غرض جیسا قوم کا رنگ ہوا، ویسا ہی رنگ پیغمبری بھی رکھا گیا۔ پھر اسی عنوان سے کتابیں بھی مختلف آئیں اور مختلف انداز کے اصول تربیت لیکر آئیں۔ جن پر انہی کی قدر مخاطب امت کی آخرت میں جزا رکھی گئی۔

کل اُمۃ تدعیٰ الیٰ کتابھا الیوم تجزون ما کنتم تعلمون ۚ — ہر امت اپنی ہی کتاب کی طرف بلائی جائے گی۔ آج کے دن تم کو اپنے کئے کا (جو اس کتاب کے مطابق تھا) بدلہ دیا جائیگا

اسی اصول پر قبلے مختلف رکھے گئے تاکہ یہ مختلف امتیں اپنے اپنے رنگ سے ان کی طرف رخ کرکے یادِ خداوندی میں لگیں۔

ولکل وجھۃ ھو مولیھا ۚ — اور ہر امت کے لئے ایک جہت ہے۔ جس کی طرف وہ رخ رکھتی ہے۔

بہر حال ہر قوم میں ہر خطہ میں انبیاء آئے اور ان قوموں کے مناسب حال شریعتیں اور قانون حق کی کتابیں لائے۔ جن سے ان کی اصلاح فرمائی۔ اسلئے صاف واضح ہے کہ ہر قوم کا قانونی مزاج الگ الگ تھا۔ اسلئے اس کا قانون بھی اسی کے حسب حال الگ تھا۔ جس سے دوسری قوموں کے مزاج میل نہیں کھاتے تھے اور جو قانون ایک کے لئے تھا، وہ دوسری کے لئے نہ تھا۔ شریعتیں بھی الگ الگ تھیں اور نبوتیں بھی جُدا جُدا اصول میں متحد مگر پروگرام میں مختلف۔

اس سے یہ نتیجہ بآسانی نکل آتا ہے کہ ان قومی اور وطنی شریعتوں میں کوئی شریعت بھی ساری دنیا کے لئے نہ تھی اور اس لئے نہ تھی کہ وہ ایسی اصولیت وکلیت اور جامعیت لے کر نہیں آئی تھی کہ دنیا کی ساری مختلف المزاج اور مختلف المذاق قوموں کے لئے تنہا کافی ہو جاتی جبکہ دنیا کی اقوام ہی میں خود ایسی اصولیت وکلیت اور ہمہ گیر مزاج کی استعداد نہیں آئی تھی جو بین الاقوامی قانون کی متقاضی اور طلبگار ہوتی اور کسی ایک ہی جامع راستہ اور قدر مشترک یا اصولی نقطہ پر ان اقوام کو جمع کر سکتی اس کی تکوینی اور قدرتی وجہ تو یہ تھی کہ عالم بشریت کی استعداد تدریجاً ہی بڑھی ہے۔ یکدم مکمل نہیں ہوئی۔ جیسے بچہ بتدریج ہی شباب اور بلوغ تک پہنچتا ہے۔ درخت بتدریج ہی تناور درخت ہوتا ہے اور پھل دیتا ہے اور اس لئے اُسکی ابتدائی اور درمیانی حالت طبعاً ناتمام ہوتی ہے۔ ظاہر ہے کہ جس عالم بشریت کے اجزاء بتدریج بلوغ تک پہنچتے ہیں۔ خواہ وہ نباتات ہوں یا حیوان وانسان تو قدرتی بات ہے کہ وہی تدریج اس کے مجموعہ کی صفت بھی ہوگی، یہ ناممکن ہے کہ عالم کے اجزاء نبات وحیوان اور بشر وانسان تو بتدریج حد کمال تک پہنچیں اور مجموعہ یکدم بام ترقی پر پہنچ جائے جبکہ مجموعہ نام ہی ان اجزاء کا ہے۔ جن میں تدریج مشاہدہ کی جا رہی ہے اور ظاہر ہے کہ بلوغ سے پہلے پہلے کی حالت ناقص اور ناتمام ہی کہلائی جا سکتی ہے اگر وہ حد کمال ہوتی تو اسے آگے کیوں بڑھایا جاتا اور یہ بھی ظاہر ہے کہ ناتمام یا کمزور حالت کے احکام الگ ہوتے ہیں اور حالت بلوغ کے احکام نابالغ پر اور بالغ پر نابالغ کے احکام جاری نہیں ہو سکتے۔ اس لئے آدم علیہ السلام سے تا تکمیل انسانیت جتنے بھی درمیانی قوانین تھے، وہ ناتمام ہی انسانیت کے لئے تھے اس لئے وہ خود بھی انسانیت کی طرح تکمیل طلب تھے اسلئے جیسے جیسے انسانی معاشرہ حد کمال کی طرف بڑھتا گیا۔ ویسے ویسے دینی قوانین بھی بتدریج شباب وکمال کی طرف بڑھتے گئے اور جوں جوں انسان کی طبعی مدنیت کے چولے وسیع اور فراخ ہوتے رہے اور اسکا تمدن ترقی کرتا گیا اسی قدر دین کے شرعی لباس اور شریعتوں کے چولے بھی اپنے اندر وسعت و فراخی پیدا کرتے گئے۔ تاکہ انسانیت کی تربیت اس کے ذہن اور مزاج کے حسب حال ہو سکے۔ حاصل یہ ہے کہ دین تمدن کی وسعتوں کی حد تک ہی وسیع ہوتا گیا ہے۔ تمدن کے جتنے گوشے پیدا ہوتے گئے اور ان

سکے راستہ سے انسان کے لئے گمراہی کے احتمالات اور واقعات رونما ہوتے گئے۔ اسی حد تک ہدایتوں کے گوشے بھی پھیلتے گئے تاکہ ہر ضلالت کے رخنہ کا ہدایت سے سدباب کیا جا سکے اور اسی لائن سے انسان کو اس کے مالک و خالق کی طرف متوجہ کیا جا سکے پس ادیان کی یہ تدریجی ترقی و تکمیل حسبِ تدریج انسانیت طبعی تھی جس پر یقین لانے کے لئے ظاہری اسباب تلاش کرنے کی ضرورت نہیں۔

تاہم چونکہ ہر حقیقت کیلئے اس عالم اسباب میں جو بلاشبہ قدرتی کارخانہ ہے اظہارِ قدرت کے لئے اسباب بھی رکھے گئے ہیں اس لئے دنیا کے ابتدائی اور وسطی زمانوں میں دین کا قومیتوں اور وطنوں کی حد بندیوں میں محدود رہ کر وسیع اور ہمہ گیر نہ ہونا یا بالفاظ دیگر تکمیل طلب رہ کر استعداد کی زبان سے آخری تکمیل مانگتے رہنا۔ جیسے قدرتی ہے ویسے ہی ظاہری اسباب سے موجہ بھی ہے وہ وجہ یہ ہے کہ ہمہ گیر اسباب و وسائل نہ ہونے اور ناواقف طبیعتوں کے ان کی طرف متوجہ نہ ہونے کے سبب ہر قوم دوسری قوم سے الگ، ہر خطہ دوسرے خطہ سے کٹا ہوا اور ہر ملک دوسرے ملک سے بے تعلق رہتا تھا۔ نہ عمومی ریل میل تھا نہ ہمہ گیر خلط و اختلاط۔ ہر قوم دوسری قوم سے ناآشنا اور اگر کسی حد تک آشنا بھی ہوتی تو دور سے کچھ عمومی احوال سن سنا کر نہ تمدن میں اشتراک نہ رسم و رواج میں یکسانی، نہ مذاق میں وحدت ہر قوم کے یہاں دوسری قوم ایک افسانہ تھی اور ایک ایسی عجوبہ روزگار چیز سمجھی جاتی تھی جس کے افسانے مافوق العادت سمجھ کر حیرت سے سنے جاتے تھے اور دل بہلانے کے لئے قصہ کہانیوں میں نوادر روزگار کے سے انداز بیان میں آتے تھے جیسے گویا یہ قوم اس عالم کی بسنے والی ہی نہیں، بلکہ کسی نئی دنیا کی بسنے والی ہے۔ ظاہر ہے کہ اس بُعد اور اس تفاوت کے ہوتے ہوئے، جب انسانیت کے مذاق و مزاج ہی میں یکسانی اور ہمہ گیری نہیں تھی اور اس باہمی بُعد کے ہوتے ہوئے مزاجوں کی یکسانی رسم و رواج کی وحدت خو بُو کا اتحاد اور ذہنی رخ کی ایکتا ممکن بھی نہ تھی تو قانون شریعت و تربیت میں ہمہ گیری اور وحدت کیسے رکھی جاتی کہ سب کا ایک پلیٹ فارم ہو جاتا اور سب کا ایک ہی قانون اور ایک ہی شرعی راستہ ہوتا۔ جس میں قومیت نہ ہوتی بلکہ بین الاقوامیت ہوتی، وطنیت نہ ہوتی بلکہ بین الاوطانیت ہوتی۔ اس لئے شریعتیں بھی الگ الگ رکھی گئیں اور قومیتیں بھی الگ

الگ آئیں، شرائع کے مزاج بھی متفاوت رہے اور مرپیان دین کے مزاج بھی اقوام کے مزاج کے حسب حال جدا جدا رکھے گئے۔ یہ شریعتیں بلاشبہ بایں معنی تو سب کامل تھیں کہ اپنی اپنی قوموں کی نجات کے لئے کافی وافی تھیں، مگر خود بنفسہٖ تکمیل طلب تھیں، جامع محض نہ تھیں۔

اور جب شرائع کے جامع نہ ہونے کے معنی یہ ہیں کہ وہ قومیتوں اور وطنیتوں کے دائرہ میں محدود اور اقوام کے جزوی مزاجوں کی رعایت سے جزوی رنگ میں آئی تھیں تو شریعت کے جامع ہونے کے معنی اسی سے واضح ہو گئے کہ وہ قومی کے بجائے بین الاقوامی اور وطنی ہونے کے بجائے بین الاوطانی ہو اور اس میں قوموں کے جزوی مزاجوں کی رعایت کے بجائے نفسِ انسانیت اور اس کے کلی مزاج کی رعایت ہو اور اسلئے وہ کسی ایک قوم کے لئے نہیں بلکہ دنیا کی تمام اقوام کے لئے پیغام ہو اور انہیں ایک پلیٹ فارم پر جمع کر سکے اور یہ جب ہی ممکن ہو سکتا تھا کہ وہ ساری دنیا کے مزاجوں کی کلی رعایت لے کر آئے اور ایسے ہمہ گیر اصول و قوانین پر مشتمل ہو جو دنیا کی ساری قوموں کے لئے یکساں قابلِ قبول ہوں۔

مگر جبکہ یہ واضح ہو چکا ہے کہ دین تمدن ہی کی وسعتوں کی حد تک وسیع ہوتا رہا ہے تو ظاہر ہے کہ ایسا جامع دین اسی وقت بھیجا جا سکتا تھا کہ دنیا کی قوموں کے تمدن اور مدنی مزاج میں ہمہ گیری اور یکسانی کے جذبات پیدا ہو جائیں اور ان میں قومیتوں کی تفریق کے بجائے، عالمگیر بین الاقوامیت کا مذاق پیدا ہو جائے۔ یہاں تک کہ قومی وطنی نسلی اور طبقاتی حد بندیوں سے یہ تفریقیں انسانوں کی عقلوں پر شاق گزرنے لگیں آقائی اور غلامی کا فرق طبائع پر بھاری ہونے لگے شاہی و گدائی کا تفاوت عقلوں کے نزدیک ناگوار حادثہ شمار ہونے لگے نسل اور حسب کا لوگ لعنت پکارنے لگیں، چھوت چھات کو ہنر کے بجائے عیب سمجھا جانے لگا۔ ذہنیتوں کی حد بندیاں مٹ کر ہمہ گیر مساوات کی استعداد پیدا ہو جائے اور اونچ نیچ کے بجائے انسانی بھائی چارہ اور اخوت کی صلاحیتیں ابھرنے لگیں تو یہی وہ وقت ہو سکتا تھا کہ انسانیت کی یہ فطرت ہمہ گیر قانون اور بین الاقوامی شریعت کی خاموش پکار کرے اور قدرت اسے ایسا ہی جامع قانون بخش دے۔

اس اصول کے بعد اب واقعات کی روشنی میں نظر دوڑائیے کہ یہ استعداد کب ابھری؟

۱ اور کیوں ابھری، ظاہر ہے کہ ہمہ گیر مساوات کی استعداد جب ہی ابھر سکتی تھی کہ ہمہ گیر تفریق اور اونچ نیچ انتہائی حدود پر آچکی ہو اور اس سے دنیا تنگ آ کر ردّ عمل کی خواہش مند ہو چکی ہو سو تاریخ شاہد ہے کہ قبل از اسلام زمانۂ جاہلیت دنیا کے لئے اس اونچ نیچ کا انتہائی دور تھا۔ معاشرتی اونچ نیچ نے غلاموں کو نسبی اونچ نیچ نے اچھوتوں کو اقتصادی اونچ نیچ نے نادار مزدوروں کو مذہبی اونچ نیچ نے عوام کو اور سیاسی اونچ نیچ نے رعایا کو بے پناہ مظالم اور تحقیر و تذلیل کا شکار بنا کر رکھا تھا۔ اونچے لوگ مطلق العنانی کے مقام پر تھے اور نیچ لوگ ڈھوروں اور ڈنگروں کی طرح ان کا یرغمال تھے غلاموں کو معمولی سی کوتاہی اور فروگذاشت پر سانپوں سے ڈسوا دینا اور تالابوں میں ڈھکیل کر ان کے ڈوبنے اور درد انگیز موت کا تماشا دیکھنا برچھوں کے شکنجوں میں ان کے پرخچے اڑا دینا۔ آقاؤں کا قانونی اور عرفی حق تھا۔ بادشاہ آقائے مطلق ہوتا تھا۔ رعایا اس کی غلام سمجھی جاتی تھی۔ اسے حق تھا کہ کسی گھرانے کے ایک فرد کی کوتاہی پر پورے گھرانے اور خاندان کو کولہو میں پڑوا دے۔ حکمراں سلسلہ کے افراد کا رعایا کے افراد سے ناقابل تحمل بیگاریں لینا اور ان کی خون پسینہ کی کمائی سے داد عیش دینا حکمرانوں کا جائز حق تھا۔ مذہبی پیشواؤں کا عوام پر خدا کے نائب کی حیثیت سے ان کے اور ان کے زن و فرزند کے جان و مال میں ہر قسم کے تصرف کا حقدار ہونا عام بات تھی۔

روم و فارس کے اونچے تمدن میں امیر اس وقت تک باعزت سوسائٹی میں آنے کے قابل نہیں سمجھا جاتا تھا جب تک کہ لاکھ دو لاکھ کی مالیت کے زور جواہر کے پٹکے۔ زرتار لباس اور مرصع سونے کے تاج کے زیب بدن نہ ہوں۔ یہ سب سامان جاہ و طرب غرباء کی محنت و مزدوری کا ثمرہ ہوتے ہیں اور خود غرباء بدن چھپانے کے لئے معمولی لباس اور پیٹ بھرنے کے لئے سوکھے ٹکڑے تک سے بھی محروم تھے گویا غرباء حیوانات کی مانند تھے اور غلام بیلوں اور گدھوں کی طرح تھے جن پر طاقت سے زیادہ بار ڈالنا اور بہر صورت ان پر ہر تعدی کو جائز اور ہر ظلم کو روا رکھنا ہی آقائی کی صحیح پوزیشن تھی۔ پھر اوپر سے ان پسماندوں کی ہر چیز اونچوں کے لئے حلال تھی۔

غرض ہر طبقہ میں طبقاتی اونچ نیچ اپنی انتہائی شرمناک حدود پر آچکی تھی جس کے تحت ہر اونچ کا جائز حق نیچ کی تذلیل اور ان میں ہر قسم کے تصرف کا جواز تھا اور نیچ کا واجبی مقام اونچوں کے جابرانہ اختیارات کے سامنے سر نیاز جھکائے رکھنا اور ہمہ تن اطاعت بن کر حاضر رہنا تھا۔

عدل و مساوات تو بعد کی چیز ہے نفسِ انسانیت کا احترام بھی ختم ہو چکا تھا۔ نہ صرف افعال ہی کی حد تک بلکہ انسانی جوہر کے لحاظ سے اونچوں نے اپنے کو نیچوں سے بالاتر سمجھ رکھا تھا۔ کچھ طبقات سورج بنسی اور چندر بنسی بنے ہوئے تھے۔ کچھ خدا کے منہ سے پیدا شدہ تھے اور ان کے مقابلہ میں نیچ مشتِ خاک سے یا خدا کے پیروں سے پیدا شدہ تھے۔ گویا اونچ انسانی نوع سے بالاتر کوئی جداگانہ نوع تھی جس کا مادۂ تولید بھی عام انسانوں جیسا نہ تھا اور نیچ عام انسانوں سے نیچے کی سطح کی کوئی نوع نہ تھی، جنہیں انسانیت کے حقوق بھی حاصل نہ تھے اور اونچ ہمیشہ کے لئے اونچ اور نیچ ہمیشہ کے لئے نیچ پس اونچ نیچ محض معاشرتی نہیں تھی جوہری اور بنیادی تھی اور جوہر انسانی میں بھی طبقاتی تفاوت شامل تھا۔ اسلئے نیچ کا سایہ بھی ناپاک سمجھا جاتا تھا۔ اس کا پس خوردہ بھی نجس تھا۔ اسلئے انسانی برادری کے معاشرتی تعلقات بھی اس کے ساتھ قائم نہیں ہو سکتے تھے۔ پھر نہ صرف معاشرت بلکہ عبادت میں بھی یہ تفریق ایک جائز حق شمار ہوتی تھی، اچھوت اور چھوت ایک معبد میں جمع نہیں ہو سکتے تھے۔ برابر کھڑا ہو جانا تو کیا ہی ممکن تھا؟ علم مذہب صرف اونچی ذات کا حق تھا۔ نیچ کے لئے تعلیم مذہب حاصل کرنا بھی ممنوع تھا۔ غرض مختلف اقوام میں اونچ نیچ اور طبقاتی تفریق کی مختلف بھیانک صورتیں رائج تھیں، جنہیں حسن معاشرت اور صحیح دین خیال کیا جاتا تھا۔ اسکا قدرتی نتیجہ نفرت باہمی اور جذبۂ انتقام کی آگ کا اشتعال ہی ہو سکتا تھا۔ سو ہوا۔ رعایا ملوک پر لعنت بھیجتی تھی اور راعی رعایا کو ملعون جانتے تھے۔ دنیا و دین کی یہ کیفیت کسی ایک ملک یا ایک ہی قوم کی نہ تھی، بلکہ عرب و عجم اسی بلا میں پھنسا ہوا تھا۔ اسی لئے اس دور کی اس تباہ حال دنیا کے قلوب پر اس کے خالق نے نظر کی تو پوری دنیا کو غضب آلود نگاہ سے دیکھا۔ جیسا کہ لسان نبوت نے زمانۂ جاہلیت کی اس حقیقت کو وانشگاف فرمایا ہے۔

ارشادِ نبوی ہے:۔

اِن اللہ نظر الی قلوب بنی اٰدم فمقت عربھم و عجمھم؛	اللہ نے بنی آدم کے دلوں پر نگاہ ڈالی تو عرب و عجم کو غضب آلود نگاہ سے دیکھا۔

یعنی قلوب میں خیر باقی نہیں رہی تھی، روحانیت کے نشانات کم ہو چکے تھے۔ صرف

مادیت اور نفسانیت ہی کا دُور دورہ تھا۔

اس قومی غرور وطنی تعصب اور معاشرتی تحقیر و تذلیل سے دنیا تنگ آچکی تھی تو اُس کا قدرتی ردِعمل یہی جذبات ہو سکتے تھے اور ہوئے کہ شریف و رذیل کی یہ مصنوعی تقسیم ختم ہو نسلی غرور اور قومیتوں کے تعصبات مٹیں اور یہ تفریقیں ختم ہوں اور ظاہر ہے کہ ان وطنی اور قومی حد بندیوں کے مٹ جانے کی آرزو درحقیقت انسانی اخوت و مساوات ہی کی آرزو تھی اور آقاء و غلام شاہ و گدا، امیر و غریب حاکم و محکوم کی اونچ نیچ کی فضا ختم ہو جائیکی خواہش درحقیقت وحدت باہمی اور ربط مابینی ہی کی خواہش تھی، چنانچہ پسماندہ طبقوں میں اس کے چرچے ہونے لگے اور ان اچھوت اقوام کا فکر بدلنے لگا۔ اب وہ اس تحقیر و تذلیل کی فضا پر قناعت کر بیٹھنے کے لئے تیار نہ رہے، بلکہ ردِعمل کے طور پر ان میں جذبہ یہ پیدا ہوگیا کہ وہ اس تحقیر اور اچھوت پن کا جوا اپنے کندھوں سے اتار پھینکیں۔ اس کا قدرتی نتیجہ یہ نکلا کہ ان تفرقوں اور حد بندیوں پر اجتماعیت کے جو محدود تصورات ذہنوں میں جمے ہوئے تھے ان تفریقوں کے ختم ہونے پر وہ بھی ختم ہو گئے اور مدنیت کے وہ عمومی اور ہمہ گیر تصورات ان کی جگہ آ گئے۔ جو اب تک اجتماعیت، نسلیت، قومیت اور امیر و غریب یا آقا و غلام کی طبقاتی تفریق اور چھوت چھات سے ہٹ کر پارہ پارہ ہوگئی تھی، جب وہ ذہنوں میں ایک بوسیدہ لباس کی طرح قابلِ نفرت اور اتار پھینکنے کے لائق بن گئی تو اسکا طبعی ردِعمل ہو سکتا تھا کہ ان تفریقوں کے علی الرغم ہمہ گیر خلط و اختلاط اور باہمی مساوات کی خواہش ابھرنے لگے اور انسانیت گیر اخوت و ارتباط کے جذبات پیدا ہو جائیں، جو انسانی فطرت کا صحیح اور اعلیٰ مقام ہے۔

بلاشبہ اس جذبہ سے وہ مدنیت کبریٰ جو انسان کی طبعی ہے اور جس کی وجہ سے انسان کو مدنی الطبع کہا جاتا ہے، اپنی اصلی صورت میں نمایاں ہونے کے مقام پر آگئی کیونکہ اسکا ابتدائی مقام تو یہ ہے کہ انسان صرف منزلی زندگی میں اجتماعیت کا ثبوت دے اور ایک گھر کے لوگ انس و موانست اور نظم و تنظیم سے زندگی بسر کریں، ظاہر ہے کہ تدبیر منزل کا نظم ایسا ابتدائی نظم ہے کہ اس سے ایک انسان صرف جانوروں سے تو ممتاز ہو سکتا ہے کہ ان کی طرح الگ الگ بھٹوں اور گھونسلوں میں انفرادیت کے ساتھ نہ رہے، لیکن انسانی معاشرت کے اعتبار سے یہ کوئی قابلِ

ذکر مقام نہیں، جسے انسانیت کی تنظیم کہا جائے۔ ابتدائی عہد میں انسان اسی طرح زندگی بسر کرتا تھا کہ ہر ہر گھرانہ خود اپنی ہی انفرادی سیاست کے نیچے آیا ہوا تھا جس میں کوئی عمومیت نہ تھی۔ اس کے بعد اس مدنیت میں وسعت آئی تو انسان نے قبائلی زندگی سیکھی جس میں چند گھرانوں کا مجموعہ مل کر اپنا نظم قائم کرنے لگا اور اب وہ منزلی اجتماعیت اسے کھل نظر آنے لگی جسکی اس کے نزدیک کوئی خاص قدر و قیمت نہ رہی، مگر یہ بھی مدنیت کی انتہا نہ تھی، اس لئے انسان کی طبعی مدنیت پسندی اس پر نہ رکی، بلکہ وہ اس سے گذر کر شہری زندگی تک آیا جس میں چند قبائل باہمی ربط و اتحاد سے زندگی بسر کرنے کے عادی ہوگئے۔ جس سے وہ پہلی قبائلی اجتماعیت بھی انہیں طفولیت محسوس ہونے لگی، مگر یہ بھی مدنیت کی انتہا ثابت نہ ہوئی کیونکہ اس تنظیم کا معیار شہریت تھی، انسانیت نہ تھی، انسانیت کے لحاظ سے یہ شہروں کی تفریق فطرت کی اصلی پیاس کا پورا علاج نہ تھا۔ اس لئے انسان نے اس سے آگے ترقی کرکے مدنیت کو ملکی اجتماعیت بنایا اور کئی کئی شہروں پر مشتمل ملکی نظام قائم کیا اور اب اس اجتماعیت کی صورت قبائلی چودراہٹ یا شہری نوابی اور جاگیرداری کی سی نہیں رہی، بلکہ حکومت کی سی ہوگئی جس میں مختلف شہروں کا ایک نظام بن گیا اور انسان کے روابط وسیع تر ہوگئے اور دنیا میں مختلف حکومتیں مختلف معیاروں سے قائم ہوگئیں، کہیں نسلی ارتباط سے ایک ملک کے لوگوں کا شیرازہ بندھا اور کہیں قومی اور وطنی لحاظ سے اجتماعیت پیدا ہوئی۔ اس نظم کے بعد سے وہ پہلی شہری اجتماعیت بھی ابجد محسوس ہونے لگی، کیونکہ ارتباط باہمی کا ایک وسیع دائرہ اس کے ہاتھ لگ گیا جس سے اسکے مدنی الطبع ہونے کا ظہور زیادہ قوت سے ہونے لگا، مگر یہ مدنیت بھی آخری اور انتہائی ثابت نہ ہوئی اور انسان کی فطری اجتماعیت پسندی نے ملکوں میں اقلیمی شان پیدا کرلی کہ کئی کئی ملکوں پر مشتمل ایک اقلیمی نظام نظام قائم ہوگیا جس کے زیر اثر سینکڑوں ملک آگئے اور انسان کی انسانیت شعاری کا دائرہ اس وسیع اجتماعیت کے راستہ سے کہیں زیادہ وسیع ہوگیا۔ جس سے اندازہ ہوا کہ اس کا مدنی الطبع ہونا طبعی طور پر منزلی زندگی، قبائلی زندگی، شہری زندگی اور ملکی زندگی تک محدود نہ تھا۔ یہ حد بندیاں اس کے ناواقف ماحول کی ناواقفی یا حوصلہ کی بندشوں کا نتیجہ تھیں، جوں ہی حوصلہ کو پھیلنے کا موقعہ ہاتھ لگ گیا، فوراً ہی اس کی وسیع فطرت کو اپنی وسعت یاد آگئی اور وہ مدنیت عامہ کے اس وسیع میدان

میں کود پڑا جس کے سامنے پہلی محدود اجتماعیتیں ماند ہو کر رہ گئیں لیکن یہاں تک پہنچکر اس کی فطرت نے اسے اور آگے بڑھایا اور بتلایا کہ یہ بھی ایک حد بندی ہے کہ وہ کسی اقلیم کے دائرہ میں محدود ہو کر رہ جائے کیونکہ یہ دائرہ پھر جغرافیائی ہے۔ اگر انسان اس حدِ خاص کا پابند ہو کر اس میں گھر جائے تو اسکی انسانیت جس کا احاطہ ہر لحاظ سے زیادہ وسیع ہے۔ پھر بھی زمینوں کے ٹکڑوں کی پابند اور اس پابندی سے پارہ پارہ ہی رہے گی۔ جس میں اس کی انسانیت کی توہین ہے کہ وسیع کو تنگ کے مانند بنا دیا جائے۔ اگر اب تک اس کی انسانیت کے ٹکڑے آقا و غلام، امیر و غریب اور اونچ نیچ کی تفریقوں نے کئے تھے تو اب وہی ٹکڑے اقلیموں کے ارضی ٹکڑوں سے ہو گئے۔ جو بہر حال پھر حد بندی اور انسانوں کی وطنی تفریق ہے۔ اس لئے اب اسکی فطرت نے مدنیت کبریٰ کا ذہنی نقشہ یہ بنایا کہ وہ جغرافیائی یا نسلی معیار کے بجائے انسانیت کے معیار سے اجتماعیت قائم کرے اور انسانیت جبکہ آقا و غلام، نیچ اور اونچ حاکم و محکوم حتیٰ کہ افراد قبیلہ و شہر اور مکان مالک و اقلیم سب میں مشترک ہے اور اسلئے ان سب سے زیادہ وسیع اور ان سب کے لئے ہمہ گیر ہے تو کیوں نہ انسانیت ہی کے اس وسیع ترین اور جامع ترین معیار سے اجتماعیت قائم کی جائے جس کے احاطہ میں شہر و ملک ہی نہیں ساری اقلیمیں بھی آجائیں اور پوری دنیا کے انسانوں کا ایک ہی نظام ایک ہی تمدن ایک ہی اندازِ معاشرت اور ایک ہی نوع کے آئین و قوانین ہو جائیں جس سے دنیا میں انسانیت کبریٰ کا ظہور ہو، اور انسانیت سارے معیاروں پر غالب ہو کر اپنی برتری کو نمایاں کر سکے۔ اب اندازہ کیجئے اگر اجتماعیت کے ہر پچھلے محدود دائرہ سے نکلکر اوپر کے وسیع دائرۂ اجتماعیت میں آنا اور انسانی اخوت و مساوات کو وسیع سے وسیع تر اور عالمگیر بناتے رہنا ہی اس کے مدنی الطبع ہونے کی ترقی تھی تو اس مدنیت پر پہنچکر جس میں ساری دنیا کے انسان ایک بھائی چارہ کے مقام پر آجائیں یقیناً اس کی مدنیت و اجتماعیت کی آخری منزل ہو گی جس کے بعد مدنیت کا کوئی اصولی درجہ باقی نہیں رہتا کیونکہ سارے انسانوں سے ملکر اور انہیں باہم ملا کر اب آخر انسان کے لئے کون سا طبقہ رہ جاتا ہے جسے وہ اپنی مدنیت میں شامل کرے؟ اور اس سے بھائی چارہ کے تعلقات اور تمدنی روابط قائم کرے۔ حیوانات تو اس کے بھائی چارہ میں آنے سے رہے کہ وہ ان کی

طرف اخوت کا ہاتھ بڑھائے۔ جنات آنے سے رہے کہ انہیں اپنی برادری میں شامل کرے ملائکہ آنے سے رہے کہ وہ اسکی برادری میں شامل ہوکر اس کے نظام تمدن کا جزو بنیں۔ رہے انسان تو وہ سب کے سب ایک نظام اجتماعیت میں شامل ہو گئے۔ اس لئے اب کوئی طبقہ باقی نہ رہا جس کے ملانے کے لئے مدنیت کی توسیع کی جائے اور اخوت ومساوات کا ہاتھ بڑھایا جائے۔ اس لئے کہا جائے گا کہ اس حد پر پہنچکر کہ پوری دنیا کے انسانوں کا ایک نظام ہو جائے انسانی اجتماعیت اور مدنیت ختم ہو جاتی ہے۔ اب اگر اس کی اجتماعیت میں کوئی ترقی ممکن ہو گی تو اسی مدنیت کو خوشنما یا مستحکم بنانے کی جزئیات کی ہوگی۔ نفس مدنیت کی ترقی کا اس کے بعد کوئی درجہ باقی نہیں رہتا۔ لیلئے اسے ہی تمدن کی نوعی انتہا کہا جائے گا جس کے بعد ذہن انسانی کی ترقی کا کوئی اصولی میدان باقی نہیں رہتا۔ بس اسی آخری دائرہ کی اجتماعیت کو عالمی اجتماعیت کہا جائیگا جس کی اخوت بھی عالمی، آئین بھی عالمی، قانون معاشرت بھی عالمی ہوگا اور تمدن و مساوات بھی عالمی کہلائے گا۔

کیا زمانہ جاہلیت سے رفتہ رفتہ یہی عالمی ذہنیت انسان میں پیدا نہیں ہو رہی تھی، کیا اسی عالمیت کے ٹکڑے ٹکڑے نسلیت، قبائلیت، وطنیت، قومیت، آقائیت، انانیت وغیرہا نے نہیں کر رکھے تھے اور جب زمانہ جاہلیت میں ان معیاروں سے نفرت اور ان کی اونچ نیچ سے وحشت انسانوں میں پیدا ہوئی جو عالمیت کے راستہ میں حارج تھے تو ان کے ذہن سے نکل جانے کے بعد کیا نہیں کہا جائیگا کہ انسانی ذہن عالمی ذہن پڑ گیا اور اس میں ہمہ گیری اور عالمگیری کی انتہائی استعداد پیدا ہو گئی؟ بلاشبہ اس کا اقرار کیا جائے گا اور ظاہر ہے کہ عالمی مدنیت کی اس استعداد کے بعد قدرتاً اس کی فطرت میں ایک ایسے عالمگیر قسم کے مذہب کی تلاش اور جستجو کا پیدا ہو جانا امر طبعی تھا جو قومی نہ ہو، بین الاقوامی ہو، وطنی نہ ہو، بین الاوطانی ہو، نسلی نہ ہو بین النسلیاتی ہو، لسانی نہ ہو، بین الالسنتی ہو، لونی نہ ہو، بین الالوانی ہو، کسی ایک طبقہ کو پیغام نہ ہو بلکہ سارے انسانی طبقات کو پیغام ہو، اس کا پیغمبر مقامی نہ ہو عالمی ہو، اس کی کتاب آنی نہ ہو، جہانی ہو، اس کا قبلہ ملکی نہ ہو، بین المملکتی ہو، اس کی حفاظت زمانی نہ ہو بین الازمانی ہو، اس کی اشاعت جہتی نہ ہو بین الجہاتی ہو، اس کی تعلیم زمانی نہ ہو بین الازمانی ہو، غرض اس کی ہر چیز ہمہ گیر عالمگیر اور عالمینی ہو۔ کیونکہ دین

قوم کے حسب حال ہو کر ہی اس کیلئے مفید اور اس کی صحیح تربیت کا کفیل ہو سکتا ہے۔ سو جب تمدن میں عالمیت کی استعداد کا وقت آجائے تو دین بھی اس استعداد کے حسب حال ہونا چاہیئے اور جبکہ مدنیت اپنی وسعت کے لحاظ سے انتہائی نقطہ پر آکر ختم ہو جائے۔ گویا انسان کے مدنی الطبع ہونے کی آخری منزل آجائے کہ اس کے بعد تمدن کی اصولی وسعت کا کوئی میدان باقی نہ رہے تو دین کی بھی آخری تکمیل ہو جائے کہ اسکے بعد نئے دین آنے کا کوئی سوال باقی نہ رہے پس جیسے اس تمدن کے بے انتہا وسیع گوشوں سے جس جس رنگ کی گمراہی پیدا ہونے کا احتمال ہوتا جائے۔ اس آخری دین کے بے انتہا وسیع گوشوں سے اسی اسی رنگ کی دافع ضلالت ہدایتوں کا ابھرتے رہنا بھی حقیقت بنتا جائے جو ان گمراہیوں کے دفاع کا مکمل سامان ہو۔ نہ اس طرح کہ دین کامل تمدن کے گوشے مٹاتا رہے۔ بلکہ اس طرح کہ اس عالمگیر دین میں لوگوں کو عالمگیر تمدن سے ہٹائے بغیر خود تمدن ہی کے گوشوں کو ذریعہ ہدایت بنا دینے کی قوت بھری ہوئی ہو۔

وہ تمدن کے ہر کونہ سے خدا کا جمال جہاں آرا دکھلانے کی قوتیں لیکر آیا ہو۔ جس کے معنی یہ ہیں کہ اس آخری اور کامل دین میں دنیا و آخرت دونوں ملا کر یکس کر دی گئی ہوں اور جیسے اسکا جز و دیانات ہوں۔ ویسے ہی اس کا جز و معاملات و معاشرت اور ملکیات بھی ہوں۔ اس کی لا محدود ہدایتیں مسجد ہی تک محدود نہ ہوں بلکہ گھریلو زندگی سے لے کر عالمی حکومت کی زندگی تک وسیع ہوں۔

پس اگر آج عالمی تمدن کا وقت آگیا ہے اور ضرور آگیا ہے کیونکہ جدید اکتشافات اور نئی ایجادات نے پوری دنیا کو ایک عائلہ اور ایک قبیلہ کر کے رکھدیا ہے۔ آج اقلیمیں ملک بنی ہوئی ہیں اور ملک محلے بن کر رہ گئے ہیں۔ آج ۱۰ منٹ میں راکٹوں کے ذریعہ پوری دنیا کا چکر لگایا جا سکتا ہے۔ آج انسان زمین کی سطح کو چھوڑ کر سمندروں کی تہ اور فضاؤں کی بلندیوں میں جا بسا ہے۔ آج گھر بیٹھے مشرق و مغرب کی آوازیں اور بولیاں انسان کے کانوں پر پڑ رہی ہیں۔ آج وہ سطح زمین سے ابھر کر فضاؤں میں اڑ رہا ہے۔ آج مہینوں کی مسافتیں گھنٹوں میں اور گھنٹوں کی منٹوں میں طے ہو رہی ہیں۔ آج ہفتوں کا کام مشینوں کے راستہ سے لمحوں میں انجام پا رہا ہے۔ حتیٰ کہ اس کے کان آج حال ہی نہیں، ماضی بعید کی آوازوں سے آشنا ہوتے جا رہے ہیں، اخلاق و علوم تک کو تول لینے کی

مشینیں سطح دنیا پر نمایاں ہو چکی ہیں جو جسمانیات سے گزر کر عالم معنی تک بھی پہونچ چکی ہیں۔ غرض جبکہ آج کے نئے اختراعات اور اکتشافات نے زمان و مکان اور جواہر و اعراض تک کو لپیٹ کر رکھدیا ہے اور انسان اپنی معاشرت مدنیت کے لحاظ سے مقامی نہیں بلکہ عالمی اور عالمی نہیں بلکہ عالمینی ہو گیا ہے تو اس کی قدرتی خواہش ہونی چاہیئے کہ اسکا مذہب بھی مقامی یا قومی نہ رہے بلکہ عالمی اور صرف عالمی بلکہ عالمینی ہو۔ پس اگر آج پوری دنیا کا مذہب عملاً ایک نہیں بنا ہے تو کم از کم انسانی جذبات اس نقطہ پر ضرور آگئے ہیں کہ وہ ایک ہی ہونا چاہیئے تو آج ہی کا وقت ہے کہ اس میں عالمی مذہب آسمان سے اترا ہوا موجود ہے۔ جو اس جذبہ کی تسکین کے لئے آگے بڑھے اور جہانوں کی اصلاح کا پیغام دے۔ ظاہر ہے کہ آج کا مذہب وہ نہیں ہو سکتا۔ جو کسی ایک قوم کو پکارے یا ایک وطن کو اپنا کر رہ جائے یا نسلی امتیازات کی راہوں سے انسانیت کے حصے بخرے کرنے پر تلا ہوا ہو یا چھوت چھات کی تعلیم سے انسانیت میں نفرت کی تخم ریزی کرے یا رنگ اور لون کی تفریق سے انسانیت کے ٹکڑے کرنے پر آمادہ ہو۔ آج کا مذہب یقیناً وہ نہیں ہو سکتا۔ جو مقامی حد بندیوں اور تنگینوں کی تنگنائے میں انسانوں کو پھانسا کرے انہیں غلطی سے مقامی بنانے کی راہ دکھلائے۔ بلکہ آج کا مذہب وہی ہو سکتا ہے۔ جو اپنے داعی اور پیغمبر اعظم کو عالمینی بتلائے اور اعلان کرے کہ :۔

وما ارسلنٰك الا رحمة للعٰلمين ؕ — اور ہم نے آپ کو تمام جہانوں کے لئے رحمت ہی بنا کر بھیجا ہے۔

جو اپنے داعی اول کو عالمینی نذیر بتلائے۔

ليكون للعٰلمين نذيرا ۔ — تاکہ (ہمارا رسول) تمام جہان والوں کیلئے ڈرانیوالا ہو جائے۔

جو اپنی کتاب کو عالمینی کتاب کہے۔

ان هو الا ذكرىٰ للعٰلمين ؕ — یہ قرآن کریم تمام جہانوالوں کے واسطے ایک نصیحت ہے۔

جو اپنے قبلہ کو عالمینی قبلہ کہے۔

ان اول بيت وضع للناس للذى ببكة مبٰركا و هدًى للعٰلمين ؕ — یقیناً وہ مکان جو سب سے پہلے لوگوں کے واسطے مقرر کیا گیا وہ مکان ہے جو کہ مکہ میں ہے۔

جس کا رسول کسی ایک قوم یا صرف ایک زمانہ کے انسانوں کو نہیں بلکہ پورے عالمِ انسانیت کو جو قیامت تک پھیلا ہوا ہے، اصلاحی آواز دے۔

قل یا ایہا الناس انی رسول اللہ الیکم جمیعا ؕ	اے محمدؐ آپ کہدیجئے کہ اے لوگو میں تم سب کیلئے اللہ کا بھیجا ہوا رسول ہوں۔

جس کی بشیری و نذیری اس کے خدا نے کسی دور کے ساتھ مخصوص نہ کی ہو۔

وما ارسلنٰک الا کافۃ للناس بشیرا و نذیرا۔	اور ہم نے آپ کو تمام ہی انسانوں کے لئے خوشخبری سنانے والا اور ڈرانے والا بنا کر بھیجا ہے۔

جس کا پیغمبر انسانوں میں کالے اور گورے کی تفریق کئے بغیر سب کے سروں پر رحمت و شفقت کا ہاتھ رکھے اور اعلان کرے کہ

بعثت الی الاسود والاحمر	مجھے سُرخ و سیاہ (تمام اقوام عالم کی ہدایت کیلئے) بھیجا گیا ہے۔

جو آقا و غلام کی تفریقیں مٹانے کے لئے آیا ہو۔

یدخل فی امتی حرٌّ و عبدٌ	میری امت میں آزاد اور غلام (سب) داخل ہیں

جو انسانوں کو ان کے جوہر کے لحاظ سے اونچ نیچ کا تصور مٹا کر مساوات کا اعلان فرمائے۔

کلکم بنو آدم و آدم من تراب	تم سب آدم کی اولاد ہو اور آدم مٹی سے پیدا کئے گئے تھے

جو نسلی امتیازات کو ختم کرنے آیا ہو اور فرمائے کہ

یا ایہا الناس انا خلقنٰکم من ذکر و انثیٰ و جعلنٰکم شعوبًا و قبائل لتعارفوا ؕ	اے لوگو ہم نے تم کو ایک مرد اور ایک عورت سے پیدا کیا اور تم کو مختلف قومیں اور مختلف خاندان بنایا تاکہ ایک دوسرے کو شناخت کر سکو۔

جو وطنیت کی حدبندیوں کو مٹانے اور پوری دنیا کو ایک وطن بنانے کے لئے آیا ہوں۔

ان اللہ زوی لی الارض مشارقہا ومغاربہا وسیبلغ ملک امتی ما زوی لی منہا ؕ	اللہ نے زمین کی مشرق و مغرب میرے سامنے کر دی (جسے میں نے دیکھا) اور عنقریب میری امت کا ملک وہاں تک پہنچے گا جہاں تک میری نگاہ ہوں

نے دیکھا۔ (یعنی مشرق و مغرب تک)

جو وطنی غرور کو ختم کرنے کیلئے آیا ہو۔

لیس لعربی علی عجمی فضل الا بدین وتقوی ۔ کسی عربی کو کسی عجمی پر دین وتقویٰ کے بغیر کوئی فضیلت حاصل نہیں۔

جو قومیتوں کی حد بندیاں ختم کرنے کے لئے آیا ہوں۔

کان النبی یبعث الی قومہ خاصۃ وبعثت الی الناس کافۃ ۔ دوسرے انبیاء (صرف) اپنی قوم ہی کی طرف بھیجے جاتے تھے اور میں تمام انسانوں کیطرف بھیجا گیا ہوں۔

جس نے چھوت چھات مٹانے کا اعلان کیا اور کفار کے ہاتھ کا کھانا پینا جائز رکھا۔

الیوم احل لکم الطیبات وطعام الذین اوتوا الکتاب حل لکم وطعامکم حل لھم ۔ آج تمہارے لئے حلال چیزیں حلال رکھی گئیں اور اہل کتاب کا ذبیحہ تم کو حلال ہے اور تمہارا ذبیحہ ان کو حلال ہے۔

اور خلاصہ یہ کہ جو ایمانی اخوت کے ساتھ انسانی اخوت کا بھی علمبردار بن کر آیا ہو تاکہ انسان میں انسان سے نفرت کا تخم باقی نہ رہے۔

اللھم اشھد ان الناس کلھم اخوۃ ۔ اے اللہ تو گواہ رہ کہ تمام انسان بھائی بھائی ہیں۔

جو سارے انسانوں کی خدمت کا نصب العین لیکر آیا ہو۔

الخلق عیال اللہ فاحب الخلق الی اللہ من یحسن الی عیالہ ۔ تمام مخلوق اللہ کا کنبہ ہے پس اللہ کے نزدیک سب سے زیادہ پسندیدہ وہ ہے جو اسکے کنبہ کے ساتھ احسان کا معاملہ کرے۔

جو اس انسانی بھائی چارہ کے لئے باہمی ہمدردی کی تعلیم لیکر آیا ہو کہ

احب لاخیک ماتحب لنفسک ۔ اپنے بھائی کے لئے وہی چیز پسند کرو جو تم اپنے لئے پسند کرتے ہو۔

جو غلاموں کو بھائی بتاتا ہوا آیا ہو۔

اخوانکم خولکم۔ تمہارے غلام تمہارے بھائی ہیں۔

جس نے اخلاقی سفروں کو بین الاقوامی بنایا۔

قل سیروا فی الارض فانظروا کیف کان عاقبۃ المکذبین — آپ کہہ دیجئے کہ زمین کے اندر چلو، پھر واپس دیکھو کہ تکذیب کرنے والوں کا کیسا عبرتناک انجام ہوا ہے۔

جس نے تجارتی سفروں کو بین الاقوامی بنایا۔

ھو الذی جعل لکم الارض ذلولا فامشوا فی مناکبھا وکلوا من رزقہ والیہ النشور — وہ ایسا ہے جس نے تمہارے لئے زمین کو مسخر کر دیا سو تم اس کے رستوں میں چلو اور خدا کی روزی میں سے کھاؤ اور اسی کے پاس دوبارہ زندہ ہو کر جانا ہے

جس نے تعلیمی سفروں کو عام کیا۔

فلولا نفر من کل فرقۃ منھم طائفۃ لیتفقھوا فی الدین ولینذروا قومھم اذا رجعوا الیھم لعلھم یحذرون — سو ایسا کیوں نہ کیا جائے کہ ان کی ہر ہر بڑی جماعت میں سے ایک چھوٹی جماعت جایا کرے تاکہ وہ لوگ دین کی سمجھ بوجھ حاصل کریں اور اپنی قوم کو ان کے پاس واپس آ کر ڈرائیں تاکہ وہ لوگ احتیاط رکھیں۔

غرض اس کی ہر تعلیم میں عمومیت جامعیت اور بین اقوامیت کی روح دوڑ رہی ہو جس نے ہر قوم کے ساتھ انتہائی رواداری کی تعلیم دی ہو اور منافرت کا بیج مٹا دیا ہو، سو بتلایا جائے کہ وہ مذہب آج اسلام کے سوا کون ہے اور جو تعلیمات اوپر ذکر کی گئیں، یہ اس کی نہیں ہیں تو اور کس کی ہیں؟ اور اس کے سوا کون ہے جو انسانی معاشرہ کو مقامی کے بجائے عالمی اور نہ صرف عالمی بلکہ عالمینی دیکھنا چاہتا ہے۔ اس لئے آج کی عالمی دنیا کا مذہب اسلام ہی ہو سکتا ہے۔ جو تمدن کے کسی بھی گوشہ کو مٹائے بغیر اسی گوشہ سے مالک کی طرف رہنمائی کر رہا ہے۔ ہاں یہ ضرور ہے کہ جہاں اس نے عالمیت اور عالمی اجتماعیت پیدا کرنے کے لئے یہ ہمہ گیر تعلیم اور ہمہ گیر انس وانسانیت کی طرف راہنمائی کی ہے، جس کے تحت اقوام عالم سے موانست اور مسالمت کی راہیں کھلتی ہیں اور منافرت ختم ہو جاتی ہے، وہیں اس نے معاشرہ میں مسلم قوم کا شخصی وجود قائم

رکھنے کیلئے مسلمانوں کو غیر مسلموں کے خلط ملط، ریل میل، ربط ضبط اور ذاتی الفت و مودت سے روکا بھی ہے تاکہ ان کے اسلامی استقلال میں فرق نہ آئے لیکن اجتماعی معاملات اور عمومی معاشرت میں اس ریل میل سے بچکر رواداری حسن سلوک مواسات دفع مظالم امن پسندی اور دفع منافرت کے جذبات کو عام بنانا چاہا ہے تاکہ اس کے بین الاقوامی معاملات میں فرق نہ آئے جو بالآخر اسلامی اشاعت اور عمومی دعوت و تبلیغ کا وسیلہ ثابت ہوتے ہیں۔

دوسرے یہ کہ جب ایسی ہمہ گیر تعلیم و تربیت دوسرے مذاہب لیکر ہی نہیں آئے بلکہ اسلام ہی یہ انسانیت گیر تعلیم و تلقین لے کر آیا ہے تو اسکا غیر مسلموں سے مودت و اختلاطِ بے جا کو روکنا درحقیقت نفرت باہمی سے روکنا ہے نہ کہ نفرت پیدا کرنا ہے۔ کیونکہ وہی تو نفرت کا سرچشمہ ہے۔ جن کے اختلاط سے روکا جا رہا ہے تو یہ روکنا تعصب سے نہیں بلکہ عالمگیر مقاصد کے تحفظ کے لئے ہے۔

خلاصہ یہ کہ دنیا کی ذہنیت جب بین الاقوامی رنگ کی استعداد پر آگئی، جیسا کہ اس امت کی ابتداء میں اونچ نیچ سے تنگ آ کر مساوات اور اخوت باہمی کی ذہنیت پیدا ہوئی اور آج وہی ذہنیت استعداد سے گزر کر فعلیت کی صورت میں نمایاں ہے جبکہ اسی ذہنیت نے نئی نئی عالمگیر ایجادات کر کے اس عالمی ذہنیت کو فعلاً عالمی بنا دیا ہے تو بین الاقوامی شریعت بھی خدا نے اسی ذہنیت کے دَور میں اتاری جو اسلام کے سوا دوسری نہیں ہے۔ پس اسلام کو اسی دَور میں آنا چاہیئے تھا۔ جس دَور میں انسان کا مزاج بین الاقوامی بننے کا پرواز پڑا۔

غور کیا جائے تو آج بین الاقوامیت اور ہمہ گیری اپنی نوعیت کے لحاظ سے اصولاً انتہاء کو پہنچ چکی ہے۔ جس کے بعد اس میں اصولی نوعیت کا کوئی درجہ باقی نہیں اور جس میں اصولاً اور نوعاً کسی کمی بیشی کی گنجائش نہیں کہ ذہن انسانی کو آگے بڑھنے کی گنجائش ہو۔ ہاں کمی بیشی ہوگی تو وہ جزئیات و فروعات میں ہوگی نہ کہ بین الاقوامیت کے دائرہ میں، کیونکہ جب ساری دنیا کے انسان ایک قوم بن جانے کے مقام پر آچکے ہیں تو آگے انسان ہی نہیں رہتا کہ رشتہ اخوت آگے بڑھے۔ جیسا کہ ابھی واضح ہو چکا ہے تو عوامیت کے نقطہ نظر سے مدنیت کا آخری نقطہ آپہنچا جس کے بعد بین الاقوامیت کا کوئی مقام باقی نہیں رہا کہ انسان اس سے آگے کسی اور عمومیت کی تلاش کرے اور مدنیت کا دائرہ وسیع

ہو۔ اسلئے اسی ذہنیت کے مناسب حال دین بھی ایسا عمومی اور عالمی بھیجدیا گیا کہ اس کے بعد دین و شریعت کا بھی کوئی اصولی مقام باقی نہیں رہا کہ دین اس کے آگے بڑھے یا کسی نئے دین کی ضرورت پڑے۔

اس لئے اب اگر دینی ترقی ہوگی تو اسی دائرہ عمومیت میں رہ کر ہوگی، اس سے نکل کر نہیں ہوگی، سو ایسی ترقی جزیاتی کہلاتی ہے۔ جو کسی اصول کے دائرہ میں محدود رہ کر ہو مثلاً اگر انسان زمین سے آگے بھی بڑھے گا تو زمین یا مکان ہی کے نام پر آگے بڑھے گا نہ کہ انسانیت کے بھائی چارہ کے نام پر، کیونکہ دنیا کی پوری انسانیت کے نظامِ اخوت میں آجانے کے بعد آگے کوئی نسلی بھائی ہی نہیں رہتا کہ اس سے رشتۂ اخوت قائم کیا جائے۔ اس لئے مدنیت اصولاً اپنی آخری حد پر آچکی ہے۔ اور اجتماعیت بھی اپنے آخری نقطہ پر آپہنچی، جس کے بعد کوئی نقطہ نہیں۔ اسلئے دین بھی آخری آجانا چاہیئے کہ اس کے بعد اصولاً دین کا کوئی نقطہ باقی نہ رہے۔ البتہ جیسے اس خاتم المدنیت تمدن میں اسی کے اصول کے تحت بے شمار فروع نکلتے رہنے کی گنجائش ہے اور رہے گی جو ایجادات سے نمایاں نکلتی رہیں گی۔ ایسے ہی خاتم الادیان دین سے بھی اس کے جامع اصول کے تحت فروعات نکلتے رہنے کی گنجائش ہے اور رہے گی، جو اجتہادات سے برآمد ہوتی رہیں گی۔ نفسِ دین اور اس کے قواعد و اصول نہ بدلیں گے اور نہ جدید قواعد و اصول آنے کی کوئی گنجائش ہی باقی رہی ہے۔

پھر جیسے اول النبین آدم علیہ السلام کے ابتدائی کنبہ کو ابتدائی قسم کے مذہب اور تعلیم کی ضرورت تھی، ایسے ہی خاتم النبین کے دورہ میں آدم کے انتہائی اور بوڑھے کنبہ کو انتہائی قسم کے مذہب اور تعلیم کی ضرورت تھی، جس سے شاخیں تو بے شمار نکل سکتی ہیں، مگر جڑ اور تنہ ایک ہی رہے گا۔ پس جیسے دنیا کی مدنیت کے قومی حد بلوغ پر آگئے اور اب اس میں اصولاً نشو و نما کی گنجائش نہیں رہی، اگر گنجائش ہے تو نئی نئی شاخوں اور نئی نئی جزوی ایجادوں کی ہے، جن کے اصول ہمہ گیر رنگ کے ہاتھ لگ چکے ہیں، جن کی روشنی میں ماہرینِ سائنس نئی نئی اشیا نکالتے رہیں گے۔ ایسے ہی دین بھی جو آدمؑ سے چلا تھا، نشو و نما پاکر حد بلوغ کو پہنچ چکا ہے اور اب اس میں نشو و نما کی گنجائش نہیں رہی اگر ہے تو فروعی مسالک پیدا ہوتے رہنے کی ہے کہ اس کے اصول کی روشنی میں مجتہدین امت اور مقتیانِ بابصیرت اس کے قواعد و ضوابط سے زمانہ کے حسب حال فروعات نکالتے رہیں گے۔

اور امت کی تربیت ہوتی رہے گی جو آئمہ ہدایت اور علماء و مشائخ کے ذریعہ ہو سکتی ہے۔ کسی جدید نبوت کی حاجت باقی نہیں رہی۔ غرض آج جو معاملہ بھی ہے۔ وہ سارے انسانوں کا ہو گیا ہے اور سارے انسانوں کا باہمی تعاون و تناصر کا ذہن ہی آخری ذہن ہے کہ اس کے بعد ذہن انسانی کے آگے بڑھنے کا کوئی راستہ ہی نہیں۔ اگر کسی نئے خطہ کی دریافت ہی ہو گی تو وہ بھی ان ہی سارے انسانوں کے لئے ہو گی۔ غرض تمدنی دنیا میں بشریت کے عموم کی اصولی حد آ گئی۔ جس کے بعد بشریت بھی نہیں رہتی تو بشر عالم بشریت سے آگے کی سوچ بھی نہیں سکتا۔ اس لئے ذہنی پرواز کا اصول ختم ہو جاتا ہے۔ آگے صرف اسے عملی جامہ پہنانے کے طریقے رہ جاتے ہیں تو وہ فروع ہیں۔ جو اس ہمہ گیر انسانیت کے لئے انسان میں سے ابھرتے رہیں گے۔ جن اس ہمہ گیر انسانیت پر گھٹنے بڑھنے کا کوئی اثر نہیں پڑیگا۔ خلاصہ یہ کہ جب ذہن انسانی کی پرواز اصولاً ختم ہو گئی تو نئے اصولوں کی مانگ بھی ختم ہو گئی۔ اس لئے نئے دین کے آنے کا کوئی مقتضی بھی باقی نہ رہا کہ نیا دین آئے یا نئی نبوت آئے۔ اس لئے اس دور خاتم الادوار میں دین خاتم الادیان بھی آنا چاہیئے تھا۔ جو آ گیا اور پچھلے مقامی اور محدود ادیان اسی طرح منسوخ ہو گئے جس طرح خاتم المدنیت تمدن آ جانے کے بعد پچھلی محدود مدنیتیں منسوخ ہو کر ختم ہو گئیں اور جیسے یہ پچھلی مدنیتیں اپنے اپنے وقت میں غلط نہ تھیں۔ بلکہ اس وقت کی انسانی ذہنیتوں کا مقتضا تھیں وہ اگر منسوخ ہوئیں تو ذہن انسانی کی تبدیلی سے جو ارتقار پذیر تھا۔ ایسے ہی پہلے ادیان بھی اپنے اپنے وقت میں غلط نہ تھے۔ بلکہ اس وقت کے انسانی ذہنوں اور مزاجوں کے مقتضا اور ذہنی پکار کے مطابق تھے۔ وہ اگر منسوخ ہوئے تو انسانی ذہن کی تبدیلی سے جو ارتقار کی منزلیں طے کر رہا تھا۔ اب جبکہ اس کی اصولی دوڑ بھی ختم ہو گئی کہ انسانی اجتماعیت کا انتہائی کنارہ آ گیا تو وہ اصولاً مختتم ہو گیا۔ ایسے ہی جبکہ دین کے اصولی اکمال کا وقت آ گیا تو وہ بھی اصولاً ختم ہو گیا۔ ہمہ گیر فروع کی گنجائش تمدن میں بھی ہے اور تدین میں بھی سو وہ چلتی رہے گی۔ اب جیسے پچھلے تمدنوں کو دوبارہ لوٹانے کی کوشش کرنا ذہن انسانی کے لئے چیلنج ہے۔ ایسے ہی اسلام آ جانے کے بعد پچھلے مذاہب کو لوٹانے کی سعی کرنا ذہن انسانی کو ترقی معکوس کی طرف لیجانا ہے۔ جس کے لئے فطرت کبھی تیار نہیں ہو سکتی۔ پس جیسے یوں کہا جائے کہ اب زندگی کا انحصار موجودہ تمدن میں ہے۔ ایسے

چھوڑ کر آج دنیا میں پناہ نہیں مل سکتی۔ نہ بچاؤ ہو سکتا ہے۔ جیسے گن اور بم سے الگ ہو کر تیر کمان اور تیشہ وتبر پر آ جائے تو اپنا بچاؤ نہیں کر سکتا یا عالمیت پیدا ہو جانے کے بعد کوئی شخص پھر وہی قدیم گھریلو یا قبائل یا شہری قسم کے محدود تمدن پر چلنے کی کوشش کرنے لگے تو وہ تمدنی آفات سے نجات نہیں پا سکے گا جب تک اسی تمدن کی پناہ نہ پکڑے جو وقت کے تقاضوں سے برسرِ ظہور آیا ہوا ہے۔

ایسے ہی یوں بھی کہا جائیگا کہ دین کامل آجانے کے بعد اخروی زندگی اور نجات کا انحصار اسی دین میں ہے۔ اسے چھوڑ کر پچھلے ناتمام ادیان میں (جو اس وقت کے انسانوں کے لئے کافی تھے۔ مگر تام و کامل نہ تھے) نجات ڈھونڈھنا آخرت میں بچاؤ نہیں کر سکتا۔

ومن یبتغ غیرالاسلام دینا فلن یقبل منہ وھو فی الاخرۃ من الخاسرین ۔

اور جو شخص اسلام کے سوا کسی دوسرے دین کو طلب کریگا تو وہ اس سے مقبول نہ ہوگا اور وہ تباہ کاروں میں سے ہوگا۔

غور کرو تو خاتم النبیین کے دین کی یہ خصوصیت بھی آفتاب کی تمثیل میں موجود ہے کیونکہ یہ کہنا کہ اسلام آجانے کے بعد اسے چھوڑ کر کسی دوسرے دین سے روشنی ڈھونڈھنا گھاٹے اور خسارے کی بات ہے ایسا ہی ہے۔ جیسا کہ یوں کہا جائے کہ آفتاب طلوع ہو جانیکے بعد اُسے چھوڑ کر کسی ستارہ سے کوئی روشنی ڈھونڈھنے لگے تو وہ کام نہیں چلا سکتا۔ گھاٹے میں پڑ جائے گا۔ جیسے یہ غیر معقول ہے۔ ایسے ہی وہ بھی غیر معقول ہے۔ پس ستارے اپنے اپنے وقت میں اپنی دھیمی اور مناسب وقت روشنی سے انسانوں کو فائدہ پہنچاتے رہے جو اپنی اپنی جگہ صحیح تھے مگر رات کو دفع کرنے کے لئے جب سورج طلوع ہو گیا۔ اور ستارے روپوش ہو گئے تو ان کا چھپنا ان کے غلط ہونیکی وجہ سے نہیں۔ بلکہ ان کی حالت کارکردگی ختم ہو جانے کی وجہ سے ہوا ہے۔ نیز اسلئے کہ ان کی کارکردگی کا وقت رات کی تاریکی تھی۔

طلوعِ آفتاب کے بعد دن میں صرف آفتاب ہی مفید خلائق اور کارگذار ثابت ہو سکتا ہے۔ دن میں ستاروں کا کام نہیں رہتا کہ رہنمائی کا کام کر سکیں۔ بہرحال اس تمثیل سے حضرت خاتم النبیین

صلی اللہ علیہ وسلم کے دین کا ناسخ الادیان ہونا اور اپنے دورہ میں اسی میں نجات کا منحصر ہونا اور اسکا اسی مشینی تمدن اور عالمی مدنیت کے دورہ میں آنا اس تمثیل سے ثابت ہو جاتا ہے۔

خلاصہ یہ کہ آفتاب نبوت بشری ازل سے چمکا اور کائناتی ابد تک چمکتا رہے گا اس دوران میں نہ اس کے نور کا کسی وقت انقطاع ہوا اور نہ ہوگا کہیں بلا واسطہ اور کہیں بالواسطہ روشنی اسی کی کام کرتی رہی اور کرتی رہے گی۔

اول ما خلق اللہ نوری — سب سے پہلے میرے ہی نور کو اللہ نے پیدا کیا

کنت نبیا وادم بین الماء والطین۔ — میں اس وقت نبی تھا جبکہ آدم مٹی اور پانی کے درمیان میں تھے اور ان کے ڈھانچہ کا خمیر ہی کیا جا رہا تھا۔

انا اول من تنشق منه الغبراء۔ — سب سے پہلے میں ہی قبر سے اٹھوں گا۔

انا اول من یفتح باب الجنة — سب سے پہلے میں ہی جنت کا دروازہ کھولونگا

فانا اللبنة وانا خاتم النبیین۔ — پس میں ہی قصر نبوت کی آخری اینٹ ہوں اور میں ہی خاتم النبیین ہوں۔

غرض بشری ازل سے بشری ابد تک اولیت کے ساتھ اور خاتمیت کے ساتھ یہی نور چمکتا رہا اور چمکتا رہے گا نہ اسکے لئے انتہا ہے نہ اختتام اور اسی کے فیضان سے کائنات چمکتی رہی اور مختلف رُوپوں میں چمکتی رہے گی۔

ہے یہ وہ نام خاک کو پاک کرے نکھار کر
ہے یہ وہ نام خار کو پھول کرے سنوار کر
ہے یہ وہ نام ارض کو سما کرے ابھار کر
اکبرؔ اسی کا ورد تو صدق سے بار بار کر
صَلِّ عَلٰی مُحَمَّدٍ صَلِّ عَلٰی مُحَمَّدٍ ؛

آفتاب کی تشبیہ کی روشنی میں ختم نبوت کے یہ چند اساسی پہلو تھے، جنہیں طالب علمانہ رنگ سے پیش کر دیا گیا۔ یادداشت میں بعض اور پہلو بھی اجمالاً درج کر لئے گئے تھے لیکن ہجوم کار مہلت نہیں دیتا کہ انہیں بھی تفصیل سے یا اجمال ہی سے کسی ترتیب سے پیش کر سکا

وقت نکالا جائے اور فرصت کے انتظار اور امید و بیم کی تاخیر کا نتیجہ یہ ہوتا کہ یہ مرتب شدہ ذخیرہ بھی رہ جاتا اور اس کے ضائع ہونے کا اندیشہ رہتا۔ اسلئے ان کی تسوید تبییض کا انتظار کئے بغیر جو پہلو مرتب ہو گئے، وہی پیش خدمت کر دیئے گئے۔ حق تعالیٰ قبول فرمائے۔

والحمد للہ الذی بنعمتہ تتم الصٰلحٰت

والحمد للہ اولاً و اٰخراً ؛

محمد طیب غفرلہٗ مہتمم دارالعلوم دیوبند ۲۱ ذی قعدہ ۱۳۷۸ھ ؛